

ہر گھر کی زینت

کراچی

ماہنامہ

دوشنبہ

3

ایوارڈ یافتہ افسانہ نگار

Pakistanipoint
Waqar
Fizem

ایوارڈ یافتہ نوجوان شاعری کے افسانے
پسندیدہ ترین مستقل سلسلے
تین عورتیں تین کہانیاں
اور سبھی چیز ناول
”گمبند“



سیما خٹک
سلیان شمسی
عشرت آہا

ایڈیٹرز

سیما خٹک

جیت ایڈیٹر

سرکولیشن مینجر، المصطفیٰ

کمپوزنگ، شوکن کمپوزنگ آل آن چنڈر ریزو، کراچی
لیگل ایڈوکیٹرز: دستگیر احمد علی ہاشمی (ایڈووکیٹ)
ایگزیکٹو مینجر: محمد دم ایڈمنسٹریشن (ایڈمنسٹریشن)

جلد ۲۰ - شماره ۹ - ستمبر ۱۹۹۲ - قیمت ۲۵ روپے



ایک پستہ رسالہ - ڈائریکٹر - قاری
دہلوی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ
نہکشان لائبریری اینڈ جنرل اسٹور
جملہ چوک سکس

خودکلیت کاپی
پوسٹ بک نمبر ۸۰۹۵ کراچی ۷۵۳
راہد آئی

پرل پبلی کیشنز
۱۰۸-۱۱۰ آدم آرکیڈ، شہید رٹ روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ - کراچی

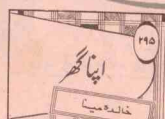
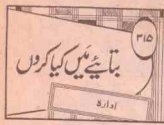
فون ۳۹۳۳۲۶۹ - ۳۹۳۳۲۷۱
ٹیکس ۳۹۳۹۶۱۱



پرل پبلی کیشنز، بہادر شاہ ظفر روڈ، شہید رٹ روڈ، بہادر شاہ ظفر روڈ، کراچی

ایک پست شدہ رسالے - ڈائجسٹوں - تاریخی
رومانوی اور خاصہ سے ناواوں کا مرکز
مہکشان لائبریری اینڈ جنرل اسٹو
کھانا چوک سکس

Kahkashan Library
& Book Binders
JINNAH CHOWK, SUKKUR.



شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

ایک پسمند شدہ رسالے - ڈاکٹر جسٹون - قاری پھر
رومانوی اور جاسوسی ناولوں کا مرکز
کھکشاں لائبریری اینڈ جنرل اسٹور
جسٹس چوک سکھ

اسپین کی باتیں

ایوارڈ یافتہ افسانوں کا تیسرا حصہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ بھی آپ کی پسند پر پورا اترے گا اور آپ اسے بھی اپنی ذاتی لائبریری کی زینت بنانے میں مسرت محسوس کریں گے۔ یہ بات ہم اتنے وثوق سے اس لیے کہہ رہے ہیں کہ محترم قارئین نے جس پر غلوص اور دالمانہ انداز میں پہلے دو حصوں کی پذیرائی کی، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ”دو شیزہ“ نے روز اول سے جاسوسی اور جرم و سزا سے متعلق تحریروں کی بجائے ان افسانوں اور کہانیوں کی اشاعت کو ترجیح دیں جو ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔ زندگی کا سچا منظر نامہ پیش کرنے والی یہ تخلیقات مقابلے کے مرحلے سے گزرنے کے بعد ایوارڈ کی مستحق قرار پائیں اور یہ ایوارڈ یافتہ افسانہ نمبر انھی منتخب کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ اس دور میں جب اچھے افسانے بہت کم لکھے جا رہے ہیں، قارئین کو بہترین افسانوں کا انتخاب اور وہ بھی اتنی کم قیمت میں فراہم کرنا جہاں ہمارے لیے باعث مسرت ہے، وہاں بازوق قارئین کے ذوق مطالعہ کی تسکین کا باعث بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قارئین نے ان کا پرجوش استقبال کیا اور مقبولیت کی سند بخشی جس کا ثبوت وہ لاتعداد خطوط ہیں جو قارئین کرام نے ہمیں ارسال کیے۔

ہم ان نمبروں کی پرتپاک پذیرائی کے لیے جہاں اپنے محترم قارئین کے شکر گزار ہیں، وہاں اپنے ان قلمی معاونین کا بھی ایک بار پھر شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی تحریروں ”دو شیزہ“ کی زینت بنیں اور اب ان نمبروں میں شامل ہیں۔ قارئین کرام کو یہ جان کر بھی خوشی ہوگی کہ ان نمبروں نے ہمارے ان قلمی معاونین کو بھی انساںز کیا ہے جنہوں نے قلم آور کاغذ سے رشتہ منقطع کر لیا تھا۔ انہوں نے ”دو شیزہ“ کے لیے یہ رشتہ پھر سے استوار کر لیا ہے اور بہت جلد آپ ان کی نگارشات سے بھی لطف انداز ہوں گے۔ اب آپ اس نمبر کا مطالعہ کیجئے اور ہمیں اپنے تاثرات سے آگاہ کرنا نہ بھولیے۔

سید مرتضیٰ

دوشیزہ کی محفل

ایک ہفت روزہ رسالے - ڈائجسٹوں - تاریخی
رومانوی اور جاسوسی ناولوں کا مرکز
کہکشاں لائبریری اینڈ جنرل اسٹو
جسٹ ہوک سسٹم

سیما غزل

قارئین!

آداب و نیاز!

امید کہ بہ خیر! ہوا یوں کہ آج ہم ذرا جلدی آگئے۔ سوچا کہ محفل لکھتا ہے ایسے وقت پر پہنچ جائیں جب کوئی نہ ہو اور یکسوئی سے اپنا کام کریں ابھی خطوں کی فائل ہی نکالی تھی کہ مصطفیٰ چاند آگئے۔ ویسے وہ ہم سے پہلے ہی آجاتے ہیں شاید مرزا صاحب کے پاس تھے، ان سے ہمیں کوئی خطرہ نہ تھا، جن لوگوں سے خطرہ تھا وہ ابھی نہیں آئے تھے اور یہی غنیمت تھا۔ مصطفیٰ چاند کچھ گنگنا رہے تھے، اصل میں جب سے وہ جی کمائیاں کے ایڈیٹرز میں شامل ہوئے ہیں

تبھی سے بہت چلتے رہتے ہیں۔ ہم ان سے اس لیے کچھ نہیں کہتے کہ بچوں کی معصوم معصوم سی تو خوشیاں ہوتی ہیں، سو اس وقت بھی ان سے کچھ نہیں کہا اور جلدی جلدی خط نکالنے لگے پھر تو کراہی مہک اٹھا۔ مصطفیٰ چاند نے چونک کر سر اٹھایا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔

ابھی ہم خط پڑھ ہی رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور سلیم فاروقی اندر داخل ہوئے ساتھ ان کے ایک ”انڈیشی“ کے دوست بھی تھے۔ ان دونوں پر نگاہ پڑتے ہی ہم اچھل پڑے۔ دونوں کے گال یوں پھولے ہوئے تھے جیسے سپرے کے بین بجاتے میں پھول جاتے ہیں۔ ہمیں شبہ

ہوا کہ بین ابھی ابھی منہ سے ہٹائی ہے ہم سانپوں سے
 بہت ڈرتے ہیں چاہے وہ کسی بھی قسم کے ہوں۔ ہم نے
 جھٹ پاؤں اوپر کر لیے خوف تھا کہ سانپ ضرور نکل
 آئیں گے خواہ کسی کی آستین ہی سے نکلیں، سلیم نے
 اشارے سے پوچھا کہ تمہیں کیا ہوا، اس سے پہلے کہ ہم
 کوئی جواب دیتے وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ واپس
 آئے تو تارل حالت میں تھے ہماری جان میں جان آئی۔
 ”سلیم!“ ہم نے خود کو سنبالتے ہوئے انھیں مخاطب
 کیا۔ ”کیا یہ صاحب تمہارے آگے بین بجا رہے تھے؟“
 ”پاگل ہوئی ہو کیا!“ وہ ہمارا مطلب سمجھ کر جھلا گئے۔
 ”تو پھر تم ان کے آگے!“

”پان کھا رہے تھے۔“ انھوں نے بدستور اسی انداز سے
 کہا۔

ہمیں بڑی حیرت ہوئی۔ ہم نے ہزاروں لوگوں کو پان
 کھاتے دیکھا تھا مگر کسی کی یہ حالت نہیں دیکھی تھی اور پھر
 برسوں سے سلیم فاروقی کو پان کھاتے دیکھ رہے تھے مگر یہ
 انداز پہلی بار دیکھا تھا۔ ہمارے حیران ہونے کی وجہ صرف
 مصطفیٰ چاند کی سمجھ میں آئی۔ انھوں نے ہمارے علم میں
 اضافہ کیا کہ پان کھانے کا یہ انداز دراصل تازہ تازہ
 انڈیا سے براستہ بنگال وارو ہوا ہے، اور یہ کھاتے پیتے
 لوگوں کا ”شائکل“ ہے۔

بہر حال سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ ہم نے چائے کے
 لیے علی سے کہا۔ ہم اپنے کمرے ہوئے ذہن کو سینٹنا
 چاہتے تھے کہ ہمیں اطلاع ملی کہ کوئی خاتون ملنے آئی ہیں۔
 پتا چلا کہ زہرہ ممتاز ہیں۔ یقین کیجئے کہ ان کی آمد نے ساری
 کمزورت دور کر دی۔ بہت خوش ہوئی اور یہ جان کر تو خوشی
 مزید بڑھ گئی کہ وہ اپنا افسانہ بھی لائی تھیں۔ قارئین! اب تو
 بہت سے پرانے ساتھی آٹے ہیں اور پھڑے ہوئے لوگوں
 سے ملن کتنا خوش کن ہوتا ہے یہ تو آپ بھی جانتے ہوں
 گے۔ زہرہ ممتاز سے مل کر ہم دوبارہ اپنے کمرے میں
 آ بیٹھے۔ سلیم فاروقی اپنی جگہ پر فٹ ہو چکے تھے۔ ان کے
 چہرے پر عزام جھلک رہے تھے اس لیے ہم نے اطمینان کا
 سانس لیا کہ آج ضرور سلیم فاروقی سنجیدگی سے کام کریں
 گے اور ہم سکون سے محفل لکھ سکیں گے سو ہم نے خطوں
 کو ترتیب دیا اور اب آپ سے محو گفتگو ہیں۔ قارئین!

آپ کی یہ توجہ، محبت اور خلوص بڑی امنگ پیدا کرتے ہیں،
 جی چاہتا ہے کہ محفل سچائیں تو بس سچائے ہی رہیں۔
 قارئین سب سے پہلے ہم کچھ نئے قارئین کے خطوط
 پڑھیں گے۔ یہ زبیدہ انصاری ہیں، میرپور خاص سے۔
 ”گلتی ہیں۔“ ”تعلیم جاری تھی اس لیے ہمیں اتنی فرصت نہ
 تھی کہ کچھ اور پڑھ سکتے۔ گھر کے کام بھی ہوتے تھے اور اتنا
 وقت نہیں مل پاتا تھا۔ اب فارغ ہوئے تو ایک جگہ دو شیزہ
 دیکھ کر پڑھنا شروع کر دیا۔ بہت اچھا لگا۔ اتنا اچھا کہ خرید
 لیا۔ (جس کو پڑھنا شروع کیا تھا وہ کسی اور کا تھا) یہ شمارہ
 اگت کا تھا۔ سچ بائی! ایک ایک افسانہ یوں تھا جیسے موتی
 جڑا ہو۔

پہلا انعام یافتہ افسانہ ”قصاص“ ڈاکٹر شہناز جمال کا
 پڑھ کر بڑی دیر تک ساکت رہی۔ اتنا خوب صورت افسانہ
 تھا کہ بس کیا تاؤں۔ اس افسانے نے ذہن پر ایسا تاثر
 چھوڑا کہ میں بڑی دیر تک کچھ اور کرنے کے قابل نہ رہی۔
 تمام دن عجیب سی کیفیت رہی۔ بائی! آج کے دور میں یہ
 کمائی، ہر گھر میں چل رہی ہے، میری طرف سے اس قدر
 حقیقت لکھنے پر ڈاکٹر شہناز کو مبارک باد ضرور دیجیے گا۔
 مبارک باد کی مستحق تو سیم آمنہ اور گل بھی ہیں۔ تینوں
 انعام یافتہ افسانے واقعی انعام کے قابل تھے یہ تین
 افسانے پڑھنے کے بعد آپ کا ناول کند پڑھا۔ بہت پسند آیا
 مگر اس سے قبل کی قسطیں نہ پڑھنے کا بہت افسوس ہوا۔
 خلاصے میں وہ مزہ نہیں ہوتا جو اصل کمائی میں ہوتا ہے۔
 میں نے اپنی سیلیوں سے کہا ہے کہ وہ مجھے گزشتہ شمارے
 بھی دیں، اگر کوئی شمارہ نہ ملا تو آپ کو زحمت دوں گی یہ
 ضرور بتائیے گا کہ گزشتہ شمارے کس طرح حاصل کر سکتی
 ہوں۔ دو شیزہ کی محفل پڑھ کر تو بہت ہی مزہ آیا۔ اب تو ہر ماہ
 لیا کروں گی۔ میرا خط دو شیزہ کی محفل میں ضرور شامل کیجئے گا
 پلیز۔ یہ سلیم فاروقی کون صاحب ہیں ذرا تفصیل سے لکھیے
 گا۔“

بی بی زبیدہ انصاری! جواب حاضر ہے اب تو خوش ہونا؟
 دو شیزہ پسند کرنے کا شکریہ! تمہاری مبارک باد ڈاکٹر شہناز
 جمال، سیم آمنہ اور گل کو ان سطور کے ذریعے پہنچ جائے
 گی۔ کند پسند کرنے کا بھی بہت شکریہ تمہارے دفتر سے
 گزشتہ شمارے حاصل کر سکتی ہو، تمہارا آخری سوال بڑا

مشکل ہے، علیہ ما فوق کی تفصیل میں جانے کی کوشش تو خیر ہم نے کیا کسی نے بھی نہ کی ہوگی، چنانچہ ان کے بارے میں جانتے ہیں وہی ہم کو مشکل ہو جائے۔ ہر حال پٹکاس کا تحارف گرا دیتے ہیں، موصوف ہمارے ادارے کے دوسرے ماہنامے ”جنگی مکانات“ کے ایڈیٹر ہیں۔ ہمارے مندرجہ ذیل حریف ہوں گے علاوہ مکانات انجمنی ہیں، شاہے کی کامیوں میں براہ پٹس ہو جائے گا، چنانچہ چنانچہ کی شخصیت میں ہوں گے۔ تم نے کہا ہے ان کے دھوکے تو ان کی تفصیل سے لکھتی ہیں جو بھی لکے گی۔ ”اور چھ؟“

آیا اور میں بیدار رہتی ہوں۔ اگت کا شمار تو ہستی یا اچھا تھا لیکن آپ سے ایک خدمت ہے غلام ربانی تمہاری کی غزل الٹی چھاپ دی۔ حرت ہوئی کہ یہ کیسے ہو گیا۔
میں بی بی کا یہ کولس کیا تھا۔ اصل میں یہاں جب پریشانی پڑی تو آخری چینگ کے ہوتے یہ غزلیں کیونکہ آخری بیسٹ کی تھیں لیکن چینگ کے ہونے کے بعد اس دیکھے کے بغیر یہاں پریشانیوں میں آپ اور کونفیشن کے لیں نہیں گمان ہیں تمہارے ایسا بھی ملکا ہے بہر حال میں اس سلسلے میں آپ سے نہیں ملکہ اپنے سامنے قادر اور محترم شاعر نے بھی معذرت خواہ ہیں۔
امید ہے کہ معاف کر دیں گے۔ آپ کا مسئلہ تو فی الحال خدمت خدو ہے۔ سمجھا تھا اس کے لئے وقت نہیں ملے گا۔
چھپ۔ کل۔ غالباً اس شمارے میں موجود ہے۔ غالباً کا کافظ اس لئے استعمال کیا ہے کہ آپ کے اس خط میں آپ کا نام صحیح طور پر دعائیں جاہد خلیفہ وقت نامہ اور یہ صاف صاف لکھ کر اس دو شیڈول پندرہ کی ہے ملکر کریں۔
قادر بن۔ ایک خط بھی لکھا ہے۔ شاعر سے ملنے کے لئے

میں رشتہ نہ بھالی کی کسی کے باوجود اپنا نہیں محسوس ہوتا ہے۔ آپ کے جواب دینے کا انداز خوب سورت ہے۔ اللہ کے زور قلم اور زاویہ افسانے بھی بہت اچھے تھے۔ پرانے قلم کاروں کو یوٹیوب پر کبے پناہ خوشی ہوئی۔ لکھا ہے میرے قلم کے کاواں بڑھتا ہی جائے گا۔ کئی بڑا اچھا یا بار ہے۔ شاید یہ سلاٹ ٹول بڑھ رہا ہو جسے غارتگر لکھ رہی ہیں اور اس میں نہ روماس ہے نہ ساس ہو کے چمیلے، کو مار کر مارے۔

بجای نواز حسن شکر اس پینڈی کے کا واقعہ یہ مرزا صاحب ہی کا دم ہے کہ شاہ کے ہاتھ لکھ رہے ہیں ہم بھی اپنی پوری کوشش کرتے ہیں کہ یہ ہدایت پر اور باقاعدگی سے لکھا جائے کہ پینڈی کا گھر۔

یہ کیا ہے راولپنڈی سے یہ قاتلان کا ہے۔ ہمارے ایک انہوں نے دخل خط کے ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں ہے۔ یہ ہر حال ممکن ہیں۔ باجی اگر شاہ آپ کے کیا ایک لکھا ہے تو قاتلان شاہ سے جو جواب آپ پر کرتے پاس ہوئی۔

یہ بہت مشکل ہیں بلکہ پائیز اس شاہ سے یہ ضرور میرے لئے حاصل کریں۔

[illegible]

دینی! امید کہ خوش ہوئی! تمہارے نام کے
 اہل چھپ جانے پر معذرت! تمہاری جمہوری کو
 دے دے ہوئے خدا خلق کر رہا ہے عراب تک تم نے
 سے بچے پر تہہ نہیں سمجھا شاید اہل عمل میں
 انصاف پر چاٹوئی ہو گیا ہو کہ نہیں! ان کو اگلا
 اور جس کے شادوں کی پوری کاشی ہے تمہارے
 اہل ان کے نام سے شامل نہ کیے جائے جو تمہاری حق
 دے ہوئی تمہارے اگلے خط کے منتظر ہیں

ہا ہوں میں نے ابھی میرک کا امتحان پاس کیا ہے مجھے
مغل بہت پسند آئے اور میرے دوستوں کو بھی
مغل بہت پسند آئے اور میرے دوستوں کو بھی
مغل بہت پسند آئے اور میرے دوستوں کو بھی

سایا غلام محمد! خوش آمدید! بڑی خوشی ہوئی کہ تمہیں اور
 ہمارے دوستوں کو دیکھ رہی کہ محفل پسند آئی، تمہارے
 احوال پر گئے ہیں اگلے شمارے میں انشاء اللہ شائع
 ہوں گے کچھ مکتوبوں پر تبصرہ بھی بھیجنا اور ہاں بھیجنا
 بلکہ میں پاس ہو جانے پر مبارکباد قبول کرو اور خوش
 رہنا کہ ہر چیز پر تمہارے دل کو خدے کے تھک رہیں گے
 کہ کا شمارہ ہو رہا ہے، تیرہ بیٹھو۔

یہ خط کراچی سے فرح شاہانی نے لکھا ہے۔ لکھتی ہیں
 "میں نے دو دنوں خط واک کی نذر ہو گئے۔ اب تیری مرض
 پر دوشیزہ کی محفل میں شریک ہو رہی ہوں اور اسی طرح آ
 تم سے افزائی ہوتی رہی تو ہمیشہ حاضری دیتی رہوں گی۔"

مرتبہ کی طرح اس مرتبہ میں دیڑھ سو عیار پر اور اتارا سو فٹ گزرنے کے ساتھ ساتھ دیڑھ سو فٹ کی خوب صورتی میں اضافہ ہوا تا جا رہا ہے اور خاص طور پر آب کی تحریک تو ہے جس میں چار چاند لگا دیئے ہیں۔ یہی جانب سے اس قدر خوب صورت ناول "کنڈ" لکھنے پر مبارکباد قبول کریں اور ساتھ ہی فریڈرک شمسی کو "خدا" افسانہ لکھنے پر مبارکباد پہنچا دیں۔ دیکھ کر دیڑھ سو فٹ کی خوب صورتی میں اضافہ ہوا تو ہے۔ ایک افسانہ لکھ کر کاٹا اور مزل بھیج رہی ہوں۔"

نی بی فرخ شاہانی! تھک تو ہوتا؟ اور ہاں تمہاری ایک کہانی "شاہد" موجودہ شمارے میں شائع ہو گئی ہے۔ افسانہ انشاء اللہ اگلے شمارے میں چھپ جائے گا۔ وہ ڈیڑھ کے لیے دعائیں! اچھی لکھیں۔ تمہاری مبارک باد ہمیں موصول ہو گئی اور فرخندہ شعی کو بھی اسی طور کے ذریعے پہنچی ہو گی۔ تمہارے دو سرے کلمے خط کا انتظار ہے۔ شمارہ ایک پر تصویب آئے تب تک ہمیں ملے۔ راجدلی جلدی خط لکھا کرو۔ جارا ڈیڑھ ہر تحریر سے ہم خط کے منتظر ہیں۔

قارئین! آئیے اب آپ کو پرانے ساتھیوں سے ملوانے کے لیے خط و پیوستہ کے بہت پرانے قاری یوسف شاکر صاحب کا ہے۔ اب تک ان سے رابطہ منقطع تھا۔ یہ نہیں کیوں! (بہر حال ان کا خط پاکر خوش ہوئی۔ لکھتے ہیں۔ مختصر یہ سباز مل صاحب! ایک طویل فیہ حاضری کے بعد محفل میں شرکت کر رہا ہوں۔ آج جب شمارہ ایک کا مطالعہ کرنے لگا تو یہی سہ تہذیبی محسوس کی۔ یہ تہذیبی اچھی بھی گور اور حق۔

ہوئے نظر آئے، میں آپ سے سوال تو نہیں کروں گا کہ
آپ محفل میں کب آئیں مگر مبارک باد ضرور ملے گا کہ
آپ نے محفل کا قلم اور سنیات آپ کا انداز بہترین
ہے اس محفل میں پہلے رستا قافوق اور رخسان مرزا
جو اب وقتی حشم۔ رخسان مرزا کو سلام کیے گا۔ روزنامے
کھانے کی وجہ سے پڑھنا ہمارے پڑا تھا اس سے قاری
کو پہچانی ہو گی اور قاری کا نام اور ہو گئے۔ دوسرے خط
میں تفصیل لکھوں گا مختصر "قصاص" بجا اور تحریر پسند
آئے تین ہی اخام کے قابل تھے میری طرف سے لکھے
والوں کو مبارک باد پہنچا دیں۔ اس وقت صرف ان کی

ہا ہوں کہ میرا خط غفلت میں شائع ہو سکے۔ فاروقی صاحب نے ابھی واسطہ نہیں دیا آپ کو کافی شک ہیں جا نہیں ہمارا کیا تحریریں کے بہر حال انچہ آن سے دو دو ہاتھ کرتے رہیں گے۔

یوسف صاحب! خوش آمدید، دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ جہاں ہمارے ہاتھ پر آنے لگے والے لوٹ آنے وہاں پر آنے کا بھی قریبی نام ہے۔ آپ کی آمد ہمارے لیے بڑا مسرتا رہی، جناب ہم تو آپ کو دھوڑتے بڑھاتے رہے تھے مگر پھر کسی نے کسی کے لوٹ آنے سے بہت پڑے ہیں اور پھر تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ پچھلی بار حیرا عیادت کے آنے سے پہلے ہی کیفیت ہوئی تھی اس بار اب تک ان کا خط نہیں پہنچا شاید یہ پہنچنے والا ہی ہو۔ جناب آپ کے لیے اطلاع ہے کہ رفقاء نادر، زہرہ ممتاز، کلثوم واحد اور جہاں افزہ کے علاوہ شہناز جمال اور نیم آنی بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ شاعرہ قادیان ریاضت ٹبر سے لگے شاعرے ہیں آپ کی ملاقات ان سب سے ہو جائے گی۔ دو تیرہ آپ کو اچھا لگے، تھوڑی پسند آئی بہت فائز، ہمارا جواب بدیعا اچھا لگا، شکر ہے آپ کی مبارک یاد وصول کی، یقیناً فریست صاحب، قارئین کو کڑھتے مرے میں جو ریاضت ہوئی اس سے وہ دل برداشتہ ہو گئے تھے مگر جناب اب ایسا نہیں ہے، ایک جوت تو خود آپ کا خط ہے وادف صاحب آپ کی آمد سے خوش ہو سکے، جمعو فصل نہیں تھا اس لیے مزہ نہیں لیا، اب اس شاعرے کے ساتھ ہی تنہو بھی چھکے گا، کیا آپ نے مسلم فاروقی کے بوا پریشان کر لکھا ہے دینے آپ لوگ ساتھ رہے تو وارے نیارے ہو جائیں گے، جو لوگ ان کی پشت پناہی کرتے ہیں وہ تو تل میں جا میں بے جگہ ہیں، آپ فوراً ان سے دو دو کیا چار چار ہاتھ کریں، ایسا کرنے سے پہلے ”میں کیا نہیں“ ضرور پڑھ گئے گا اور دیکھیں کہ انھوں نے ہمارے لیے کیا لکھا ہے پھر جو دینے میں مزہ آئے گا تو پھر آپ کے خط کا انتظار شروع کریں نا؟

اور خود میں دودینہ شاہین نے لکھا ہے لکھتی ہیں۔ ”نیک خواہشات کے ساتھ حاضر ہوں سب سے پہلے شکر ہے کہ میرا افسانہ شائع کیا۔ دو مسرا شریعہ پر چا بھیجی کا بھی نقل کریں۔ وہ پہلے بھی دو تیروں میں میرا افسانہ

شائع ہو چکا ہے، شاعرہ اگست میں فیض احمد فیض اور جہاں جالب کا کام پڑھ کر خوش ہوئی، امید ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اس شمارے میں بھی کیا نہیں اچھی تھیں مگر آہٹ کی ”بطلان“ اور مایہ رفقاء کی ”پد کردار“ ہے جلد آئیں بہت جلد تھی۔ پھر تھیں۔ یہ تمام سائیں وادف، درودی صاحب کو سلام کہیں گے، آپ کو بے دعا نہیں۔

لیلی دودینہ شاہین، شاعرے کی پسندیدگی کا شکر ہے، اب سلام بھیج کر ”آپ کو“ اور اہل افسانہ بھیج کر رہی ہیں، ”فورا“ پہنچو دو تاکہ اگلے شمارے میں چھپ سکے اور ہمارا لائن کوئی خدمت! یہ ہیں جناب وادف کی مایہ رفقاء لکھتی ہیں۔ ”آپ کو“ اور لیلی کی بیوی فائز شکر ہے تم نے یہ خط لکھا اور سلام بھیج کر ”آپ کو“ اور اہل افسانہ بھیج کر رہی ہیں، ”فورا“ پہنچو دو تاکہ اگلے شمارے میں چھپ سکے اور ہمارا لائن کوئی خدمت! یہ ہیں جناب وادف کی مایہ رفقاء لکھتی ہیں۔

یہ نہیں کیونکہ کیا اپنا رخسار کرانے کی بہت نہیں دینے یہ جو آپ نے نہیں ”میں“ نہیں ”لکھا ہے“ چھاپیں دیکھ کر خیال ہے آپ کو ایک بار دور سے کی ہے جان چھوٹا تک ہمارے نام سے واقع ہو چکی ہوں گی۔ دینے یہ وضاحت ہم نے اس لیے کی کہ میں آپ نے نہیں کہ ”میں“ نام سے پکاروں کیا نام ہے تمہارا۔ ”میری کیا“ انھیں کیا سن رہی تھیں کہ بہت غریب کی خاصی تیری سے غم ہوئی، اگر کمزور کیا تھا ”ہر کہ نہیں کیا“ سیما بانی آپ نے میں ہمارے مسلم بھائی سے مختلف اتنے چار ماہ عرا نام تک رشتہ ہیں دینے علم نہیں کہ دشمنی اتنی بھی چلی ہے۔ قریب ہوتے دو دنوں میں صبح صفائی کرانے سے آس کریم توڑتی جا جاتی تھیں، ابتر میں جس میں ہو رہا ہے تین افسانہ فائز افشا قاتل احترام کو لیں یہ خبر ہے تھے اس لیے کہ یہ کہہ کر

کے ایک اعتراض ہے کہ تینوں میں انگریزی کا استعمال کیا تھا اس چیز نے اسے نہیں پایا۔ میں تمام باتوں کے علاوہ کتابوں بھی مقصد ہے کہ اگر اس معاملے کی سے میں تو اور دو مگر پھر دو زندگی دنا ہوئی۔ میرا آئیں بہت جلد تھی۔ پھر تھیں۔ یہ تمام سائیں وادف، درودی صاحب کو سلام کہیں گے، آپ کو بے دعا نہیں۔

لیلی دودینہ شاہین، شاعرے کی پسندیدگی کا شکر ہے، اب سلام بھیج کر ”آپ کو“ اور اہل افسانہ بھیج کر رہی ہیں، ”فورا“ پہنچو دو تاکہ اگلے شمارے میں چھپ سکے اور ہمارا لائن کوئی خدمت! یہ ہیں جناب وادف کی مایہ رفقاء لکھتی ہیں۔

کوشش کرتے ہیں کہ اس میں کامیاب بھی ہوں مگر محال کو واضح کرنے کے لیے بعض مزید ایسا کر ضروری ہو گا۔ آپ امید ہے کہ ہماری بات دیکھیں یہ ہوں گی، ہماری کتابی لوگوں سے تو بہت پسند کی ہے مجس ہوں ہیں نہیں ان کی بہر حال مایہ امید ہے کہ اب یہ سلسلہ نوے کا نہیں یعنی ابھی بھی خط لکھا کرنا چاہتا لگتا ہے۔ ہماری مزید خبر ہمارے پاس ہے ان میں سے سب سے بغیر میں ”فورا“ افسانہ یا چنی کیا نہیں کہ ”مجھ“ ”میں“ ”فورا“

لیلی دودینہ شاہین، شاعرے کی پسندیدگی کا شکر ہے، اب سلام بھیج کر ”آپ کو“ اور اہل افسانہ بھیج کر رہی ہیں، ”فورا“ پہنچو دو تاکہ اگلے شمارے میں چھپ سکے اور ہمارا لائن کوئی خدمت! یہ ہیں جناب وادف کی مایہ رفقاء لکھتی ہیں۔

کوشش کرتے ہیں کہ اس میں کامیاب بھی ہوں مگر محال کو واضح کرنے کے لیے بعض مزید ایسا کر ضروری ہو گا۔ آپ امید ہے کہ ہماری بات دیکھیں یہ ہوں گی، ہماری کتابی لوگوں سے تو بہت پسند کی ہے مجس ہوں ہیں نہیں ان کی بہر حال مایہ امید ہے کہ اب یہ سلسلہ نوے کا نہیں یعنی ابھی بھی خط لکھا کرنا چاہتا لگتا ہے۔ ہماری مزید خبر ہمارے پاس ہے ان میں سے سب سے بغیر میں ”فورا“ افسانہ یا چنی کیا نہیں کہ ”مجھ“ ”میں“ ”فورا“

لیلی دودینہ شاہین، شاعرے کی پسندیدگی کا شکر ہے، اب سلام بھیج کر ”آپ کو“ اور اہل افسانہ بھیج کر رہی ہیں، ”فورا“ پہنچو دو تاکہ اگلے شمارے میں چھپ سکے اور ہمارا لائن کوئی خدمت! یہ ہیں جناب وادف کی مایہ رفقاء لکھتی ہیں۔

۲۲ دوشیزه کاپی

برس یعنی دو برس پہلے کا کہیں تو مان بھی لیتے) "جی اور تب
 بے اسے بڑے ہو جانے کا انتظار کرتے ہیں یہ کسی مدتیہ
 میں کچھ کہہ سیکھ کے لے لے کھینے کا انتظار کرتے تھے (دیکھا
 ابھی تک آپ بڑی نہیں ہوئیں یا کچھ بچے کا ارادہ ملتی
 کرنا) آگے گفتی تھی "میری ایک اور دوست جس کا نام
 اعجاز اور تک نہ تھا اس کا بھی دو بیٹے ہو چکے تھے وہ اب بھی
 تک لگاؤ تھا۔ یہ نہیں اب ہے یا نہیں لیکن اب سوال
 سدھار چلی گئی ہیں، ہم دونوں دو بیٹے بے پناہ لڑکے
 تھے تعلیم نے کسی اور جانب توجہ نہ ہونے دیا اب ہم ایم
 اے اردو ہو گئے ہیں اور عرصہ دو سال بعد دو بیٹوں کی تلاش
 شروع کی۔ ہمارا صاحب نے خوفناک اطلاع دی کہ وہ تو بڑے
 ہو گیا ہے۔ ہمارے حواس اور ظہور مجھے دل پر کاری
 وار ہو کر اگلے ہی روز ان کی کے ایک ایک حال پر چٹکا
 دیکھا دو بیٹوں نظر کیا تو بس کیا تھیں کیا ہو "فورا" کیا اور
 وہاں رہا وہاں کچھ اور لڑکے والے۔ ہمارے ہاں کوچہ دکھا کر خوب
 بھلاؤ کہ سنائی پڑا تو پھر یقین کیوں کرتے ہو اب دوست
 پرچہ لا کر دیکھتے ہیں کریں کہ میں پرچہ لا کر نہیں
 غریب ورنہ لوگ بڑے بڑے دردی سے استہلال کرتے ہیں۔
 فرمیں دیکھ رہی ہوں ایک آدھ لگا دیتے گا۔"

لیا بی بی نے اس کی یاد دلائی کہ تم نے ہمارے ساتھ "استہ
 برس دو بیٹوں کو تلاش ہی نہیں کیا لیکن دو سال بعد تلاش
 شروع کی۔ خیر اتنا بلاخوش تو لگے اور تبہ وہ صاحب آجہدہ
 ایسا نہیں بنا اور اب اس ہمارا ساتھ میں بھی چھوڑ نہیں
 اکیلے میں دو لگے ہے تسلیم قانونی تو دینے بھی ہر وقت
 ڈراتے رہتے ہیں۔ ابھی ابھی مجھے کچھ یاد ہے کہ چھوٹے
 چھوٹے آکر "ہاؤ" لگتا تھا میں ہاں سے پاس لے چکے تھے
 کر کے جلدی سے ٹھک جاتے ہیں اس لیے کھینے لگتے
 ہیں۔ خیر اب بڑوں جن لوگ ساتھ ہوتے چارے بچے بھی
 ہمت آتی تھارتی ہے تمہاری نظیریں فرمیں لی نہیں انشا
 اللہ جلدی ہی تمہارے ساتھ رہے۔ رابطہ بھال رکھنا "جی خرابی
 برداشت نہیں کیا جائیگی۔" ہمیں! "

یہ ہیں خاتون، "فرزادہ اعجاز" ابھی ہی بیاری سی
 دوست، گفتی ہیں۔ "ڈیر سہا! امید کہ خیریت سے ہوں
 گی۔ دو کھڑے میں ازاد اکرم واپس آئے تو تمہارا خط

معدود بیٹوں کے ل کیلبد خوش ہوئی کہ تم نے ہمارا
 رکھا۔ سب سے پہلے دو بیٹوں پر ڈالا۔ خدا تمہارا
 عمو اور ڈاکے اور دو بیٹوں کو احترام رکھتا ہے۔
 بے مری سے انتظار شروع کرنا ہے یہاں تک شاعر
 خون کے پکا تو کیا تو ابھی بنا چکے نہیں کیا ہے کارٹی
 حالات کی بے حد فکر ہے، فکر ہر طرف کے حالات کی۔
 خدا کی اساتذہ ان کی عقل دے کر فسادات اور اختلافات
 کے کنارے اسے اختیار کریں۔ دو بیٹوں کا اپنا روز پانچ
 پسند کیا پسند آنے کی ایک دوسری کی چھانی بھی جو پہلے
 نسبت بڑی اور آسانی سے بڑی تھی۔ یہاں کا افسانہ
 لگا۔ تم نے ہمیں پرانے لکھے والوں میں شمار کیا اچھا
 خدا کے کہ "معدود" اور "لوگان" اور "معدود" رہتے۔ "معدود
 ہو گیا ہو۔ تمہارے ہاں کی فاکل بہت مونی ضرور ہوئی
 یہ لیا جائیگی۔"

فرزادہ! یہی ہوا کہ کھڑے کیا ہے ہماری طرف سے
 لیا گیا جناب ہے آخر تک اب ان دو کتابیں کے پیچھے کی
 کی بھی لیا جائیگی تو یقیناً چھپ جائیں گی تمہارے
 پر بار مانا، ہمیں اصل میں غصہ اس بات پر کیا کہ تم
 لکھا تھا کہ تم سے آگے کے بعد افسانہ نہیں لکھیں گے
 ہے افسانہ ہے اس کوئی بات ہوئی! جاؤ تم نہیں بولے
 اب تم نے بھی سوچ لیں کہ جب تم افسانہ سمجھتی
 چلو اب میں دانتیں کے سچ تمہارے دو بیٹوں کو
 نہیں لے دیتا میں جانتے ہیں "احسا" ہے ہمیں کہ اتنی
 سے خیر پیچھے والوں کو کتنی پریشانی ہوئی ہے کہ ان
 کہیں یہ مطلب نہیں ہوا کہ اس لکھنا ہی چھوڑ دے
 تمہارے ہیں اگر جلدی خیر نہ بھیجی تو بس دیکھ لیتا ہوں
 "خوش مدتیہ صاحبہ! میں "جی" ابھی دانتیں
 خط میں فرحت مدتیہ صاحبہ نے ٹھیک کتاب سے بھیجا
 گفتی ہیں۔ "سہا! چلا جاؤ گا دو بیٹوں کا مدھ خیر
 اور دقت بہت پسند آیا۔ آپ کی محبت اور ظہور کی
 ہوں آپ سے میرے ذہنوں پر بار کا مزہ رکھا۔ آپ نے
 کہیں میں زندگی اس قدر خاور خوف زدہ ہو گئی ہے کہ
 تصور نہیں کر سکتی کہ بچوں کے ساتھ سے کہیں کیا ہو
 کر دی ہے بچوں کا بے حد احرا ہے کہ میں دوبارہ
 شروع کروں کہ تم کے احوال سے میں غافل ہو سکوں

میں لکھنا، "فردوس" پر مدھنی چھانی ہے بہت
 کر کے ایک کتابی "بہار" لکھی ہے اگر ہو سکے
 میں ضرور عکد دیکھنے، خیر میں دوانی اب بہت
 آئے گی۔ آپ کی یہ توازن میرے لیے بہت ہو گا
 اور ہر میرے بچوں کے لیے زندگی کے اس مہذب
 میں "خاتون" کا کچھ حقین کا سامنا کرنا ہے۔ کبھی مجھے
 وہاں لوگ دھکے دے کر کھینے حاصل کر لیتے ہیں، ہر
 میں اس میں پتھر لے کر لیتے ہیں۔ آپ کی دعاؤں کی
 بہت ہے۔"

فرحت مدتیہ صاحبہ! خدا کرے آپ خوش رہیں۔
 کی زندگی کا شکر ہے، فرحت صاحبہ ہمارا پیار بیش
 کے ساتھ رہے گا۔ آپ بھی خود کو تھامو نہیں
 گا دیکھنا میں زیادہ تر حقیقتیں سن رہی ہوں کہتی ہیں۔
 دھکے کر اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ وہ کھتے
 اب میں نہیں ہے ہم اب سے پہلے بھی بتا چکے
 کا دل عمل موجود ہوتا ہے ہر کام میں۔ پیچھے چھا
 ہے، کسے ممکن ہے کہ عمل غلط ہو گا کام غلط ہو کر
 میں جانتے ہیں "میں مجھ پر ہاں یہ ضرور کہہ سکتی
 خود آگے سے ناواقف ہوتے ہیں۔ خود آگاہی اور
 کا اور اگر ہو جائے تو وہ جان لیں کہ کسی کو
 دینے سے جو اثر ان کی اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے
 اٹھانے والے کے دھکے زیادہ ہوتا ہے اس
 وہ تو بھی جانتے ہیں کہ کسی کو تکلیف دے رہے
 اس میں جرم انھیں اندر سے کھلا کر دیتے ہو کہ وہ
 اور کر کے یہ ثابت کرنے کی ناکام کو کوشش کرتے ہیں
 ہیں۔ "خیر یہی ہے پاس ہوتا ہے۔ اتون
 کی گرفت سے کوئی بھی با آسانی نہیں نکل پاتا۔ ابھی
 دھار دانتے پر آپ سے سزا کا آغاز ہے اگر یوں حوصلہ
 اور تو کھلا کر یہ خط تک پہنچاؤں گا کہ آپ کے خیر
 اس میں آپ کا غم اور اس کے اثرات آپ کے
 ہاتھ نہ دیں، گفتی رہتے اور میں سمجھتی
 کہ آپ کے ساتھ ہیں۔ بچوں کو ہار کھینے لگے
 دھار کریں گے اب تک تو اس کا شمار بھی بڑھ

فرحت تمہارا خط بہت دیر سے ملا اس لیے مفضل

جواب لکھنا، "فردوس" پر مدھنی چھانی ہے بہت
 کر کے ایک کتابی "بہار" لکھی ہے اگر ہو سکے
 میں ضرور عکد دیکھنے، خیر میں دوانی اب بہت
 آئے گی۔ آپ کی یہ توازن میرے لیے بہت ہو گا
 اور ہر میرے بچوں کے لیے زندگی کے اس مہذب
 میں "خاتون" کا کچھ حقین کا سامنا کرنا ہے۔ کبھی مجھے
 وہاں لوگ دھکے دے کر کھینے حاصل کر لیتے ہیں، ہر
 میں اس میں پتھر لے کر لیتے ہیں۔ آپ کی دعاؤں کی
 بہت ہے۔"

فرحت مدتیہ صاحبہ! خدا کرے آپ خوش رہیں۔
 کی زندگی کا شکر ہے، فرحت صاحبہ ہمارا پیار بیش
 کے ساتھ رہے گا۔ آپ بھی خود کو تھامو نہیں
 گا دیکھنا میں زیادہ تر حقیقتیں سن رہی ہوں کہتی ہیں۔
 دھکے کر اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ وہ کھتے
 اب میں نہیں ہے ہم اب سے پہلے بھی بتا چکے
 کا دل عمل موجود ہوتا ہے ہر کام میں۔ پیچھے چھا
 ہے، کسے ممکن ہے کہ عمل غلط ہو گا کام غلط ہو کر
 میں جانتے ہیں "میں مجھ پر ہاں یہ ضرور کہہ سکتی
 خود آگے سے ناواقف ہوتے ہیں۔ خود آگاہی اور
 کا اور اگر ہو جائے تو وہ جان لیں کہ کسی کو
 دینے سے جو اثر ان کی اپنی ذات پر مرتب ہوتا ہے
 اٹھانے والے کے دھکے زیادہ ہوتا ہے اس
 وہ تو بھی جانتے ہیں کہ کسی کو تکلیف دے رہے
 اس میں جرم انھیں اندر سے کھلا کر دیتے ہو کہ وہ
 اور کر کے یہ ثابت کرنے کی ناکام کو کوشش کرتے ہیں
 ہیں۔ "خیر یہی ہے پاس ہوتا ہے۔ اتون
 کی گرفت سے کوئی بھی با آسانی نہیں نکل پاتا۔ ابھی
 دھار دانتے پر آپ سے سزا کا آغاز ہے اگر یوں حوصلہ
 اور تو کھلا کر یہ خط تک پہنچاؤں گا کہ آپ کے خیر
 اس میں آپ کا غم اور اس کے اثرات آپ کے
 ہاتھ نہ دیں، گفتی رہتے اور میں سمجھتی
 کہ آپ کے ساتھ ہیں۔ بچوں کو ہار کھینے لگے
 دھار کریں گے اب تک تو اس کا شمار بھی بڑھ

فرحت تمہارا خط بہت دیر سے ملا اس لیے مفضل

قمر

قتیلہ شفائے

دستِ پُر خوں کو کفِ دستِ لگاں گئے
قتلِ گمہ بھی جسے ہم محفلِ یاداں گئے
کچھ بھی دامنِ میں نہیں غارِ ملاحت کے ہوا
اے جُڑوں ہم بھی کسے کسے بہا ہوا گئے
ٹوٹے دھاگے ہی سے کرتے ہیں دفِ چاکِ جگر
کون بے چارے؟ سینہ دکھداں گئے
ہاں وہ بے درد تو بیگانہ ہی اچھا یارو
جو نہ تو قسیرِ غمِ درد گسارداں گئے
خندہ زن اُس پہ رہے حلقہ زنجیرِ جنوں
جو نہ کچھ منزلتِ سلسلہ دارداں گئے
توڑ دیں ہم جو نہ تلوار تو کینے جیسے
تیغ زن کیا ہم زخمِ زخمِ شعارداں گئے

گلزار



روح کا زخم

منقورہ نوری خلیق



سچی زخم مہر جالتے ہیں مگر روح کا زخم نہیں بدلتا
ہم سو، منظرِ مہیا پھر غدا کی دھجی بھرنا، ہنسی کو کچھ ایسی ہے

Kahkashan Library
& Book Binders
JANNA CHOWK, SUKRA



حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت کا آخری دور تھا۔ مشرق و مغرب کے بیشتر ممالک فتح ہو چکے تھے اور فتوحات کے علاوہ رفاہ عام کے کاموں میں بھی اسی مدد سے بڑھ چڑھ کر کھڑا کیا تھا۔ انھوں نے ایک کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک مدبر حکمران کی حیثیت سے مملکت اسلامیہ میں استحکام، خوشحالی اور کی لہروؤں کی تھی اب وہ ضعیف ہو چکے تھے اور انھیں ان کے شیرِ یزد کی دلی عداوت کے لیے مشور دے رہے تھے۔

شام کے سامنے پھیلنے جا رہے تھے۔ آفتاب تیزی سے جلد مغرب کی طرف رواں دواں تھا۔ اس کا اپنی لرزئی کرئیں بلند دیا اور رختوں کی چوٹیوں سے دنیا پر الوائی نظریں ڈال رہی تھیں۔ اس وقت معاویہؓ کے قلعہ نما مکان کی خاص نشست گاہ میں بیٹھ سے زیادہ رونق تھی۔ یوں تو ان کی صحبت میں ہی معزین اور اہل علم کا اجتماع رہتا لیکن آج اہل محفل تھے جیسے وہ سب کی خاص بات سن رہے تھے۔ حضرت معاویہؓ ستریس کے ہو چکے تھے مگر اس کے باوجود عزم و ہمت کا یکسر نظر آتا تھا۔ ان کے گرد جمع امیر و مصائب ان کے بولنے کے سنہرے تھے لیکن ان کے اندازِ بات رہے تھے کہ وہ خاموش چاہتے ہیں۔ انھیں اپنے ایک دیرینہ دوست عبداللہ بن جعفرؓ کا انتظار تھا جسے مدینہ طیبہ سے آج ہی پہنچنا تھا۔ اطلاع کے مطابق تو اسے اس وقت آجانا تھا، شام کی ہو رہی تھی مگر وہ ابھی تک نہیں تھا۔

عبداللہ بن جعفرؓ مدینہ منورہ کا ایک ذی حیثیت دولت مند اور بااثر سردار تھا۔ امیر معاویہؓ چند لمحے خاموشی سے ماحول کا جائزہ لیتے رہے پھر وقت کا احساس کر کے گویا ہوئے۔ ”ہم نے یزید کو طلب کیا تھا وہ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟“ ”جناب! انھیں اطلاع بھیج دی گئی ہے اب وہ آیا ہی چاہتے ہیں۔“ غلام نے عرض کیا۔ ”وہ کیا کر رہے ہیں جو ابھی تک نہیں پہنچے؟“ ”امیر معاویہؓ نے دریافت کیا۔ ”جناب وہ ابھی سفر سے واپس آئے ہیں شاید یہی چیز قبول حکم میں مانع ہو“ غلام نے جواب دیا۔ ”یہ سن کر امیر معاویہؓ خاموش ہو گئے پھر جیسے خود سے بولے۔ ”نجانے اسے شر سے زیادہ صحرا کیوں پسند ہے؟“

”امیر المومنین!“ مغیرہ بن شعبہ نے کہا ”بات دراصل یہ ہے کہ آپ کے فرزند پر ان کی ہاں کا غالب ہے وہ غلطی سے صحراؤں میں پل کر جوان ہوئی تھیں اور اسی سبب شہروں کی رونق اور گھما گھمی زیادہ بدوی زندگی اور سادگی پسند کرتی تھیں۔“

”ایہ! ہم نے تمہیں اس لیے طلب کیا ہے کہ آج مدینہ طیبہ سے عبداللہ بن جعفرؓ شرف لانے والے ہیں اور تم خوب جانتے ہو کہ ہمارے نزدیک ان کی حیثیت کیا ہے؟ وہ اعلیٰ مرتبہ بزرگ اور بہترین رفیق ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو مہمان کی سواری و مشق میں داخل ہو تم ان کا شایان شان

استقبال کرو اور ان کی سواری کو بعد احترام محل تک لاؤ۔ یہ حکم اس لیے دے رہے ہیں کہ تم ان کے مرتبے اور وقار کو بچاؤ اور انھیں بھی تمہیں استقبال کرنا دیکھ کر احساس ہو کہ وہ ہمارے کس مرتبے مہمان ہیں۔“

حضرت امیر معاویہؓ کی بات ختم ہوئی تو عقبہ بن کید نے احترام سے عرض کیا۔

”یا امیر المومنین! کیا یہ اعزاز اس خاکسار کو بھی حاصل ہو سکتا ہے؟“

”ہاں“ امیر المومنین نے جواب دیا۔ ”ہمارے معزز مہمان کا استقبال کرنے والوں میں تم بھی شامل ہو سکتے ہو۔ چند معزز امیر ہم پہلے ہی روانہ کر چکے ہیں لیکن یہ خصوصی حکم صرف یزید کے لیے ہے، ہاں اب تم بھی اس کے ساتھ ہو۔ جلدی جاؤ ایسا نہ ہو کہ ان کی سواری پہنچ جائے۔“ عقبہ بن کید نے شکریہ ادا کیا اور یزید کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

حضرت امیر معاویہؓ کے محل کا ایک مخصوص حصہ مہمانوں کے لیے آرامتہ تھا۔ بے چارے مصروفیت کے باوجود وہ بڑے مہمان نواز حکمران تھے۔ مورخین نے ان کی روزانہ مصروفیت کی تصویر کچھ یوں کھینچی ہے کہ نماز فجر کے بعد وہ کوئل شہرے شہر کے حالات سنتے اس کے بعد ان کے وزیر اور مشیر امور سلطنت پر غور و بحث کرنے کے لیے جمع ہو جاتے۔ ایک گھنٹے کے قریب وہ ان سے تباہ خیال اور مشغورے کرتے پھر پاشا کے بعد حکومت کے متعلقہ صوبوں کے معاملات کی سماعت کرتے۔ نماز ظہر میں امامت فرائض انجام دیتے اور نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ کر عوام الناس کی شکایات و مسائل سنتے۔ سہ پہر کے وقت محل میں اپنی خاص نشست گاہ میں عمائدین سلطنت سے ملاقات کرتے۔ شام میں دیگر صوبوں آئے ہوئے معززین اور عمال سے وہاں کے عوام اور حکومت کے بارے میں بات کرتے اور نماز عشاء کے بعد بڑے ارکان سلطنت سے ملاقات کرتے۔

مہمان خانہ شیخ و فنانوں کی کثرت سے روشن تھا کہ یہ اسلامی حکومت تھی عہدِ خلیفہ امیر معاویہؓ اور یزیدؓ کے تحت دمشق کو دار الخلافہ بنایا تھا ان کی شان قیصر کوئی سے کم نہ تھی۔ خوبصورت بلند و بالا قیام گاہ میں آرام و ساز و سامان اور غلاموں کی ریل پیل تھی۔ اس وقت بھی ایک آراستہ پیراستہ کمرے میں مہمان و میزبان دو ٹھوٹے گفتگو سے گوش پر آواز۔

امیر معاویہؓ ایک بڑے تخت پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھ ہوئے تھے، شیخ کی روشنی سے ان کی کٹھن جیسے چمک رہی تھی، چہرے پر وہ جلال اور رتبہ تھا جس کے سبب لوگ انھیں مہملانوں کا کرسی کہنے لگتے تھے۔

مشرق پہنچ گیا۔

یزید کی خاص نشست گاہ میں بڑی مدت بعد ان دو دوستوں کی محفل جمی۔ یزید دیر تک رہی باتیں کرتا رہا پھر مطلب کی طرف آیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔

”عقبہ! تھیں وہ کینیز یاد ہے جو معزز عبداللہ بن جعفر کے ہمراہ آئی تھی؟“ اس سوال پر عقبہ بری طرح ہلکا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اب سختی سے بند تھے مگر آنکھیں کمرہ رہی تھیں۔

”میرے امیر! میرے رفیق! میں تو ان تین برسوں میں ایک لمحے کے لیے بھی اسے فراموش نہ کر سکا۔ ان سارے ایسا لمحہ تھا جو اس کے تصور میں نہیں گزرا اور کون سی ایسی گھڑی تھی جو اس کے بغیر بسر نہ ہو۔۔۔۔۔۔ میرے دل کی دھڑکن تو ہر لمحے ”عمارہ“ ”عمارہ“ ”پکارتی ہے اور تم اس طرح دریافت کر رہے ہو کہ وہ کوئی معمولی لڑکی تھی اور مجھے کچھ کر بھلا دیا جاتا ہے۔“ مگر اس نے کچھ نہ کہا اور اسے خاموش رہ کر یزید سمجھا کہ وہ بھول گیا ہے وہ غصے سے مخاطب ہوا۔

”میرے دوست! شاید وہ لڑکی تمہیں یاد نہیں رہی بابا جان کے دوست عبداللہ بن جعفر کی وہ کینیز جو ان دنوں جیسی شان و شوکت اور ملک و ملک جیسا وقار رکھتی ہے۔ جس نے اس شب محفل میں اپنی آواز کا ہمارا دیا تھا اور اس رات ہم تمام شب سو نہ سکے تھے۔ تمہیں یاد نہیں اس کا نام عمارہ تھا۔“ عقبہ بن جعفر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا تو وہ خود ہی رازدار سی ہوئی۔ ”عقبہ! ہم عمارہ کو آج تک فراموش نہ کر سکتے۔ اگر وہ معزز عبداللہ بن جعفر کی کینیز نہ ہوتی تو اسے حاصل کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا مگر تم جانتے ہو کہ عبداللہ بن جعفر نے ہمارے تعلقات ایسے نہیں ہیں کہ ہم انہیں چلے بھانے یا سختی سے زیر کر لیں اسی لیے ہم نے تمہیں بلوایا ہے۔“

”تمہیں؟“ عقبہ بن کبید نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے حیرانی سے کہا ”بھلا میں اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں۔؟“

”تم ہی تو وہ واحد دوست ہو جو اس موقع پر ہمارے لیے سب کچھ کر سکتے ہو۔“ یزید اس کا ہاتھ تھام کر ”عقبہ تم ہر لمحے ہمارے بہترین رفیق ثابت ہوئے ہو مگر اس کے باوجود ہم تمہاری وفاداری کا امتحان کر رہے ہیں۔“ عقبہ بن کبید سمجھتا تھا کہ یہ کسی آزمائش تھی۔ یہ کیا امتحان تھا۔

”تمہیں نہ سنا تو بڑی دیر بعد حیرانی سے بولا۔

”امیر المؤمنین! مجھے کیا کرنا ہے۔ اس کی وضاحت فرما دیجئے؟“

”عقبہ! ہم صرف عمارہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے پاس اس کو حاصل کرنے کا تمام سوا

”میرے دوست عقبہ! عمارہ ہمارا سب کچھ ہے گئی ہم اپنی تمام زندگی اتنے بے چین کسی نہیں ہو جتے آج ہیں۔ عمارہ نے ہمارا کچھ نہیں لوٹ لیا ہے۔“ اس جملے پر عقبہ نے چونک کر یزید کی طرف دیکر یزید کے لبوں پر غمگین مسکرائی۔ عقبہ حیرت سے یزید کو دیکھتا رہا پھر دونوں دوست اپنے کھوئے سوا و مشق کی طرف لوٹ آئے۔ یزید بار بار عمارہ کا ذکر کرتا رہا اور عقبہ اس وقت ایک ہی بات سوچ رہا کہ دو گھرے دوست ایک ہی لڑکی سے عشق کرنے لگے ہیں اور اب اس عشق کا انجام کیا ہو گا؟ سوال پر غور کرتے کرتے پھر اس نے عجیب و غریب فیصلہ کیا کہ وہ کبھی بھی اپنے عشق کا اظہار نہیں کر گا۔ اس فیصلے نے عقبہ کی زندگی کی بنیادیں ہلا دیں لیکن اسی شام عقبہ بن کبید و مشق چھوڑ چکا تھا۔ یزید کا اصرار یا شکار کے لیے پروگرام اس کے فیصلے اور ارادے میں رکاوٹ نہ بن سکتے تھے۔ اس تجارت کا بہانہ کیا اور عراق کی طرف روانہ ہو گیا۔ رخصت کے وقت یزید نے پھر عمارہ اور اپنے عشق تذکرہ کیا مگر عقبہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ایک سگتی آگ سیٹھنے میں لے دے مشق سے رخصت ہو گیا۔ وقت اپنے دامن میں بے شمار اچھے برے واقعات سیٹھ گزرتا رہا۔ اس دوران یزید کو علم نہ ہوا اس کا دوست کہاں ہے اور نہ ہی عقبہ نے پھر اس طرف آنے کی جرات کی جہاں اس کی دنیا بھٹی تھی تین برس گزر گئے اور ۶۰ھ میں حضرت امیر معاویہؓ نے وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر اٹھتر برس یزید بن معاویہ کی دلی عہد کے لیے اکثر عہدوں میں امیر معاویہؓ جو خود بیعت لے چکے تھے۔ ان کی دیکھ کے بعد یزید مست غلاف پر ممکن ہوا لیکن یزید نے دے داریوں اور حکومتی معاملات کے ساتھ ساتھ ہمیشہ عمارہ کا خیال ستا رہا۔ عبداللہ بن جعفر کی کینیز عمارہ تین برس قبل اس کا میر و قرار لوٹ کر لے گئی اور جس کا حصول یزید کے لیے اس وقت جتنا ناممکن تھا آج بھی اتنی ہی مشکل نظر آتا تھا۔ حاکم وقت جانے کے باوجود وہ اپنے باپ کے معزز دوست سے ٹکرانے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا۔ اسی لیے وہ کسی طریقے سے عمارہ کو حاصل کرنے کے بارے میں سوچنے لگا جس میں کامیاب ہو جائے اور عبداللہ بن کی دل شکنی بھی نہ ہو مگر ہر تدبیر غور و فکر کے بعد فضول نظر آتی۔ آخر غور کرتے کرتے اس کے ذہن ایک خیال نیا آیا جس سے عمارہ کا حصول سہل نظر آیا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ عمارہ کو حاصل کر کے سلسلے میں عقبہ بن کبید سے مدد لی جائے۔ عقبہ نہ صرف قابل بھروسہ رفیق تھا بلکہ جری اور ہمار تھا۔ عقبہ نے اکثر مواقع پر خود کو ایک ہمدرد اور قابل اعتماد دوست ثابت کیا تھا۔ وہ دیر تک غور کرتا پھر اس نے فوری طور پر حکم دیا کہ عقبہ بن کبید کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ یہ حکم ایک دوست کا بلکہ حاکم وقت کا تھا لہذا عقبہ بن کبید کے سامنے قہر حکم کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پیغام ملے

قرار ہو کر ٹہلنے لگا اور پھر جلد بازار بند کروادیا۔ دوسرہ ماہی بے آب تھا اور مین اسی وقت عمارہ عقبہ کے دیے ہوئے سین لہاس کو پین کر عبداللہ بن جعفر کی آغوش میں دراز تھی۔ صورت حال سے بے خبر وہ دونوں مصروف عیش تھے اور عقبہ اپنے قلب مضطرب کی خاطر پڑاؤ سے باہر ٹہلتے ہوئے رہا بار بار اس بلند دیوالا مکان کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں اس کی متاع حیات دوسرے کی ہانوں میں تھی۔ تمام شب عقبہ نے ٹہلتے ٹہلتے ہی گزری اور آج اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جس محبت کو وہ تین برس کی مسلسل سچی و کاوش سے پاؤ وجود نہ دیا تھا اب وہ دیار میں اس آکر کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ چنگاری جو مسلسل اسے سلا رہی تھی اب ایک شعلہ بن گئی اور وہ اس آگ میں جل رہا تھا تڑپ رہا تھا مگر افسوس تک نہ کر سکتا تھا اس شب وہ حسرت سے سوچتا رہا۔

"کون کتنا ہے کہ محبت دو طرفہ ہوتی ہے۔ عمارہ کو تو علم ہی نہیں کہ اس پر کیا گزر رہی ہے اور شاید مگر بھر وہ جان بھی نہ سکے" وہ سوچتا رہا خیالات گلدھڑ ہوتے رہے اور صبح ہو گئی۔ چند دن عمارہ کے تصور کی اندر ہو گئے پھر اسے نیا متحدہ دینے کے خیال سے اس نے دو گھنٹوں میں جڑی بوٹیوں کی ایک کبھی تیار کروائی جس کی ششیں آرام دہ پردے ریشمی اور موم تھیں۔ ان میں جگہ جگہ موم کی گتے ہوئے تھے۔ دونوں گھنٹوں کے پیروں میں اس قدر ٹھنڈو بندھے ہوئے تھے کہ جب وہ چلنے کو ایک سازی آواز پیدا کرتے اور نفا مترنم شور سے گونجنے لگتی۔ یہ سواری بڑی ہی خوبصورت اور قیمتی تھی جسے اس نے اپنے خاص غلام کے ہاتھ عبداللہ بن جعفر کو بھیجا اور کھولایا۔

"معزز امیر! میں نے ایرانی شہزادوں کے انداز پر یہ سواری خاص طور پر آپ کے لیے بنوائی ہے اور معزز خانوں سے فرما دیجئے کہ میں نے اس خاص ہار کے لیے اپنے تیز رفتار سواریوں کا دستہ شام بھیجا ہے۔ چند یوم تک ہار آجائے گا تو خدمت عالیہ میں حاضر ہونے کی جرات کروں گا۔" عبداللہ بن جعفر کے لیے یہ خاص سواری بڑی اہم تھی وہ بہت خوش ہوا اور اسی وقت عمارہ سے کہا۔

"عمارہ! اپنا بہترین لباس پہن کر تیار ہو جاؤ۔ ہم تمہیں ساتھ لے کر اس سواری میں مدینے کا گوشہ لگا کر چاہتے ہیں اور معزز تاجر عقبہ بن کید کا شہر یہ بھی ادا کرنا ہے۔" عمارہ خود بھی مسرور تھی اس نے قبول حکم میں اس تاجر کا دیا ہوا لباس زیب تن کیا اور اپنے آقا کے ساتھ یہ کرکٹ لگ گئی۔

یہ شام عقبہ بن کید کے لیے بڑی عجیب تھی جس میں خوشیاں بھی تھیں اور دکھ بھی۔ عمارہ اس سے عطا کردہ لباس میں بڑی شان سے جلوہ افروز تھی اور وہ اپنے بچپن کو بھلائے ہوئے جذبات کی پو پوشی کے لیے عبداللہ بن جعفر سے محو گفتگو تھا۔ اپنے میں کبھی دل چاہتا کہ وقت ختم جائے اور عمارہ

بہر اس کے سامنے بیٹھی رہے اور کبھی دل چاہتا کہ وہ تنہا ہو اور صرف عمارہ کا تصور ہو، یوں بڑی مشکل سے وقت گزرا اور جب وہ روانہ ہوئے تو عبداللہ بن جعفر اس کے اخلاق سے اس درجہ متاثر تھا کہ دعا کی کے وقت بولا۔

"معزز تاجر! اگر میں کہوں کہ آپ میری ممانی قبول کریں تو کیا آپ یہ تکلیف گوارا کریں گے؟" "میں اب بھی آپ ہی کا ممان ہوں۔ مدینہ آپ کا ہی تو شہر ہے۔" عقبہ کے اس جواب پر عمارہ مسکرائی اور وضاحت کے لیے بولی۔

"معزز سوداگر! میرے آقا کا مطلب ہے کہ آپ ہمارے گھر قیام فرمائیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "معزز خانوں! میں ان کا مطلب سمجھ گیا ہوں مگر یہ ہے کہ میرا قیام اس پڑاؤ میں بہت ضروری ہے لیکن میں اب بھی آپ کے دولت خانے کا ہی ممان ہوں کیونکہ میرا پڑاؤ آپ کے دولت کدے سے لگاؤ دور نہیں ہے۔"

اس ادب صورت گریز پر عبداللہ بن جعفر اور عمارہ بڑی خوش دلی سے ہنسنے پھر عبداللہ نے مصافحہ کرتے کرتے کہا۔

"اچھا! یہ وعدہ کریں کہ کبھی ہمارے غریب خانے پر ضرور تشریف لائیں گے۔" عقبہ بن کید کو وعدہ پڑا اور عمارہ اپنے آقا کے ساتھ چلی گئی تو عقبہ نے دور تک انھیں جاتے دیکھا۔ آج اس کا دل بڑی طرح چلنا تھا کہ صرف ایک مرتبہ یاد دے کہ وہ تین برس سے اس کے عشق میں مل رہا ہے مگر یہ اظہار حال نہیں تھا اور یہ محسوس کر کے جب اس کی بے تابی کچھ اور بڑھی تو اس کا دل چاہا کہ مدینہ منورہ کو لے کر مدے اور کچھ سپن تھا اور وہ ان گوشے میں جا کر آباد ہو جائے تہاں روز روز عمارہ کا دیدار اسے مطلب نہ کرے مگر ایسا کرنا بھی مشکل ترین امر تھا۔ ابھی تو اسے عبداللہ بن جعفر اور عمارہ کے مزید ملنا تھا اور پھر اپنے لانا لال عشق کو سینے میں دفن کر کے اپنے دوست یزید کے لیے عمارہ کو حاصل کرنا تھا۔ کام بڑا صبر آزما تھا۔ اور اس کا منصوبہ طویل تھا اور عمارہ کے حسن کی بجائیاں اسے جلاتے دیتی تھیں مگر وہ مجبور اور بے بس تھا۔

نہالہ بعد عمارہ کا مطلب ہار لے کر خود اس کی خدمت میں پہنچا۔ شام کا وقت تھا۔ عمارہ جج دج کر اس کے والے دانی تھی۔ عبداللہ بن جعفر نے جو بنی عقبہ کی آمد کی خبر سنیں تو اسے گھر کے اندر طلب کر لیا۔

"میں شرمندہ ہوں کہ تا وقت حاضر ہوا" آپ کہیں تشریف لے جا رہی ہیں مگر میری آمد مجبوری کے

سبب تھی کیونکہ میرا ساتھی وہ بار لے کر آج آیا ہے اور میں نے سوچا آپ کو فوری پہنچا دوں۔“
 ”وہ بار آیا؟“ عمار جیسے خوشی سے پاگل ہو گئی۔ پھر جلدی سے بولی۔ ”بھلا آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ آپ نا وقت تشریف لائے ہیں؟ بخدا آپ بالکل صحیح وقت پر تشریف لائے ہیں میں کہیں جانیں رہی تھی بلکہ آقا کے لیے تیار ہو رہی تھی۔“

اس بات سے عقبہ کو جیسے سانس لپٹی دشوار ہو گئی اور پھر رقابت کے جذبے نے یوں سر اٹھایا کہ اس کا انگ انگ سلگ اٹھا۔ کاش عمار اس کے لیے تیار ہو جاتی۔ اور زندگی میں صرف ایک مرتبہ وہ یہ سن سکتا کہ عمار اس کی ہے۔ چنانچہ دیوانوں کی طرح کھڑے رہنے کے بعد اسے اپنی حالت کا احساس ہوا تو اس نے فوری خود پر قابو پایا اور بار عمار کے حوالے کر دیا۔ لیکن اسے ایک اور تکلیف مرحلے سے گزرتا ہوا۔ عمار بار پہن کر مسرت سے کھلی جا رہی تھی اور عبداللہ بن جعفر اسے محبت بھری نظروں سے تنگ رہا تھا۔ یہ صرف چند لمحوں کے لیے ہو مگر عقبہ پر تو جیسے ایک قیامت گزری تھی۔

اس شب عبداللہ بن جعفر نے عقبہ کو بعد اصرار روک لیا۔ لذیذ اور پر تکلف کھانے کے بعد عمار نے گیت شروع کیا۔ اس کے حسن خدا واد اور دلکش آواز نے عقبہ کو ایک محبتیہ پھر بے خود کر دیا اور قرب کے باوجود اس نے یہ شب کانٹوں پر گزاری۔ وہ عمار کی دل میں اتر جانے والی آواز سنتے ہوئے ان دونوں کے عشق کے عجیب منظر دیکھتا اور کڑھتا رہا۔ کبھی عمار آقا کو پیار سے دیکھتی اور کبھی عبداللہ بن جعفر اسے یوں دیکھتا کہ عقبہ کو اپنا وجود بے مقصد نظر آئے لگتا۔

اس واقعے کے بعد عقبہ بن کیدہ وقتاً فوقتاً محضے محضے لے کر عبداللہ کے گھر جانے اور اس سے قریب ہونے لگا۔ اب وہ دونوں گھنٹوں مختلف موضوعات پر بحث کرتے اور ہر بار عبداللہ بن جعفر کو عقبہ کی عقلیت و قابلیت کا قائل ہوتا پڑتا۔ رفتہ رفتہ عقبہ کو زیادہ سے زیادہ قابل مجروح سا ظاہر کرتا رہا لیکن جب بھی محفل میں عمار آجاتی تو اسے یوں لگتا جیسے قوت دیوایا گیا سلب ہو رہی ہے۔ اول تو اپنے آقا سے اس کی محبت کے مظاہرے اس کے لیے بڑے تکلیف دہ ہوتے۔ دوسرے اپنے جذبات کی پردہ پوشی بھی اس پر لازم تھی لہذا وہ بے چین و مضطرب اور پریشان رہتا۔ ان ملاقاتوں نے اسے عبداللہ بن جعفر کے قریب تر کر دیا یہاں تک کہ ان دونوں کی دوستی مشہور ہونے لگی۔ اب وہ جہاں جاتے ساتھ جاتے۔

اسی زمانے میں یزید بن معاویہ کا پیغام لے کر ایک قاصد عقبہ کے پاس آیا۔ یزید نے دریافت کیا تھا کہ جس کام کے لیے مدینہ آئے تھے اس کا کیا رہا؟ اس سوال نے عقبہ کو جیسے کچھ اور مضطرب کر دیا مگر اس نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

”میرے کہنا ہے کامیابی کا وقت قریب ہے۔ اپنے دوست پر اعتماد کریں اور تھوڑا سا انتظار اور کر لیں۔“

قاصد جواب لے کر لوٹ گیا اور عقبہ بن کیدہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس وقت تک اس نے اپنی بذلہ سخی اور عالمانہ گفتگو کے باعث عبداللہ بن جعفر کو اس طرح متاثر کر لیا تھا کہ وہ اسے مدینہ طیبہ میں اپنا بہترین رفیق سمجھنے لگا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے رازدار و ہمسفر تھے اور عقبہ کسی بہتر وقت کا منتظر کامیابی کی منزلیں تیری سے ملے کر منزل کی طرف رواں تھا مگر یہ منزل اس کے لیے نہیں آ رہی تھی۔ راہ کی تمام صعوبتیں اور مشکلات عقبہ کا مقدر اور منزل کا کچھ جین یزید کا حصہ تھا۔ عمار اس کی نہیں یزید کی تھی۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ وہ عمار کو اتنا چاہتا ہے کہ اگر اسے حاصل نہ کر سکا تو زندہ نہ رہے گا۔ کبھی خواہش ہوتی کہ عبداللہ بن جعفر سے عمار کو حاصل کر کے کسی اور دروازے علاقے میں چلا جائے اور گامی کی زندگی بسر کرے مگر پھر اس کی فطری شرافت قدموں کی زنجیر بن جاتی۔ دوست کے اعتماد کو نہیں پہنچانا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

ایک شب عبداللہ بن جعفر کے گھر محفل جمی ہوئی تھی۔ اس نے عقبہ کے اعزاز میں شاندار ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ کھانے کے بعد بہترین شراب کا دور چلا تو عمار نے حسب دستور اپنی دلکش آواز میں نغمہ ادا کیا۔ آج اس کی آواز میں کچھ زیادہ تھی۔ شراب بھی عمدہ قسم کی تھی اس پر خوب صورت احوال کے سبب عقبہ مضطرب ہوا جا رہا تھا۔ وہ اشتیاق بھری نظروں سے اس لڑکی کو تنگ رہا تھا جس کی برسوں پہلے پرستش کر رہا تھا اور کوئی اس کے خیال سے خالی اور کوئی دن اس کے تصور کے بغیر نہ تھا۔ وہ اپنی دل میں ایسا کم رہا کہ اسے یہی نہ چلا کہ کب عمار نے گیت ختم کیا اور کب نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”جی کتنا معزز تاجر! تم نے اتنی حسین اور خوش گلوزینہ دیکھی ہے؟“

”معزز نہیں!۔“ عقبہ بن کیدہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”اگر میں یہ کہ دوں کہ دیکھی ہے تو یقیناً سب کو ہلکا ہوگا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عمار اس درجہ حسین اور مکمل ہے کہ اس کا تصور ممکن نہیں کیونکہ ان دو عالم میں نہ کوئی اس کا عینی ہو سکتا ہے نہ انداز آواز میں۔ یہ ماہ روماء بن زینب کے زمانہ ہے اور ان کا لڑکا انصیب ترین انسان۔“

”اچھا! ایک تاجر کی حیثیت سے اندازہ کرو کہ عمار کی قیمت کیا ہوگی؟“ عبداللہ بن جعفر نے اپنی پچھلے پیمانے کی خوش نمیش کی تھی۔

”مگر میں اس رقم کے عوض عمارہ کو خریدنے کے لیے تیار ہوں۔“ عتبہ بن کید نے کہا۔ ”اور یہی نہیں بلکہ جاتے وقت اپنا تمام مال مدینہ میں ہی چھوڑ جاؤں گا جو آپ کی ملکیت ہوگا۔“

عبداللہ بن جعفر کی کیفیت دیدنی تھی۔ بے شمار مال اور دس ہزار اشرفیاں۔ لالچ اس پر غالب آیا۔ اس نے کئی برس قبل عمارہ کو نہایت سستے داموں خریدا تھا اور اب اتنی مدت بعد اس قدر بڑی رقم پر فروخت کرنا اس کے خیال میں بڑا مناسب سودا تھا۔ وہ یقین اور بے یقینی کے عالم میں رہنے کے بعد اطمینان سے بولا۔

”معزز عتبہ! کیا تم مذاق تو نہیں کر رہے کہ اپنی عمر بھر کی دولت کے عوض ایک لڑکی خرید رہے ہو۔ ایسی لڑکی جو برسوں ایک سو کے ساتھ کینز کے طور پر بچ رہی ہے۔“

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“ عتبہ نے شہیدگی سے کہا۔ ”اگر آپ کو یقین نہ ہو تو کچھ دیر انتظار رہائیں تو میں دس ہزار اشرفیاں اور اپنے تمام مال کی قیمت آپ کے قدموں میں رکھ دوں گا۔“

یہ سن کر عبداللہ بن جعفر حیران رہ گیا اور اس طرح بالکل اچانک اور انوکھے انداز میں عمارہ، عتبہ کے ہمراہ نکلی۔ اس وقت عمارہ کی کیفیت بھی عجیب تھی۔ وہ اپنی زندگی کے چند بہترین سال عبداللہ بن جعفر کے ہمراہ گزار چکی تھی اور اب جدائی کا تصور اسے طویل کر رہا تھا لیکن جتنی خطرہ رقم سے عوض عتبہ سے اسے خریدا تھا وہ اس کی بے پناہ محبت اور دولت مند کی اظہار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عتبہ کے ہاں اس کی حیثیت انفرادی ہی رہے گی اس لیے وہ پر سکون تھی۔ یہ شب تینوں نے جاگ کر گزاری اور صبح کی کیفیت ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ عبداللہ بن جعفر اس انوکھے سوچے پر مسرور تھا۔ عمارہ کے تبدیل کی بارے میں سوچ رہی تھی۔ عبداللہ سے اسے قلبی ہلکاو تھا مگر آقا بھی کم نہ تھا لیکن اس وقت عتبہ بن کید جیسے قیامت سے گزر رہا تھا۔ بظاہر مسرت کا اظہار کر رہا تھا لیکن حقیقتاً وہ اندر لرزتا رہا تھا اور سخت آزمائش کی گھڑی تو اب آئی تھی کہ متاع عزیز کو اپنے دوست کے حوالے کرنا اور وہ سوچ رہا تھا کہ عمارہ کو بیڑہ کے حوالے کر کے کسی دیوان اور گنہگار علاقے میں رہ کر بقیہ زندگی گزار

اگلی صبح عمارہ عتبہ کے ہمراہ مدینہ طیبہ سے روانہ ہو گئی۔ مدینہ طیبہ سے چند میل کے فاصلے پر عتبہ نے قیام کے لیے ایک محفوظ جگہ کا انتخاب کیا یہ ایک سرائے کا الگ تھلک حصہ تھا۔ یہاں عورتوں کی آمد و رفت کرنے والے تاجر ہی قیام کرتے تھے۔ عمارہ کے ساتھ اس گھر میں عتبہ کی پہلی شہ تھی۔ دن بھر گزرنے کے بعد وہ تھک کر اپنے بستر پر لیٹا تھا کہ آہٹ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے تیزی سے

”میری نظر میں تو عمارہ انمول ہے۔“ عتبہ بن کید نے سنبھلے ہوئے کہا۔ ”لیکن بھلا آپ اگر اس کی قیمت کا تعین کرنا چاہتے ہیں تو صرف اتنا کہوں گا کہ اسے غلیظ وقت کے سوا کوئی اور نہ خرید سکے گا۔“ عتبہ کے اس جواب پر عبداللہ بن جعفر حواس باختہ سا رہ گیا کیونکہ اسے عمارہ کے لیے ایسا گمان نہ تھا۔ بلاشبہ وہ ایک حسین لڑکی تھی مگر اتنی بھی انمول نہیں کہ کوئی شخص اسے خرید نہ سکے۔ عبداللہ بن جعفر نے ایسا سوچا بھی نہ تھا لہذا چند لمحوں بعد اس نے پھر تصدیق چاہی اور بولا۔

”دوست! آج کو کیا یہ حقیقت ہے کہ عمارہ کی اتنی قیمت بے یا تم مجھے خوش کرنے کے لیے یہ بات کہہ رہے ہو؟“

”معزز عبداللہ! عتبہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خوشامد یہی عادت نہیں۔ میں ایک معمولی تاجر ہوں۔ آج مدینہ طیبہ میں ہوں کل کہیں اور مگر میں نے اعلا ترین کینز بھی دیکھی ہیں مگر عمارہ سب سے جدا ہے۔ ہاں اتنا کہ دوں کہ اگر تم اسے میرے ہاتھ فروخت کرنے لگو تو میں شاید اپنی تمام دولت اور مال دے کر بھی اسے سستا سودا سمجھوں گا۔“ اس وقت عبداللہ بن جعفر کی حالت دیدنی تھی۔ اس کے یقین کے مطابق عتبہ بن کید ایک بہت بڑا تاجر تھا لہذا اس نے قدرے جھک کر راز دارانہ انداز میں پوچھا۔

”معزز سوداگر! تمہاری کل دولت کتنی ہے؟“

”جناب! عتبہ نے سرگوشی کی۔ ”میں فی الوقت اس کا اندازہ تو نہیں کر سکتا لیکن اس وقت میرے پاس نقدی کی صورت میں دس ہزار اشرفیاں ہیں۔“ یہ سنتے ہی عبداللہ بن جعفر کی نیت بد گئی۔ وہ بے تابی سے بولا۔

”کیا تم عمارہ کا سودا کرنا پسند کرو گے؟ اور صاف صاف بتاؤ کہ کیا قیمت دینا پسند کرو گے؟“ عتبہ بن کید سمجھ گیا کہ لہوا گرم ہے۔ وہ اطمینان سے آخری ضرب لگانے کے لیے بولا۔

”میرے دوست! میں سوداگر ہوں جو خرید و فروخت میں کم سے کم قیمت دے کر اعلا مال خریدنا چاہتا ہے لیکن عمارہ وہ مال ہے جس کے لیے میں بڑی سے بڑی رقم بھی خرچ کر دوں تو سودا منگنا نہیں اگر آپ عمارہ کو واقعی دینا چاہتے ہیں تو میں اپنے پڑاؤ کے تمام مال کے علاوہ دس ہزار اشرفیاں دینے کے لیے تیار ہوں جیسا کہ عرض کر چکا ہوں اور یہ میری کل دولت ہے۔“ بے حساب مال اور دس ہزار اشرفیاں؟ عبداللہ بن جعفر کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”تم جانتے ہو کہ اتنی بڑی رقم پر کوئی کینز نہیں بکتی۔“

دیلے کی لادائیگی کی تو عمارہ پورے سنگھار کے ساتھ مصحور کر دینے والے انداز میں نیم عریاں لباس پہنے اس کے بستر کے قریب کھڑی تھی۔ عتبہ چونک پڑا اور بولا۔

”عمارہ! تم یہاں..... اس وقت؟“

”جی ہاں۔“ عمارہ مسکرائی۔ ”آپ نے میری قیمت ادائیگی ہے اس لیے میں آپ کی ہوں۔“

اس وقت عمارہ قنارہ عالم بنی قیامت ڈھاری تھی۔ اس کی ادائیں دعوت دے رہی تھیں عتبہ کی بری حالت تھی۔ دل تو چاہتا تھا کہ اسے کھینچ کر سینے سے لگالے۔ یہ وہی تو ہے جس کی وہ برسوں سے پرستش کر رہا ہے اور آج وہ اسے اپنا آقا سمجھ کر سب کچھ اس کے سپرد کرنے آئی ہے مگر گناہی ہی اس کی فطری شرافت عود کر آئی اور وہ اپنی سوجھوں میں کھویا ہوا تھا کہ عمارہ اس کے قریب بستر پر بیٹھ گئی اور اس کے گلے میں بائیں ڈال کر بولی۔

”کیا سوچ رہے ہو میرے آقا! آپ نے اتنی بڑی قیمت دے کر شے خریدی ہے کہ میں عمر بھر اپنے آپ پر فخر کر سکی ہوں۔“ اس کے انداز سپردگی اور اطمینان پر عتبہ کانپ گیا لیکن تیزی سے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے اس نے جلدی سے عمارہ کے بازو اپنی گردن سے نکالے اور بھرائے ہوئے لبے جسے میں بولا۔

”میں نے تمہیں اپنے لیے نہیں خریدا!..... تم..... تم.....“ یہ اور اور جملہ سننے ہی عمارہ کھڑی ہو گئی اور حیران ہو کر بولی۔

”پھر تم نے اتنی فطرت پرور قدے کر مجھے کس کے لیے خریدا ہے؟ آخر وہ کون ہے؟“

”وہ میرا المومنین یزید بن معاویہ ہے اور میں نے تمہیں انھی کے لیے خریدا ہے کیونکہ وہ برسوں سے تمہارے عشق میں گرفتار ہیں اور چاہتے تھے کہ تمہیں ہر قیمت پر خریدا لیا جائے۔“ عتبہ نے یہ سب کچھ کس طرح کہا اس کا اندازہ بس اسی کو تھا لیکن عمارہ کے چہرے پر تبسم عود کر آیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”اور میں سمجھ رہی تھی کہ تم میرے عشق میں دیوانے ہو رہے ہو۔“ اس جملے پر عتبہ کو سانس لینا دشوار ہو گئی۔ اس نے عمارہ کی طرف پیچھ کر لی تو عمارہ چند لمحوں کھڑی رہی پھر اطمینان سے اپنی خواب گاہ میں چلی گئی وہ ساری حقیقت سے واقف ہو گئی تھی اس نے پر سکون ہو کر سو گئی اور عتبہ تمام شب جاگتا رہا۔

منزل بہ منزل سفر کرتے ہوئے وہ دمشق کی جانب رواں تھے۔ اس سفر کے دوران عتبہ کے دل نے اسے بار بار بغاوت پر اکسا کر عمارہ کو حاصل کر لینے کی ترغیب دلائی۔ یہ وقت یہ قہمت یہ تھنائی اسے کڑی

اور پھسے سے بار بار بکے گھر آتے ہوئے۔ ”خزدار عجم جو تم نے آئندہ مجھے کبھی شادی میں بھیجا۔ غضب خدا کا آگاہ کرو۔“ عتبہ لکھا تھا اور ہوا کیا رہے۔

”ہی۔“ یوں کیا کھانا دے ملا۔

”نہیں“ قاضی صاحب بکے تھے۔

پس محمد سلیم عارف، ذہیرہ اسماعیل خان۔

اس امتحان میں ڈال رہی تھی مگر نہ تو وہ بے وفاتھا، نہ یواہوس عاشق۔ اس نے دل کی گہرائیوں میں اس کی محبت کی تھی اس کا عشق شاید یزید سے زیادہ پختہ تھا مگر جب بھی چلا اس نے پوری اس کے ساتھ اپنے جذبے کو کھینچ کر سلایا۔ یوں قیامت سے گزر کر اس نے یہ سفر طے کیا اور اس کے گرد مشق پہنچ گیا لیکن دمشق میں داخل ہونے کے بعد اس نے سب سے پہلے جو خبر سنی وہ یزید کا نکاح تھا۔ عتبہ کا برا حال تھا۔ دوست کی موت اس لیے بھید جانکا تھا لیکن اس حالت میں بھی عشق دل کے ذریعے آواز دے رہا تھا کہ یزید فوت ہو گیا۔ عمارہ تیرے قبضے میں ہے، اسے جلد از جلد اپنا لے مگر فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے میں اس کی دیر اور شرافت رکاوٹ بن رہی تھی۔ آخر وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو اس نے اس معاملے کو نئے امیر کے سپرد کیا۔

اس سال معاویہ بن یزید معاویہ ثانی تخت خلافت پر متمکن ہو چکا تھا۔ عتبہ کو اس کی تخت نشینی کی خبر ملی ان اتنا نہ رہی۔ بے باک و بے غرض نوجوان اسے جوش سے پسند تھا اور اپنے باپ سے بالکل مختلف تھا۔ کاماک تھا۔ اسے اقتدار کی طلب تھی نہ عیش و عشرت سے لگاؤ۔ عتبہ بن کیدہ عمارہ کو لے کر اس کے حاضر ہوا تو معاویہ ثانی اپنے باپ کے اس ذہن دیر اور خاص دوست کو دیکھتے ہی پہچان گیا اور بولا۔

”عتبہ بن کیدہ! تم اتنا عرصہ کہاں تھے؟“ جواب میں عتبہ نے تمام واقعہ من و عن بیان کر دیا اور

”امیر! میں نے سوچا کہ جس کنیز کو باپ کے لیے خریدا تھا اس کا اصل حق دار اب بیٹا ہے۔ آپ عمارہ کو دل لہجے اور شہجے بری الذمہ کر دیتے گا۔“

”نہیں“ معاویہ ثانی نے سختی اور ناگواری سے کہا۔ ”میرے باپ کے زمانے میں جو بد عنوانیاں ہوئی تھیں، اب میں ان پر بہت شرمسار ہوں کنیزیں رکھنے خریدنے کا امیر کو کوئی ارادہ نہیں لہذا تم عمارہ کو لے

جاؤ اس ہم تمہیں بخشے ہیں۔“ عقبہ بن کیدہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے سسکیوں سے دیکھا کہ حسین کبیر سر سھکائے کھڑی تھی مگر وہ جنت تمام کرنے کے لیے بولا۔

”جناب! عمارہ کی قیمت آپ کے والد نے ادا کی تھی اس وجہ سے تمام ترکے کے ساتھ عمارہ بھی آپ کی ہے۔“

”عقبہ بن کیدہ! معاویہ ثانی کا لہجہ تلخ تھا۔ ”ہمیں ان باتوں سے کوئی سروکار یا غرض نہیں ہے۔ جاؤ اس لڑکی کو لیے جاؤ۔“

عقبہ اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے ہلکی ہلکی چال چلتا عمارہ کو ساتھ لیے دربار سے نکلتا تو عمارہ بری طرح رو رہی تھی۔ اس کے خیال میں اسے کوئی بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس کا پسلا مالک اور محبوب آقا اسے منہ مانگی رقم لے کر فروخت کر چکا تھا اور عقبہ نے یہ سودا اپنے لیے نہیں کیا تھا۔ یزید مرگیا تھا جسے وہ اپنا آقا تصور کر رہی تھی اور اب اس کا فرزند معاویہ ثانی اس سے سترواداری کا اعلان کر چکا تھا۔ اس کے گرد تاریکی ہی تاریکی تھی۔ وہ بری طرح سسکتی اور روتی رہی۔

اسی شب پہلی مرتبہ عقبہ نے یہ عزم کیا کہ آج عمارہ کو سب کچھ بتا دوں گا۔ عمارہ کے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر اسے عمارہ کی سکیاں سنائی دیں۔ اس کے قدم رک گئے۔ وہ کیوں رو رہی ہے اس کو علم نہ تھا مگر یہ سکیاں اسے مضطرب کر رہی تھیں۔ وہ اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ شاید اپنے خیالات کو ذہن میں ترتیب دے کر انھیں الفاظ کی شکل دینا چاہتا تھا یا اپنی ٹیڈیہ سے حال دل کہنے کے تصور سے دھڑکنے لگ کر سنہال رہا تھا یا پھر شاید چھپ کر عمارہ کے رونے کا سبب جاننا چاہتا تھا۔ ابھی وہ سوچ میں گم عمارہ کے کمرے میں داخل ہونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ عمارہ خود روٹے روٹے ایک عزم کے ساتھ اٹھی اور کمرے سے نکلی کمرے سے کھڑا دیکھ کر ٹھٹھکی گئی شاید وہ خود بھی اس سے کچھ مٹنا چاہتی تھی۔ عقبہ نے اپنی فکر کو جھٹک کر عمارہ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ سرخ تھا اور اب کپکپا رہے تھے۔ وہ چند لمحوں کے لیے سانس کھڑی اسے تکی پر پھر تیزی سے آگے بڑھ کر عقبہ کا رکیان جذباتی انداز میں تمام کر گلو گھر آوازیں بولی۔

”اے شریف آدمی! مجھے تاجس مال کا کوئی خریدار نہ ہو اس کا کیا ہوتا ہے؟“ اس سوال پر عقبہ کیدہ نہ جانے کس تصور میں شرمسار ہو گیا اور اسٹگی سے بولا ”وہ اپنے مالک کے پاس رہتا ہے اور مالک کو سب سے زیادہ وہی مال عزیز ہوتا ہے۔“ یہ سن کر عمارہ کے آنسو دوبارہ پھوٹ پڑے وہ بے ثانی سے بولی۔

”تو پھر مجھے میرے مالک کے پاس ہی چھوڑ آؤ۔“

عقبہ کے ہوش جیسے اڑ گئے۔ اس کا مقصد تو یہ تھا کہ عمارہ اس کے پاس رہے گی جبکہ عمارہ سمجھی کہ وہ اسے عبد اللہ بن جعفر کے پاس چھوڑ آئے گا۔ اس وقت اس کا دل چاہا کہ عمارہ کے دونوں ہاتھ تمام لے اور کہے۔

عمارہ! تم میری ہو، صرف میری۔ عبد اللہ بن جعفر یزید یا معاویہ ثانی کوئی بھی تم سے اتنا عشق نہیں کرتا کہ میں کہتا ہوں۔ میں برسوں سے آگ میں جل رہا ہوں اور اب تو میرا انگ انگ جل گیا ہے۔ مگر ابھی وہ کہہ رہی تھی نہ پاپا تھا کہ عمارہ نے جلدی سے جھک کر اس کے پیر پکڑ لیے اور روتے ہوئے گڑ گڑائی۔

”اے شریف تاجر! میں تیری شرافت کی محض ہوں۔ تیری عظمت اور کردار کی بلندی کی قائل ہوں۔ وہ لڑکی یقیناً خوش نصیب ہوگی جسے تیری رفاقت نصیب ہوگی کیونکہ میں اتنی مدت تیرے ساتھ رہی ہوں کہ کوئی ایسی بات نہ کی جو میرے لیے دکھ کا سبب بنی۔ مجھے تم پر کامل بھروسہ ہے اور اب گزارش کرتی ہوں کہ مجھ پر ایک آخری احسان اور کرو۔“

عقبہ غور سے اسے دیکھتا رہا اور وہ اسی انداز میں بولتی گئی۔

”میری! سمجھا ہے کہ مجھے میرے سابقہ مالک عبد اللہ بن جعفر کے پاس پہنچاؤ، وہ بخوشی مجھے رکھ لے گا اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ تیری اشرفیاں اور مال تجھے واپس دلا دوں گی۔“ عقبہ نے پھر اپنی آکھوں سے اسے دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے ہر طرف اندیرا اور سناٹا چھایا ہوا ہے مگر اس نے خود کو سنہالا۔ ہر لمحہ اس کے دل میں ہوک سی اٹھ رہی تھی۔ اس نے اپنے قدموں میں ٹیڈیہ ہوئی اس حسین لڑکی کو ہاتھ مارا اٹھایا جو اس کی متاع حیات تھی اور دھیرے سے بولا۔

”عمارہ! کیا تم واقعی عبد اللہ بن جعفر کے پاس واپس جانا چاہتی ہو؟“

”ہاں۔“ عمارہ نے پر امید نظروں سے اسے دیکھا اور اس کے بازو کا سہارا لے کر کھڑی ہوتے ہوئے کہتی۔ ”تم مجھے مدینہ منورہ پہنچاؤ، میں عبد اللہ بن جعفر کے پاس واپس جانا چاہتی ہوں۔“

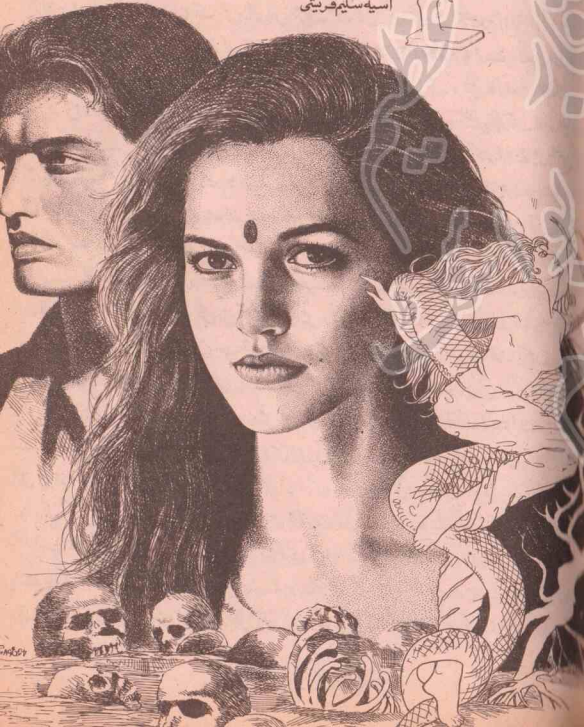
”مگر کیوں؟“ عقبہ نے آخری سہارا لیا۔ ”تم اسی کے پاس کیوں جانا چاہتی ہو؟“

”کیونکہ وہ پہلا مرد ہے جو میری زندگی میں آیا تھا۔“ عمارہ نے آہستہ سے کہا۔ ”اور تم نہیں جانتے کہ حضرت خواہ لوندی ہو یا بیوی اس کی زندگی میں جو پہلا مرد آتا ہے وہ اسی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیتی ہے۔ میں عبد اللہ بن جعفر کی کو اپنا سب کچھ سمجھتی ہوں اور اس سے محبت کرتی ہوں لہذا تم مجھے اسی کے پاس پہنچاؤ۔“ اس لمبے عمارہ سمجھ نہ سکی کہ عقبہ نے کیوں دروازہ تمام کیا۔ عقبہ کی حالت عجیب تھی۔ اسے درو

مصلوب فنا

چہاد ایک معصوم اور پاکیزہ لڑکے کی گواہی دینے والا یسوع مسیح کے سرکاری شاہ تھا
مسیحی بپتسمیوں کے لیے دوشیزہ کی طرف دیکھا اور بچہ اپنا نیت

آسیہ سلیم قریشی



دیوار گرتے محسوس ہو رہے تھے چند لمبے وہ بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل ڈوب رہا ہے۔ روح گھائل ہو رہی ہے اور اب اس میں زندگی کی کوئی رقیق نہیں رہی۔

صبح کا وقت تھا، عبداللہ بن جعفر کی مخصوص نشست گاہ میں مدینہ طیبہ کے بیشتر معززین بھی برائمان تھے اور عبداللہ بن جعفر، عمارہ کی داستان حیرت سے سن رہا تھا۔ عمارہ اشکوں اور آنسوؤں کے درمیان اسے تمام واقعات نہایت تفصیل سے سناری تھی۔ حاضرین محفل گویا گوش بر آواز اور دم بخود تھے۔ یہ سب سننے کے بعد عبداللہ بن جعفر نے بڑی عقیدت سے عقبہ بن کسید کی طرف دیکھا اور بچہ اپنا نیت بھرے لہجے میں بولا۔

”عمارہ! سچ تو یہ ہے کہ تمہیں فروخت کرنے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ تمہارے بغیر زندگی کتنی بے رنگ و بے کیف ہے اور ہم سوچ رہے تھے کہ کسی بھی طرح اور کسی بھی قیمت پر تمہیں واپس لے کر آئیں گے۔“ اپنے سابقہ آقا کے منہ سے اعتراف محبت سن کر عمارہ جیسے خوشی سے پاگل ہو گئی وہ بے اختیارانہ طور پر اپنے آقا کے سینے سے پلٹ گئی۔ اس لمبے عقبہ کی حالت عجیب تھی مگر اس نے یہ منظر بھی بڑے تحمل سے دیکھا اور مردہ قدموں سے باہر جانے لگا تو عبداللہ بن جعفر نے قدم سے بلند آواز میں کہا۔
”مُحَمَّدُ تَا بِرَ اِیْنِی دَس ہزارا شریفان اور مال تو تیلے جاؤ ویسے ہم زندگی بھر تمہارے شکر گزار رہیں گے۔ واقعی تم نے نہایت ایمانداری، شرافت اور اعلا خلق کا ثبوت دیا ہے۔“

عقبہ کے قدم تورک گئے تھے مگر اس نے انہارن موڑے بغیر ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔
”وہ میری طرف سے عمارہ کو دے دینا۔“ پھر وہ تیز قدموں سے مکان کے باہر آکر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور گھوڑے کو ایزنا کر اس کی رفتار تیز کر دی جیسے جلد از جلد میاں سے دوڑ چلا جانا چاہتا ہو۔ لیکن چند ہی گز دور جانے کے بعد عقبہ نے اچانک باگیں چھوڑ کر بے تابی سے اپنا دل تمام لیا پھر اس کا سر آہستہ آہستہ گھوڑے کی گردن پر جھٹکا گیا اور جب تک لوگ اس کے قریب پہنچے وہ گھوڑے سے زمین پر آ رہا۔

شام کے سائے پھیل کر سیاہی اپنا رہے تھے۔ سورج کی الواہر کستی ہوئی کریمیں روشنی کھوٹی جارہی تھیں اور قبرستان کے ایک پر سکون گوشے میں عبداللہ بن جعفر اپنے دوست، اصحاب اور شہر کے معززین کی موجودگی میں اس نوجوان کو سپرد خاک کر رہا تھا جو شرافت، ایثار اور وفاداری کا انمول پیکر تھا اور عبداللہ بن جعفر کے قلعہ نما مکان کے ایک کمرے میں فرش پر بیٹھی ہوئی عمارہ زار و قطار روئے جارہی تھی۔

بات کچھ ایسی غیر معمولی اور انمولی بھی نہ تھی دنیا میں تو آئے دن ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ ایسے حادثے جنم لیتے رہتے ہیں۔ لیکن چند حادثے ایسے بھی ہوتے ہیں جو زیادہ بڑے اچھا دل جاتے ہیں اور یہ خاص دعا کی زبان پر آجاتے ہیں۔ لوگ اس قصے کو مختلف انداز سے زیر بحث لاتے اور اتنا چہ چاکر ہیں کہ ڈنکا ساٹ جاتا ہے۔۔۔ اسی طرح کا ایک حادثہ فادر جیکب کے مختصر کے قیامت بن کر ٹوٹا تھا۔ فادر جیکب مفتی کمزور سپاوردی تھا جو چرچ میں آنے والے ہر زن و مرد کو شرافت اور سچائی کا درس دیتا تھا۔ جس کے پاس شریف گناہ گار۔۔۔ جرائم پیشہ، معصوم، زانی اور بد معاشرے آکر اپنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے، اپنی لغزشیں کنفیس CONFESS کرتے تھے۔۔۔ اور فادر جیکب جیسا کمزور انسان ان کے ہاتھ تمام تمام کراہیں تسلی دیتا۔ انھیں توبہ دینا کا ارادہ بتلاتا۔۔۔ یسوع مسیح JESUS CHRIST کے فرمان سناتا اور برائی کو ترک کرنے کی تلقین کرتا۔ فادر جیکب کے سامنے بڑے بڑے سورا۔۔۔ قاتل اور ڈاکو سر جھکا کے کاتپتے ہوئے اعتراف گناہ کرتے۔۔۔ غمخیز چین اور دل کا بوجھ فادر کے سامنے بٹھا کرتے۔۔۔ اور فادر ایک ملوکاتی سی نرم مسکراہٹ چہرے پر سجالتے ان کا ہاتھ تھپک تھپک کر تسلی دیتا۔ اللہ کے رحیم و کرم ہونے کی توبہ دیتا۔۔۔ ایک عجم تو ایسے ہم ہوتے تھے جو فادر کی محبت سے بھرپور گفتگو سن کر ہی اپنا پرانا دھندلا چھوڑ کر نیکی اور شرافت کی زندگی گزارنے لگے تھے۔۔۔ کئی تو فادر کے سامنے کنفیس کرتے ہوئے بے اختیار پکچلیاں لے لے کر رو رہے اور فادر بڑے سے بڑے راز کو بھی دل کی گہرائیوں میں دفن کر لیتا تھا۔ سارے پانچ فٹ لمبا دیوتا پتا۔۔۔ فادر جیکب جس کا دنیا میں آنے کا واحد مقصد ہی اپنے ”یسوع“ کی محبت کے گن گنا تھا۔۔۔ صبح سے شام تک اپنے خوبصورت تعمیر شدہ چرچ میں رہتا تھا۔ کو وہ ضرورت مند اور دیکھی بیمار لوگوں کی خبر گیری اور دیکھ بھال میں وقت گزارتا رفاہ عامہ کے کاموں میں اس تن دہی سے مصروف رہتا تھا کہ اسے اپنے چھوٹے سے گھر کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔۔۔ وہ گھر جس میں اس کی سیدھی ساوی نیک بیوی ٹیڈا پچیس سال سے اس کی خدمت کرنے میں مصروف تھی۔۔۔ حسین ٹیڈا جس نے اپنی جوانی کے دن جیکب کے انتظار میں بے رنگ گزار دیے تھے، سرشام جیکب کی واپسی کا انتظار کرتی۔۔۔ وہ رات گئے گھر پہنچتا۔۔۔ اور نرم سی مسکراہٹ بکھیرے معذرت کرتا۔۔۔ ”معاف کرنا ٹیڈی، مسز ابراہم بہت بیمار تھیں میں ان کے پاس دعا پڑھنے چلا گیا تھا۔“ اور کھانا دوسری بار گرم کرتے ہوئے ٹیڈی کھتی تھی مسکراہٹ چہرے پر سجاکر رہا دیتی۔۔۔ بے زبان خاموش سی ٹیڈی نے کبھی شکوہ نہیں کیا بس اپنی انگلیوں کو دفن کر کے اپنی اکلیٹی بینی

کی رات میں خود کو گم کر دیا۔۔۔ وہ تو اس وقت بھی جیکب سے کوئی شکوہ نہیں کر سکتی جسب وہ سینٹ SAINT MARY جیسے بڑے اسکول کی ہیڈ ماسٹر سے استعفیٰ دے کر آیا تھا اور پارڈی بننے کا ہار لیا تھا۔۔۔ پھر ”لین“ جیسے بڑے شہر کی سکونت چھوڑ کر ”پارک“ جیسے بخر پھاڑی علاقے میں جا کر رہا تھا۔۔۔

اس سال لیزا۔۔۔ اپنی تمام تر بچن کیونٹی COMMUNITY کی بلا شبہ حسین ترین لڑکی تھی۔۔۔ شہر میں اسل سفید رنگ نیکیوں آنکھیں جن پر گھٹی گھٹی پکلوں کا سایہ تھا حسین چھوٹی سی ناک۔۔۔ ہاتھوں جیسے بھرے بھرے گھائی ہونے جن کی معمولی سی لرزش جوان دلوں میں سوسوٹنے لگتی تھی اور اس کے سر پر براؤنش بالے جھنم دیکھنے ہی مردان کی گھٹی چھاؤں میں پناہ کی بات کرنے لگتے تھے۔

لیزا۔۔۔ وہ تو پھر کے بت کی مانند تھی جس پر سرود گرم جذبات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ یہ نہیں کہ حسن اور کافر جوانی کے فتنوں سے بے خبر تھی۔۔۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ اس کے سراپے میں ایسا ہے جو جنس مخالف کو گھائل کر دیتا ہے اور وہ پکلوں کی جنبش سے ہی انھیں اپنا شیدائی بنا سکتی ہے۔۔۔ اور اب اس بات کا تجربہ بھی ہوا تھا۔۔۔ وہ اگر پارٹیوں میں جاتی تو۔۔۔ وہاں موجود لڑکیاں جو قیمتی لباس و زیورات پہنے فل میک اپ کیے چاند کی مانند جگمگا رہی ہوتی اور نظروں کا مرکز بن کر ان کے دلوں پر بجلیاں گرا رہی ہوتی تھیں۔۔۔ ”لیزا“ کے محفل میں بیٹھتے ہی ان کی چمک و مک مانند پڑھ لگتا جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند توباب ابھرا ہے۔۔۔ حالانکہ وہ ہمیشہ سادا اور معمولی لباس پہنتی۔۔۔ نہ زیورات نہ میک اپ پھر بھی اس کے شفاف چہرے کی بابرنگی لوگوں کو اپنی طرف کھینچ دیتی۔۔۔ دیکھی دیکھی مسکراہٹ چہرے پر بجائے انتہائی خاموشی سے محفل میں چپچتی تھی لیکن چند منٹوں کے بعد ایک دم خاموشی چھا جاتی۔

لیزا۔۔۔ ”ہیلو لیزا۔۔۔ ہیلو آئی۔۔۔“ لوگ قریب سمٹ آتے۔۔۔

”ایلی فادر نہیں آئے؟“ میریان پوچھتا

ایلی سن NO MYSON وہ مسٹر ہنجر کے ہاں دعا کرنے گئے تھے وہاں سے جلدی فارغ ہو گئے تو وہاں آجائیں گے۔۔۔“ آئی ٹیڈا وہی پرانا جواب دیتی وہی اپنے ہم عمر لوگوں کے گروپ کی طرف اشارہ کرتی اور لیزا وہیں صوفے پر ٹپک جاتی، لڑکے اس کے گرد اکٹھا ہو جاتے

”لیزا“ آج تو تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔۔۔“ پیٹر تعریف کرتا۔۔۔

”ہاں واقعی آفت لگ رہی ہو۔“ دوسرا لڑکا تائید کرتا تو ایک شفق سی لیزا کے چہرے پر بکھر گئی۔

”اے یار یہ کب کی صورت نہیں لکھیں۔ جیسی قیامت کو قیامت ہی کہا جائے گا.....؟“ آٹھ بار

افراد پر مشتمل چھوٹی سی عیسائیوں کی ہستی کے سب سے زیادہ دولت مند سرانھوئی کا نوجوان عیاش

فلپ ہاتھ میں جام لے جھٹ وہاں پہنچ جاتا۔ اسے دیکھتے ہی لیزا کے گرد کھڑے لڑکوں کا منہ بن جاتا۔

فلپ برسوں سے لیزا کا طلب گار تھا اور ممکن نامکن اور جائزہ ناجائز طریقے سے اسے اپنانا چاہتا تھا۔

اس نے بار بار دوسری بے شمار لڑکیوں پر آزمائے ہوئے جھکنڈے لیزا پر آزمائے کی کوشش کی، سُنرے جا

چکے لیکن وہ بیخوشی نکلی۔ فلپ اس کے لیے بہانے بہانے سے جیتی تھکے لے کر آتا لیکن لیزا نرم اور ضام

یاجات سے وہ تھکے واپس کر دیتی اور وہ احتجاج کرتا رہ جاتا۔

”اے لیزا یہ بہت قیمتی لباس ہے میں نے خاص تمہارے لیے پیسے سے منگوایا ہے اسے پہن کر تو

شرابی لگو گی۔“

ادھ ہوتے ہیں اور یہی حال مارک اور فلپ کا تھا۔ دونوں رقب ایک دوسرے سے سخت متفرق تھے۔
 فالت تو لیزا کو بڑی حیرت ہوتی تھی جب وہ مارک جیسے ٹھنڈے مزاج کے انسان کو ایک دم بھڑکتا
 اچانک روزانہ یہاں کیوں آتا ہے....؟ میں تمہیں آگاہ کروں کہ وہ بہت عیاش اور شیطانی
 مالک ہے۔ وہ تمہیں نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ تم اس سے دور دور رہو۔“
 کو کلیک بند کر کے سیدھا لیزا کے گھر پہنچ جاتا تھا مارک کی کامی آواز سنتے ہی پہلے سے موجود
 ہے وہاں سے کھٹک جاتا۔

یہ قلب تمہیں دیکھنے ہی عیاں کیوں جاتا ہے؟“ وہ حیران رہ جاتی۔
 ظاہریات سے فرشتے کو کیجے شیطان عتاب ہو گا ہی دراصل وہ میرا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے
 اس کے اس کرۂوت جاتا ہوں۔ میں نے بار بار اسے رکتے ہاتھوں پکڑا ہے ایک دو بار تو وہ میرے
 پیٹے پہنچتا ہے۔ دل چاہتا ہے گولی مار دوں اس کینہ بد معاش کو“

ہمارے چارے فلپ نے ایسا کون سا جرم کیا ہے جو تم اس کی جان کے دشمن ہو رہے ہو۔ کسی کو معمولی سی تکلیف دینا بھی تم پر اگناہ ہے اور تم ہو کہ جان لینے کی بات کر رہے ہو۔ وہ اتنا برا نہیں ہو سکتا۔ لیزا دھوکے سے کہتی

..... برا نہیں ہو سکتا اور میں کہتا ہوں کہ شیطان بھی سنور سکتا ہے لیکن قلب بہت ذلیل اور ناپاکیوں سے لبریز ہے..... وہ نفرت سے کہتا تو لبرائے کے چہرے پر ہول ماری ہو جاتا۔

میں چاہتا ہوں کہ میں تمہیں یا کسی کو یہ راز بتاؤں لیکن..... میں خود بہت پریشان ہوں
چاہتا ہوں کہ کسی کو اس راز میں شریک کر کے اس سے مشورہ لوں..... لیزا! قلب بڑا
مستعد ہے اس نے کئی لڑکیوں کی عزت داغ دار کر دی ہے۔ میں تین سال سے یہاں پر ٹیکس کر
اور میرے پاس کئی لڑکیاں روتی چٹیں آچکی ہیں جو کہ قلب کے بچے کی ماں بننے والی ہوتی ہے، یہ
میں دولت سے رجحان کر شادی کا جھانہ دے کر چھانٹ لیتا اور انھیں برباد کر کے دھکا دیتا
کی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس تین چار لڑکیاں تو ایسی بھی آتی تھیں جن سے تم اور میں بخوبی
دوست اچھی اور نیک لڑکیاں تھی پتا نہیں اس کینے کے چنگل میں کیسے جا چئیں..... میں
دشمنوں میں جلا دیکھ کر توبہ اٹھتا ہوں اب تم یہ بتاؤ لیزا سب کچھ جانتے ہوئے بھی قلب کو

کیسے پسند کر سکتا ہوں؟

”اور... پھر... تم... کیا تم ان لڑکیوں کی مدد کرتے ہو مارک؟“ لیزا کا چہرہ دکھ سے بیلا پڑ گیا۔
 ”ہاں لیزا... میں ان لڑکیوں کی حالت نہیں دیکھ سکتا... وہ اگر ہاتھ جوڑتی ہیں پاؤں پکڑتی ہیں
 گڑبڑاتی ہیں... پھر میں مجبوراً وہ سب کر گزارتا ہوں جو میرے پیشے کے معنی ہیں“ مارک نے سر قہقارہ
 ”لیکن مارک... یہ... گناہ ہے... قتل ہے اس ننھی سی جان کا کیا قصور تھے تم اس دنیا میں آنکھ
 سے پہلے کاٹ بیٹھتے ہو۔“

”لیزا! وہ لڑکیاں جس طرح میرے پاس آکر روتی گڑبڑاتی ہیں، خود کشی کی کوششیں کرتی ہیں۔
 دہل جاتا ہوں پھر اس وقت کھنٹی گونے لگتا... گناہ نہیں لگتا... میں ان بد بخت لڑکیوں کو بدنامی کے لیے
 نجات دلا دیتا ہوں۔“ لیزا... اگر اس وقت میری جگہ تم ہو تو تم بھی وہی کچھ کر گزرتیں
 لاچار ہوئے بس ہو کر کرتا ہوں۔“ مارک نے کہا۔

”لیکن مارک اگر فلپ اتنا برا ہے اور پھر تمہاری بہن ایشیا تو اسے بے حد پسند کرتی ہے اور وہ
 اپنا رقیب سمجھ کر مجھ سے شدید نفرت کرتی ہے۔“ لیزا کا رنگ زرد پڑ گیا۔

”دماغ خراب ہے اس پاگل لڑکی کا! میں اسے کتنی بار سمجھا چکا ہوں کہ یا آ جاؤ لیکن وہ ضدی
 نہیں اور یہ سب مٹی ڈیڑی کا قصور ہے۔ انھوں نے ایشیا کو موت ڈھیل دے رکھی ہے... تمہارا
 ہاں سے نکلنے ہی فلپ میرے گھر کا رخ کرتا اور ایشیا کو ساتھ لے کر چلا جاتا ہے اور دونوں آدھی
 رات کے بعد واپس آتے ہیں۔ لیزا میرا دل تو اپنی بہن کے انجام پر کانٹا رہتا ہے۔ میں نے مٹی و
 کتنی بار سمجھایا ہے کہ وہ ایشیا کو اس سمیٹے سے دور رکھیں، لیکن وہ مجھے ڈانٹ دیتی ہیں۔ ڈیڑی کہتی
 اگر فلپ ایشیا کو پسند کر لے تو یہ ان کی خوش قسمتی ہوگی، اتنا دولت مند آدمی تو پوری بہن میں اس
 شان و شوکت بڑھ جائے گی... پتہ نہیں ہے والدین ہر داماد کو دولت کے پیمانے پر کیوں ناچتے ہیں، اس
 دوسری خوبیاں کیوں نہیں دیکھتے؟ شرافت، قابلیت جیسی خوبیاں تو دولت کے ڈھیر کے سامنے بے معنی
 رہ جاتی ہیں۔“ وہ دھک سے بولا

”مارک! اب دنیا میں شرافت تو رہی نہیں... اس لیے لڑکی کے والدین دولت مند داماد کو ڈھونڈ
 ہیں تاکہ بیٹی دھنسی کھٹے توکے“ آنٹی ٹریسا نے گزرتے گزرتے کہا۔

”تم ان مٹی! خدا بھی اپنے بندوں سے اتنا مایوس نہیں ہوا ہے... اگر دنیا میں برے لوگ
 اچھوں کی بھی کمی نہیں مارک ہی کی مثال لیجیے یہ بھی تو خوبصورت اور برسرِ روزگار ہے پھر کیوں نہیں

اس اتنی بات ہے کچھ لوگوں کے دل و دماغ شیطانی کی آمادہ چگاہ بن گئے ہیں۔ انسان شیطان کے
 لیے بس ہو گئے ہیں اور بے راہ روی، مگر اس وجہی کے راستے پر چل نکلے ہیں۔ میں یہ نہیں ماننی
 گناہ کر کے بچتاتے بھی نہیں ہوں۔“ لیزا نے یقین سے کہا۔

”تمہارا بس چلے تو شیطان کی برائیوں کو اچھائیاں ثابت کرنے پر تل جاؤ گی۔“ مارک ہنس دیا۔
 ”مارک... یہ بھی سچ ہے کہ اگر شیطان ہمارے دل میں دوسرے نہ ڈالتا، میں گمراہ نہ کرتا پھر ہم
 دوسرے صبح کے وجود کے قائل کیسے ہوتے... شیطان کی برائیاں، شرائیکتریاں ہی ہمیں نیکی اور
 نیکی کی پہچان کرواتا ہیں، ہم صبح کی کھوج میں اور زیادہ بے قرار ہو کر قریب ہوتے جاتے ہیں۔“ وہ
 ”جو ذکر آنکھیں موند کر جواب دیتی تو اس کے چہرے کے گرد نور کا ہالہ... سسائیں جاتا... مارک
 اس کے چہرے کا چھوٹا تو وہ میرے آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگتی... مارک کا وجود راز
 الٹا... مجھ کو دور ہٹ کر بیٹھ جاتا۔“

”تم اب تک میرے گھر کا استحقاق لوگی؟“ اس کی آواز جذبات سے بوجھل ہو جاتی
 مارک جلیز مارک... مت پوچھا کچھ ہے یہ بات... تمہیں مایوس کن جواب دینے ہوئے مجھے
 اسے میں تمہیں غم دینا نہیں چاہتی ویسے میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر مجھے شادی کرنی ہوتی تو وہ
 سب تم ہوئے تم... وہ گھنٹوں کے بل جبکہ کر اس کا ہاتھ تمام کھالو۔

”لیزا... لیزا... یہ دنیا بہت ظالم ہے قدم قدم پر دھوکے اور مکر و فریب ہیں تم بھیرے سارے کے ایک
 میں چل پاؤ گی۔“ وہ سمجھاتا
 ”مارک دھوکے بھی ہیں اور فریب بھی۔ اسی لیے تو میں ان دھنوی باتوں سے کنارہ کرتا چاہتی
 لیزا نے سرگوشی کی

”امکن ہے لیزا! انسان کے جسم کے بھی کچھ فطری تقاضے ہوتے ہیں۔ تم ان پر کیسے بند باندھ دو گی؟“
 میں چوبیس سال کی ہو چکی ہوں مارک! تم کیا سمجھتے ہو کہ ان فطری جذبوں سے ایک بار بھی سر نہیں
 ہو گا؟ میں یا بار ایسے مراحل سے گزری ہوں جب کہ میں ہمک سکتی اور تباہ ہو سکتی تھی... لیکن
 میرے پاس ایک ایسی طاقت ہے... جو مجھے گمراہ ہونے سے بچا لیتی ہے۔ میں ہمیشہ برے اور کٹھن
 میں ایک چہرے، ایک عظیم وجود کا قصور باندھ لیتی ہوں... پھر وہ سرکش آنٹی جی کے قدم توڑ دیتے ہیں
 کہتے قدم ساکت ہو جاتے ہیں۔ گناہ کا لحد آئے بغیر مل جاتا ہے۔“ لیزا کی آنکھیں یوں بند
 ایسے وہ اس عظیم وجود کے سامنے جا چکی ہو، مارک کا دل دھڑکا اٹھا۔

”کون... کون ہے وہ مستی؟“ اس نے پوچھا

”وہی جو ہمارے لیے ہی نہیں، دنیا کے ہر مذہب کے پیروکاروں کے لئے عظیم اور قابل احترام ہمارے جبرسکر اسٹ JESUS CHRIST ہاں مارک میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں کانویں چلی جاؤں گی نہ NUN“ بن جاؤں گی.....“ وہ معصم ارادے سے بولی

”لیزا!“ مارک دہل گیا.... اگر بات فلپ یا کسی دوسرے رقب کی ہوتی تو شاید وہ لیزا کو اپنانے کی جان کی بازی لگاتا۔ ان سے ڈبل DUEL تک لڑتا۔ لیکن یہاں تو رقب ہی ”عیسائی تھاہیں“ مارک بھلا اس سے کیسے لڑا؟۔ لیزا وہ حسین و جمیل لیزا دنیا چھو کر نہ بن جانا چاہتی ہے؟۔ یہ پہلے مارک کو بے پناہ صدمہ پہنچا۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اس کا دل نرم و گرم جذبات سے لگا ہوں سے عقیدت بھانکتے لگی۔ اس نے پیار سے لیزا کو کندھوں سے پکڑ کر سینے سے لگا لیا اور چوی چپے وہ لیزا کی نہیں عیسائی پیشانی چوم رہا ہو۔

”تم عظیم ہو لیزا!“ اس نے پیار سے کہا تو لیزا اسے پر غم آنکھوں سے دیکھتی رہی.... مارک عادت، عیسائی خوبی لیزا کو بہت پسند تھی کہ وہ فوراً ”دی دوسروں کے جذبات سمجھ لیتا اور زبردستی نہیں“ لیزا کیا تم نے یہ فیصلہ آئنی نرسا سے پوچھ کے کیا ہے؟ انکل تو ظاہر ہے تمہارے فیصلے کا خیر کریں گے لیکن آئی؟“

”مارک ایسے فیصلے کسی سے پوچھ کر نہیں کیے جاتے.... یہ فیصلے دل کے فیصلے ہوتے ہیں جو کسی کسی اعتراض کے متحمل نہیں ہو سکتے.... ہاں پہانے تو میری بات سنتے ہی طے لگا لیا کہ میری نے روا کر دینا.... خیر رفتہ رفتہ وہ بھی دل مضبوط کر لیں گی۔ وہ جانتی ہیں کہ میں منتقل مزاج ہوں.... کالونیٹ والوں کو لکھ بھی دیا ہے پتہ نہیں جواب کب آئے گا.... لیزا کھوئے ہوئے انداز سے ہر کمرے میں نصب بڑی سی صلیب کے سامنے جا کھڑی ہوتی اور اس پر مصلوب عیسائی کو المانہ انداز دیکھتے دیکھتے ٹھنٹوں کے بل جھک گئی.... مارک ٹھنڈی سانس لے کر کھڑا ہو گیا.....

ہر اتوار کو لیزا چرچ میں پاناوبجا کر مذہبی گیت گایا کرتی تھی.... وہ پاناوبجانے میں کافی ماہر ہو گئی فلپ کئی دنوں سے بھند تھا کہ لیزا روزانہ ان کے گھر آکر اس کی چھوٹی بہن رینا کو پاناو سکھادے ہاں مولی سے کام لے رہی تھی جانے کیوں اس کا دل آٹا ہوا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اس پر فلپ نے آزماتے ہوئے ٹریڈا آئنی کا سارا لیا۔

”لیزا اس میں حرج ہی کیا ہے صبح تو تم چرچ میں مصروف رہتی ہو، شام کو کسی وقت رینا کو سبق

ہمارے والد صاحب کی تنخواہ کم ہے اسی بہانے کچھ فائو رقم چینی تو تم نے لباس بوا لیتا۔“ لیزا اس پر سرشام وہ دو گھنٹے کے لئے اپنی سائیکل پر فلپ کے گھر جاتی لیکن اسے یہ دیکھ کر بڑی کوفت لگی کہ رینا سے زیادہ فلپ سبق کیسے میں دلچسپی رہا تھا بلکہ پاناو کم اور لیزا کی ذات میں زیادہ دلچسپی جاری تھی۔ رینا تو پانچ دس منٹ سروں پر ہاتھ مار کر ہاں سے غائب ہو جاتی لیکن فلپ وہیں تھائی کی تو بات ہی الگ ہے جب کہ وہ اس قدر دھیٹ تھا کہ رینا کے سامنے ہی عشقیہ گفتگو کرتا تھا اور بے چاری لیزا کھائی ہوئے لنگی تھی

میں الگے مینے سے پاناو کھانے نہیں آؤں گی۔“ ایک دن لیزا نے مضبوط لمبے میں کہا ”اے! دوسرا چھل گیا“ کیا تنخواہ زیادہ چاہیے؟ ٹھیک ہے پانچ سو سے ہزار روپے کر دیں گے۔“ رینا کی بات نہیں میں نے محسوس کیا ہے کہ رینا کو پاناو کیسے سے بالکل دلچسپی نہیں ہے بلکہ میں تو اس کی اگر تم مجھ سے ذرا دلچسپی لیتا کم کر دو تو رات اچھے شکر ثابت ہو سکتے ہو۔“

اگر تمہیں اندازا ہے، احساس ہے کہ میں تم میں دلچسپی لیتا ہوں تو پھر مجھے کیوں تڑپا اور ترسا میری محبت کا جواب بے رخی سے کیوں دیتی ہو؟ فلپ نے اس کے بازو پکڑ لیے

”لیزا! مجھے پھوڑ دو اور میری بات غور سے سنو.... میں کسی بھی صورت میں تم سے جسمانی یا عشق سے بے نیاز نہیں ہوں، میں کسی سے عشق کرتی ہوں اسے بے پناہ چاہتی ہوں چھپن سے اب تک میں نے اس کے پنپے دیکھے ہیں اور میرا جسم، میری روح صرف اسی کی ہے۔“

”مارک ہو گا.... لیکن لیزا میں اس سے شکست نہیں کھاؤں گا.... اسے سچ دکھا کر یا راستہ میں لگا دوں گا۔“ اس نے لیزا کو بھیج دیا

لیزا کی باتیں مت کر فلپ، میں مارک کی بات نہیں کر رہی بلکہ اس دنیا میں بسنے والے کسی بھی شخص میں فرشتے سے رشتہ جوڑنے کا ارادہ ہے؟“ اس نے طفر کیا۔

”انسان سے تو افضل نہیں ہیں فلپ.... لیکن تم کیا سمجھو.... میں رامیہ بن رہی ہوں کالونیٹ جارہی ہوں....“ لیزا نے کہا تو فلپ شدید رہ گیا

”تمہارا مطلب ہے کہ تم دنیا تیاگ رہی ہو؟“

”لیزا! تم ایک پھر پھر نوجوان اور خوبصورت عورت ہو تمام عمر کواری کیسے رہو گی وہ بے

جان محمد تمہارے جذبات کی کیا قدر کرے گا کیسے تمہارے سگتے تن کو سیراب کرے گا..... (۱۱)

بے جان بت ہے جسے تم جس جگہ چاہو رکھ دو۔“

”فلپ!“ لیزا کی آواز زندہ ہو گئی۔ ”حق لو کہ میں جسم اور ہونوں کی سیرابی میں چاہتی ہوں بلکہ
منٹوں کے حیوانی جذبات کی نہیں۔ تیرا رہنے والے جذبات کی بات کر رہی ہوں۔۔۔ تم کفر کے گلاب
سے نہ نکالو۔ کھلو تو ہم اس کے ہاتھوں میں۔ وہ اتنی قدرت والا ہے کہ ہم سے کھیل کر ٹھوکر
توڑ موڑ کر پھینک سکا ہے اسے اتنا بے بس مت سمجھو۔۔۔ اس کے ہاتھ میں ہماری زندگی ہے۔ ظاہر
کرتے ہو وہ ایک بے جان مجسمہ ہے“ اور نہ ”تم پاگل ہے خیر انسان کیا جانو کہ روزانہ صبح جب میں
کر اپنے ہاتھوں سے یسوع کے مجسمے کو آہستہ آہستہ صاف کرتی ہوں تو اس وقت اس وجود کا ایک
تھوڑا سا نورانی شعور ہوتا ہے اس کے سین چہرے پر، مجھے دیکھ کر ایک حسین مسکراہٹ بکیر جا
انکھوں سے محبت و شفقت جھانکنے لگتی ہے۔۔۔ تب میں بے خود ہو کر اسے سختی ہوئی اس کے پاؤں
بٹھ جاتی ہوں۔۔۔“ وہ عقیدت سے بولی۔

”وہ! وہ لکڑی کی تختی پر گزرا ہوا عیسیٰ حسن کی کیا قدر کرے گا... بے وقوف لوکی اپنی جواں
سنت کھوے۔ ہم تمہارے عاشق ہیں تمہارے ناز اٹھانے کے لیے ترس رہے ہیں... آؤ ہماری
نہت کے مزے چکھو۔ تم ابھی ان جڑیوں کی لذت سے نا آشنا ہو... آؤ میں تمہیں زندگی کی سب
نئی حقیقت سے روشناس کرا دوں۔ پھر تم... دیکھنا کہ تم دنیا چھوٹنے کا خیال کیسے بدل دوں گا میں نہیں
بل۔“ وہ بے قابو ہو کر آگے بڑھا

”ہوش میں آؤ فلپ ورنہ اچھا نہیں ہوگا؟“ وہ سہم کر پیچھے ہٹنے لگی لیکن فلپ کے وجود پر ہوس
میل چکا تھا۔ وہ خشک و ہنٹول پر زبان پھیرتا مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ لیزا پر گھبراہٹ سی طاری ہوئی
”فلپ... رک جاؤ تمہیں مقدس مریم کی قسم...“ وہ چیخی۔

”لیز ازم مجھے اپنے بھائی اور مریم کی قسمیں مت دو کیونکہ نہ تو میں خدا کے وجود پر یقین رکھتا ہوں، نہ جج جج جج میں تو پادری کے گھر بھی صرف تمہاری وجہ سے جاتا ہوں۔۔۔۔۔ ورنہ مجھے تو ان سیاہ و دوں میں لپٹے ہوئے پادریوں سے شدید نفرت ہے۔ جو ہر وقت موقع بہ موقع نیکی اور شرافت کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔“

وہ دیوار سے لگ کر وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔

”اب پھنس گئی میری حسین قتلی؟“ وہ قریب ہو کر الومانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

الہ! شیطان کو خود پر غالب نہ ہونے دو اور خدا کے واسطے مجھے جانے دو" اس نے ہاتھ جوڑتے

ہری جان خواہ، خواہ گھبرا رہی ہو۔ ویسے پہلے سب لڑکیاں روتی اور گھبراتی ہیں۔۔۔ ایک بار باؤلوں میں سمٹ جاؤ پھر تھوڑے جاتے کی بجھی خواہش نہیں کر دو گی۔“ اس نے لیزا کو کندھوں سے اترے دیکھنا تو وہ اس کے سینے سے بری طرح کھرا گئی۔ اس کی کمرہ ہنسی کرے میں کو گئی۔ اس کی ہنسنے کی صورت پر ہنسبک دیا وہ جیتی چلائی رہی۔

پہا۔ اچھا گہرائی کیوں ہوئی تھی مجا دیتا ہوں۔" وہ سچ کے نشے میں سرسرا صوفے سے اٹھا اور
اکیپ بجھانے کی کوشش کی، ساتھ ہی اس کے منہ سے بھانج، سچ نکلی اور وہ ایک جھٹکے سے
اچھے دیوار سے ٹکرا پایا اس نے زیرت سے آنکھیں پھاڑ کر لڑائی طرف دیکھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا
ہے ہوش ہو کر زمین پر گر گیا لپ کے تار سے جگا ریاں اور پناٹے چھوٹ رہے تھے لڑا پھٹی پھٹی
سے بھی غلب اور بھی لپ کو دیکھتی رہی، پھر اس پر حقیقت آشکار ہو گئی۔

مقدس جس..... اور مقدس مریم... آپ کا لاکھ بار شکر ہے کہ آپ نے اپنے چاہنے والوں کو مصیبت میں جھجھوڑا میری آہوں کی حفاظت کی۔ "وہ منہ ڈھانپ کر سسکتے تھے..... اس پر خوف طاری کا بخودہ ایک دم اشی اور تیزی سے باہر بھاگ گئی۔ اس کا دل دکھ سے بھرا ہوا تھا وہ تیزی سے چلائی جہج پختی۔ شام کے گھبرے سائے پھیل چکے تھے۔ وہ روتی سکتی دوڑتی ہوئی اندر آئی۔

اے پر رک کر دیکھئے گئی کہ نادر جبک موم بتیاں جلا کر چرچ کے احاطے میں بنے ہوئے اپنے
گھر جا چکا تھا۔ لیزا نے زور زور سے ہلکیں جھپکا کر آنسوؤں کو رخساروں پر بہنے دیا۔ وسیع
ترتیب سے دونوں طرف بچ گئے ہوئے تھے، درمیان میں آنے جانے کی جگہ چھوٹی ہوئی
ساتنے ایک اونچے سے چوترے پر ایک طرف مقدس مریم کا چوترا سجا ہوا تھا۔ ان کے دونوں ہاتھ
میں بڑے ہوئے تھے اور حسین چہرے پر ابدی مسکراہٹ تھی۔ دوسری طرف یسوع مسیح کا مجسمہ
دونوں بائیں کھولے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے ان کے چہرے پر عاجزی اور نور پیلایا ہوا تھا
ساتنے ہی دیوار کے سارے ایک بہت بڑی سنہری صلیب پر عیسیٰ بھی مصلوب تھے۔ لیزا کو اس
سے والمانہ عقیدت تھی وہ کھنڈوں اس صلیب کے سامنے بیٹھی اسے وارفتگی سے نکلتی رہتی تھی
بولی اب مجھوں کے قریب پہنچی اور جبکہ کریسوع کے قدموں سے لپٹ گئی۔ اس کی آنکھوں سے
رواں تھے

”میرے مسیح! آپ نے مجھ کو دکھا کر میرا مان رکھ لیا۔۔۔ آپ نے مجھے بے سارا نہیں چھوڑا اور جان میرے جسم میری روح کے مالک ہیں۔۔۔ یسوع۔۔۔ انسان گمراہ ہو رہے ہیں انھیں تجھ سے عیاشیاں عزیز ہیں۔۔۔ وہ تاجی اور بے راہ روی کی راہ پر اندھا دھند دوڑ رہے ہیں۔۔۔ اے مقدس عظیم بیٹے انھیں سیدھا راستا دکھا۔۔۔ انھیں نیکی کی ہدایت دے۔۔۔“ وہ رو رو کر دعائیں مانگنے لگی ”مارک! کل کیوں نہیں آئے تھے تم؟“ لیزا نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا

”فلپ بھی تو کل نہیں آیا ہو گا؟ بحث بحث بڑا سخت جان ہے کل تو میں اسے دیکھ کر سمجھا کہ ہے۔۔۔ اسے کھلی کاشاک لگا ہے۔ دایاں بازو بیکار ہوتے تو بے چارے کی چار گھنٹے کے بعد ہوش آیا۔ والدین کا تو روتے روتے برا حال تھا۔“ وہ مسکراتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا

”مارک! برے کاموں کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے۔۔۔ کل فلپ نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اسے مقدس مریم کے واسطے رہے لیکن اس نے میری ایک نہ سنی اس پوری طرح بے بس کر لیا تھا پھر اچانک ایک معجزہ ہوا اور۔۔۔ اور فلپ کو اس کی کبھی سزا ملی۔“

سہیلی

”کیا؟“ وہ دباؤ مٹا ہوا کھڑا ہو گیا ”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں اس کہنے کو ہرگز نہ کوشش نہ کرتا مگر اب میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ باہر جانے لگا تو لیزا نے اسے مٹھا پکڑ لیا۔

”رک جاؤ مارک! تم انہما اپنے سر کیوں لیتے ہو میں نے جسے اپنا وجود سونپا ہے اس نے میری کی، مجھے بریاد ہونے سے بچالیا۔ مارک اگر۔۔۔ اگر تم فزاق نہ سمجھو۔۔۔ تو تھاکو۔۔۔ کہ۔۔۔ کہ اب تو میں عجیب سی چیزیں دیکھنے لگی ہوں۔۔۔ میں صبح چرچ جھاڑ پونچھ کرنے اور جلی ہوئی موم بتیاں اٹھانے جا رہا تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دھیرے دھیرے مجھے پکار رہا ہے میں حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھتی میرے سوا کوئی نہیں ہوتا پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے آواز بلند ہونے لگی ہو لیزا۔۔۔ لیزا! لیزا! وہ گونج چادروں طرف ابھرنے لگتی ہے۔۔۔ پھر مقدس مریم اور یسوع مسیح کی نگاہیں مجھ پر تنک جاتی وہ مسکرا کر مجھے دیکھتے ہیں اور میری روح۔۔۔ میرے جسم سے آزاد ہونے لگتی ہے میں نفسا میں تحلیل لگتی ہوں۔ مارک۔۔۔ میں ادھر بہت بے چین رہنے لگی ہوں۔“ مارک لیزا کو اپنے سینے سے لگا آہستہ اس کا سر تھپکتے لگا۔

”لیزا! لیزا! یہ تم کسی راہ کی مسافر بن گئی ہو۔۔۔ کسی کو حائل بتا لیا ہے تم نے۔۔۔ جہاں سے پلٹنے کی

اہلیس۔۔۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

لیزا نے فلپ سے ملنا ترک کر دیا تھا۔۔۔ مارک نے اسے بتایا تھا کہ صحت یاب ہونے کے بعد اس کی الی سرگرمیاں پھر سے شروع ہو گئی ہیں فلپ نے اس درمیان دو تین بار سر راہ لیزا کو روک کر بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک خاموشیوں پر چماتے وہاں سے ٹل گئی۔ وہ گھر آیا تب بھی لیزا نے ملنے سے انکار کر دیا۔۔۔ ایک دن مارک آیا تو بے حد پریشان اور افسردہ تھا وہ اسے دیکھ کر گھبرا گئی

”لیزا! میں نے اپنا گھر چھوڑ دیا ہے میں ڈیڈی، ممی اور ایشیلا سے الگ ہو گیا ہوں۔“ اس نے لیزا کے پاس پہنچایا۔ ”لیزا! اپنی آنکھوں سے اپنی بمن کو اس ادبائش کے ساتھ رنگ رلیاں مٹاتے دیکھ کر شش نہیں رہ سکتا۔ میں نے فلپ اور ایشیلا کو قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر دونوں کی چٹائی کر دی۔ ممی اور ایشیلا نے میری بے عزتی کی اور کہا کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے دخل دینے کا کوئی نہیں ہے لیزا اسی لیے میں نے ہنسنے سمجھا کہ میں الگ ہو جاؤں لیکن میں اس بد معاش کو قتل کر دوں گا“ ایشیلاں سمجھ کر کولا تو لیزا نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

سہیلی دخل سے کام لومارک! غصے میں کوئی غلط قدم مت اٹھا لیتا۔“

”اے۔۔۔ اے۔۔۔ اس بد معاش نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تو تم نے مجھے صبر کرنے کی تلقین کی۔۔۔ اب وہ کو بریاد کر رہا ہے تو تم کبھی ہو کہ میں خاموش تماشائی بنا رہوں۔۔۔ لیزا۔۔۔ لیزا! میری جان تم تصوراتی میں رہتی ہو کبھی اپنی اس پاکیزہ دنیا سے نکل کر اس کمرہ فریب سے بھری دنیا میں جھانکو تو سانس لینا اور جانے کا دکھ اور تنہائیاں ختم ہو جاتی ہیں قدم قدم پر۔۔۔“ مارک نے اس کے گال تھپتھپائے۔

”میں اپنے گھر میں منتقل ہو گیا ہوں۔۔۔ بھاڑ پر ایک خوبصورت گائے ہے۔ تم دیکھو گی تو یقیناً“ پسند آئے۔“ پھر وہ دونوں باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔

لیزا نے شیخ دان سے کچھلی ہوئی موم بتی نکال کر پھانوس اور شیخ دان میں نئی موم بتیاں لگائیں۔۔۔ جھاڑ کے سے خارج ہونے کے بعد وہ ALTAR کے سامنے ریٹک پر دوںوں ہاتھ باندھ کر گھٹنوں کے بل گئی اس کی نگاہیں بڑی صلیب پر پڑ گئی ہوئی تھیں۔۔۔ پھر ان میں نئی آنکھیں ہونے لگی

”دو۔۔۔ جانے۔۔۔ جانے۔۔۔ آج میرا دل اتنا اداس کیوں ہے“ بات بات پر رونے کو دل چاہ رہا ہے۔۔۔ آج اپنے نام کی صدا میں بھی سنائی نہیں دے۔۔۔ آپ نے مجھے سے نگاہیں نہیں ملائیں۔۔۔ مگر اگر اٹھا۔۔۔ آخر کیوں۔۔۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟“ وہ ٹکڑو کر رہی تھی کہ اچانک اچھل گئی

”ایزا! لیزا! تم سے غلطی ہوئی ہے تم نے کسی کا دل توڑا ہے۔۔۔ میں نے بار بار تم سے معافی مانگی لیکن تم

ایکایا تم مجھ سے شادی کرو گی۔۔۔ پلیر لیزا یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔۔۔؟ اس نے منت

پ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں میں نے راہبہ بننے کا معمم ارادہ کر لیا ہے۔

لیزا سوچو تو سہی۔۔۔ اس نے احتجاج کرنا چاہا لیکن لیزا نے روک دیا

بجٹ کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس دن بھی اسی موضوع پر بات کرتے کرتے تم میریں ہو گئے اور اب بھی سوائے بد مزگی کے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ لیزا کا جواب سن کر فلپ خاموش ہو گیا اور

میں روک دی

دن کے ساڑھے دس بجے تھے لیکن گھر میں غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔۔۔ اندر اندر پہنچے

دورہ میں ڈاکٹر مارک کا کپڑا رک جانا بیٹھا ہوا تھا جو انھیں دیکھ کر کھڑ ہو گیا۔

اسے جان تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ لیزا نے پوچھا۔

لیزا ہم یہاں سب کو ٹائیفائیڈ کا انجکشن لگانے واسطے آیا ہے۔ یہ بخار بہت پھیل رہا ہے تو

میں نے ڈاکٹر کو بولا تھا کہ گھر کے سب لوگوں کو انجکشن لگا دو۔ ڈاکٹر نے ہم کو بھیج دیا ہے۔ سب

انجکشن لگوا لیا ہے اب ہم باسٹر فلپ کا انتظار کر رہا تھا۔۔۔ چلو باسٹر آئین اوپر کھینچو۔ وہ سرخ بھرنے

لے لے لگوا یا ہے انجکشن؟ فلپ نے آئین اوچی کرتے ہوئے پوچھا۔

اسوں۔۔۔ ابھی نہیں لگوا یا، مارک آئے گا تو اس سے کہوں گی کہ می ڈیٹی سب کو انجکشن

دے دو۔ وہ بیٹھ گئی

ایک ایسی لگوا لو۔۔۔ ٹائیفائیڈ بہت پھیل رہا ہے۔ فلپ نے اصرار کیا

لیزا ہاں مس لیزا۔۔۔ تم لگوا لو یہاں سے واپسی پر ہم تمہارے گھر جا کر سب کو انجکشن لگا دے

میں نے کہا تو لیزا آئین اوچی کرنے لگی۔

نے مجھے معاف نہیں کیا۔۔۔ یسوع تو بھی کسی کو دکھ نہیں دیتا بلکہ گناہ گاروں کو معاف کر دیتا ہے۔۔۔

تم دے تو یسوع کی الفت کا دم بھرتی ہو۔ رحم دل اور معاف کرنے کی تبلیغ کرتی ہو۔ لیکن

میری ایک غلطی کی اتنی کڑی سزا سناری ہو۔۔۔ لیزا مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ پھر یا ربار

شرساریوں کر رہی ہو۔۔۔ لیزا نے دل پر ہاتھ رکھ کر دائیں طرف دیکھا تو ششدر رہ گئی فلسفہ

باندھے اس کے قریب گھنٹوں کے بل جھکا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

فلپ تم۔۔۔ اور۔۔۔ اور چچ میں۔۔۔ اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

ہاں لیزا! تم نے مجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ لیزا میں نے گناہوں سے توبہ

ہے اس دن والے مجھے کے بعد خدا اور یسوع پر یقین کرنے لگا ہوں۔۔۔ اب تو ہر اتوار کو چرچ

ہوں۔ وہ واقعی بدلہ لا لگ رہا تھا۔

لیکن۔۔۔ مارک تو کہتا تھا کہ تم اکیلا کو بھی گمراہ کر رہے ہو اور تمہاری وجہ سے اس

چھوڑنا پڑا ہے؟ وہ مصیبت سے بولی

وہ ہو اس کرتا ہے فلپ غصے سے بولا پھر سنہل گیا۔ میرا مطلب ہے کہ مارک تو تمہاری

مجھ سے خار کھا تا ہے وہ مجھے اپنا رقیب سمجھتا ہے اور تمہاری نظروں میں میری وقعت گھٹانے

جھوٹ بولتا ہے۔ اس نے یقین دلایا۔

فلپ۔۔۔ کیا تم۔۔۔ واقعی یسوع پر ایمان لے آئے ہو۔۔۔ وہ بے یقینی سے بولی۔

مقدس مریم کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔۔۔ اس نے دل پر کراس کا نشانہ بنایا اور سلیب کی

ہاتھ باندھ کر سر جھکا لیا۔

اور یسوع CHRIST مجھے یقین تھا کہ کوئی بھی شخص اتنا برا نہیں ہو گا کہ وہ گناہ کرے اور

میرے اسے ملات نہ کرے۔۔۔ میں نے اس دن فلپ کے سدھر نے کی دعا مانگی اور یسوع تو نے قبول

مجھے واپس نہیں کیا۔ وہ آنکھیں موند کر بولی۔ تو میری دیر کے بعد وہ دونوں چرچ سے باہر نکلے۔

لیزا میرے ساتھ گھر چلو تمہیں می نے بلایا ہے انھیں تم سے بہت ضروری کام ہے۔ میں آؤ

کو تاکر آیا تھا کہ میں چرچ سے واپس پر لیزا کو اپنے ساتھ گھر لے جاؤں گا۔۔۔ وہ اسے تذبذب

دیکھ کر ہاتھ پکڑے کار میں آ بیٹھا۔ لیزا اگر تم ہر انہیں مانو تو ایک بیات کوں۔۔۔؟ فلپ ضرور

زباہ شرافت دکھا رہا تھا۔

کیوں نہیں فلی ضرور کہو۔۔۔ وہ متاثر ہو کر بولی۔

بروز یا تو لیزا کے ساتھ ہی فلپ نے بھی اطمینان کی سانس لی۔

”جان... آج تو آنکھیں لگواتے ہوئے بڑا درد ہوا ہے۔“ وہ بازو ملنے لگی۔

”ہاں مس یہ ذرا ہائی پوٹنسی کا آنکھیں ہے نا۔“ فلپ بھی مسکراتا ہوا اندر گیا۔

”لیزا ڈیئر... می اور ریڈا آنکھیں لگوا کر لیٹی ہوئی ہیں کمرہ ہی میں کہ انہیں چکر آ رہے ہیں“

”حیرت ہے میں نے تو بار بار لگوائے ہیں اس سے تو چکر نہیں آتے... ارے... ل لیکن اب

بھی کچھ عجیب سامعوس ہو رہا ہے، واقعی چکر آنے لگے ہیں، اے جان کہیں تم نے غلابا

دیا؟“ لیزا نے کہا تو ان نے مسکرا کر فلپ کو دیکھا۔

”اچھا سہارا کام ختم ہو گیا ہے ہم جاتا ہے، ڈاکٹر ہمارا انتظار کر رہا ہو گا“ جان نے سوالیہ نظر

دیکھتے ہوئے فلپ کو مخاطب کیا۔

”اور... اچھا... اچھا یہ لوجان تمہارا انعام... ہاں تم نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے جو امداد

تو ڈیڈی سے میں نے تمہاری سفارش کر دی تھی۔ وہ تمہیں رقم دیں گے“ فلپ نے اسے کچھ

ہوئے کہا۔

”فلیں تم جان کی بیٹی کی شادی کے لیے امداد دے رہے ہو۔ یہ تو بڑی نیکی ہوئی مجھے خوشی ہوئی

وہ صوفے سے سر نیک کر بولی... اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں انہیں وہ کھولنے کی کوشش

تھی۔ فلپ جان کے ساتھ باہر نکل گیا۔

”ماں سرفلپ ہم کو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اگر ڈاکٹر مارک کو پتہ چلا تو وہ ہمارے کلوے کو

تم پر اس کو کہ ہم کو بچاؤ گے...“ خوف کے مارے جان تھر تھرائے لگا۔

”تم گرت کرو جان... مارک تمہارا بال بھی بیکانہ کر سکے گا۔ ہاں جب کبھی رقم کی ضرورت

سے مانگ لینا۔“ فلپ جان کو رخصت کر کے واپس آیا تو لیزا صوفے پر بے سہارہ پڑی تھی۔ وہ اس

اور اس کا کندھا ہلایا۔ لیزا نے ہنسنے لگیں اور فلپ کے منہم چہرے کو نفرت سے

تم... تم فطرت... کیونے انسان... تم نے مجھے... دھوکا دیا ہے... مارک سچ کہتا تھا...

شیطان سے بھی... زیادہ ذلیل ہو... ہٹ جاؤ۔ میرے سامنے سے۔ لیزا نے بے جان لڑنے

باتھوں سے اسے دور دھکیلتا چاہا لیکن وہ اس پر چھٹائی چلا گیا۔

”اب بلاؤ اپنے بیوی... اپنی مقدس... ماں مریم... کو... جن کی خاطر تم جوگ

تھیں... ہائے یہ شاداب رس بھرا بدن کو نوینیت کی چار دیواری میں کھلا کر رہ جاتا... پاگل

... لیزا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اندھے غار میں گرتی جا رہی ہے اور اس کے دل میں بے سب

اب بت زینت بوس ہو رہے ہیں۔

۶۶

اگلے جیکب... رات کے سو گیا وہ بج گئے اور طوفان ہے کہ شدت اختیار کیے جا رہا ہے مگر لیزا ابھی

دائیں نہیں آئی ہے۔... مارک نے کھڑکی کے شیشے کو ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے گھور اندھیرے

میں... بارش بہت تیز ہو گئی تھی۔ تیز آمدگی کی شدت سے مضبوط درخت بھی جھکے جا رہے تھے۔

وہ کمری بھی تانک انداز میں چلتی اور دل دہلا دینے والا توڑا خا ہوتا... مارک کا دل گھبرانے لگا اور

یادداشت چھانے لگی۔ وہ نوبے کیلنک بند کر آیا تھا اور لیزا خلاف معمول غائب تھی۔

”ہی! آپ نے لیزا کو اس بدعاش کے ساتھ کیوں جانے دیا۔“ مارک نے فیسے سے اپنے ہاتھ پر ہاتھ

لگا کر پھر دوسرے رکھ مارک، میری بیٹی کی حفاظت مقدس مریم کریں گی۔“ فادر جیکب منہ ہی منہ میں

کہنے لگا۔

”سب مزید انتظار نہیں کر سکتا، اور لیزا کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔“ مارک باہر نکلا تو فادر جیکب بھی

کمرہ میں بیٹھ گیا۔ بارش کی وجہ سے مارک کا آست چلا رہا تھا۔ واٹر چلنے کے باوجود شیشے

کے باہر جارہے تھے۔ خد اندھیرا... تھا کبھی بھی بجلی چلتی تو راستہ نظر آنے لگتا... مارک نے کار

کے کمر جانے والی سڑک پر موٹی تو اسے دائیں ہاتھ پر بھاڑیوں میں کوئی چیز نظر آئی... اس نے ہیڈ

لیمٹ... کار روک کر بھاگا... فادر بھی ساتھ تھا۔

... یہ... یہ تو لیزا کا کوٹ ہے...؟“ فادر نے بھی تائید کی۔ ”پھر لیزا کہاں ہے۔“ اس نے کوٹ اٹھا

اور ہلادوں طرف نظریں دوڑائیں یائیں جانب پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک جا رہا تھا... پہاڑ کا کٹ کر یہ

ارک... ٹینس فٹ چوڑی سڑک بنائی گئی تھی۔ اور دائیں طرف پہاڑ اور کھنی کھنی جھاڑیاں آگئی ہوئی

... لیزا ضرور کسی حادثہ کا شکار ہو گئی ہے؟“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

... لیزا میری بیٹی! فادر جیکب نے منہ کے سامنے ہاتھ رکھ کر زور سے آوازیں دیں لیکن بارش

کے شور میں ان کی آواز دب گئی۔ ”چلو مارک فلپ سے پوچھتے ہیں۔“ وہ دونوں بارش میں شرابور

کار میں بیٹھ گئے۔ فلپ کے گھر پہنچ کر انہوں نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ تو بوڑھے بٹر یوڈ نے دروازہ کھولا اور فلپ جیکب کو دیکھ کر وہ احتراماً چیخے مٹ گیا۔۔۔ فلپ نے فلپ کو بلوایا تو یوڈوسرہلا کر چلا گیا۔

”ماٹھر۔۔۔ فلپ جیکب اور ڈاکٹر آئے ہیں۔“ یوڈوسر یہ سنتے ہی فلپ گھبرا گیا۔ چند لمبے پہلے وہ نماز پڑھ رہا تھا۔

”مجھے کچھ خبر نہیں فادر... میں کچھ نہیں جانتا۔“

”یہ جھوٹ بول رہا ہے، اس نے پہلے بھی لیزا پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ بچ نکلا۔ کامیاب ہو گئی تھی۔“ مارک نے قلم کار گریبان پکڑ کر جھنجھوڑا۔ ”بول لیزا کہاں ہے۔ یاد رکھ اگر کاہل بھی بیکہ ہوا تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ گرجا۔

”ڈیوڈ... جونی... میری مدد کرو۔ قلم گہرا کراچی اٹھا... ساتھ ساتھ وہ مارک کی بارے بچنے کے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، فادر نے بمشکل قلم کو چھڑایا۔

”تم سب ذلیل کتے فغ ہو جاؤ میرے گھر سے۔“ قلم گردن مسلا ہوا بولا۔

”ماسٹر فلپ زبان سنبھال کر فادر سے بات کرو۔“ ڈیوڈ نے ناراض ہو کر کہا تو قلم نے اسے مار دے مارا۔ ”فادر بمشکل تمام مارک کو باہر کھینچ لایا۔

”فادر قلم کو معاف کردو... پتہ نہیں وہ آج اس قدر وحشی کیوں ہو رہا ہے اور یہ مس لیزا کی کا ہے؟“ ڈیوڈ نے پوچھا۔

”قلم چرچ سے صبح لیزا کو لے کر آیا۔ کتنے لگامی نے لیزا کو ضروری کام سے بلایا ہے؟ لیکن اور لیزا ابھی تک گھر نہیں پہنچی۔“ فادر جس نے کبھی مایوس ہونا نہیں سیکھا تھا، لیکن اب اس کے خوف اور بے اعتمادی جتنا کھلتی گئی تھی۔

”اور مس لیزا گھر نہیں پہنچی، اور قلم بولا کہ می نے بلایا ہے... لیکن فادر... سرائخونی اور میرا آج صبح ہی ٹرین گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ آج صبح ماسٹر فلپ نے ہم سب ملازموں کو چھٹی دے دی تھی۔“ اچانک بوڑھے ملازم کا رنگ زرد ہو گیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اندر گیا۔ ”... نہیں... نہیں... ماسٹر فلپ عیش ضرور ہے لیکن اتنا ذلیل نہیں ہو سکتا کہ لیزا جیسی کے ساتھ زیادتی کرے... اگر ایسا ہوا... تو ہم تو کوری چھوڑ دے گا...“ وہ مہم ارا دہ کر کے قلم کمرے میں داخل ہوا۔ کچھ پوچھنے کچھ جاننے کے لیے۔

فادر جیب اور مارک رات بھر مختلف ملے والوں کے گھر جا کر لیزا کے متعلق پوچھتے رہے لیکن پتہ چل سکا۔ ہر طرف تلاش کے بعد وہ حتمی اور مایوسی سے بی حال گھر پہنچے۔ تو لیزا ان کے انتظار بڑی پریشان بیٹھی تھی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوچ پکٹی تھیں۔

”کچھ پتہ چلا میری بچی کا؟“ وہ گہر کر اٹھی اور فادر جیب کے کندھوں کو پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔

”گہرا نہیں لڑیا، حوصلہ رکھو، خداوند یسوع اس کی حفاظت کرے گا۔“ پادری نے پیار سے کہا۔

ماریا۔

”یسوع... یسوع... ننگ آئی ہوں میں تمہارے منہ سے یہ نام سن کر، کیا دیا ہے ہمیں تمہارے... جس کی خاطر تم اچھی بھلی ملازمت چھوڑ کر آئے تھے۔ کیا ملا مجھے اور میری بیٹی کو سوائے ال... ایکے پن اور افلاس کے... ایک بیٹی اور اسے بھی تم نے کس کا نہیں چھوڑا۔ اپنے رنگ میں... صبح سے شام تک چرچ میں بیٹھی رہتی ہے اور... اب... وہ نن بننا چاہتی ہے۔ ہر دنیوی رشتے... میں نے تو... شوہر بھی گنوا دیا اور بیٹی بھی... ہائے میری لیزا! وہ سسکیاں لینے لگی اور اس کی کمر کی گرد بازو ڈال کر قریب کر لیا۔

”آپ لیزا کو کچھ ہوا تو مجھے کبھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ مارک زخمی شیر کی طرح کمرے کے پکڑا ہوا تھا۔

”مارک! میرے ساتھ چرچ چلے آج اتوار ہے، ابھی سے لوگ آئے لگیں گے۔“ فادر اس حال میں اپنے فرض سے غافل نہ تھا۔ ہال میں داخل ہو کر فادر نے پہلے گرجا کا برا بھلا نہ دیکھا۔ آج فادر جیب کے ساتھ اور قدم ست تھے۔ دل میں خوف اور اندیشوں نے سیرا کر لیا تھا۔ مارک نے اونچے سے اونچے دیکھا۔ بڑی بڑی موم بتیاں پگھل کر آخری سانس لے رہی تھیں۔ فادر اور مارک نے بڑی سی طرف دیکھ کر سینے پر کراس کا نشان بنایا اور جیسے ہی اندرونی میڑھی پر پاؤں رکھا تو کمر گئے۔

اپنی پیندہ صلیب کے قدموں میں لولہان اور بے جان پڑی تھی۔ صلیب پر لٹکے ہوئے یسوع... لکڑیوں کے وجود پر جی ہوئی تھی۔ اور ان میں عجیب دکھ اور انت رچی ہوئی تھی۔

”مارک چپنا۔ وہ دونوں دوڑ کر قریب پہنچے۔ مارک نے بغل دیکھی پھر دل پر ہاتھ رکھا۔ تب مارک نے کچھ سکون سمجھا لیا۔ لیزا کا سر پٹنا ہوا تھا۔ خون بہہ کر لباس اور چہرے پر جم چکا تھا۔ حتیٰ کہ پاؤں بھی اس سے آلودہ ہو گئے تھے۔ شاید لیزا عالم دیوا گئی تھی صلیب سے سر نکراتی رہی تھی۔ مارک نے لیزا کو اٹھایا اور باہر بھاگا۔ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کانی سے زیادہ چڑھ چکا تھا۔ اور وہ ان میں آتا شروع ہو گئے تھے۔ انہوں نے مارک کو ایک بے جان وجود بازوؤں میں اٹھائے باہر لڑکھا تو پریشان ہو گئے۔ پھر لیزا کو دیکھ کر ان کی تیراوی خوں ہو گئی۔

”الیزا! لیزا کو کیا ہوا؟“ اتھنی کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ ”یہ بات آپ اپنے بیٹے قلم کو کہیں۔ وہی آپ کو بتا سکے گا۔“ مارک نے غصے سے کہا تو سرائخونی گہرا سا کیا۔

”مارک تم لیزا کو گھر لے جاؤ۔ لوگ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ میں چرچ میں اپنے فرائض انجام دیتے جا رہا

ہوں۔“ فادو واپس مڑ گیا۔ بیٹی کی حالت دیکھ کر اس کے ہاتھ پاؤں کپکپا رہے تھے۔ لوگ آپس میں بات کرنے لگے۔ لیزا کی شرافت اور پارسانی کی گواہی دینے لگے۔ انہی تو عبادت گزار اور پارساہے وہ لیکن فلف۔ فلف کا کیا قصہ ہے؟ مارک نے سرائختی سے یہ کیوں کہا کہ آپ اپنے بیٹے فلف پوچھیں؟ ان کے دل دھڑک اٹھے۔ فلف کس قماش کا تھا یہ بھی جانتے تھے اور جانتے ہو جیتے کچھ کی بہت نہیں تھی ان میں۔ کیونکہ سرائختی اس بستی کا متول ترین انسان تھا اور وہاں رہنے والے افراد کو اس کی فیکٹائل مل میں ملازم تھے۔

دو مہینے زمر چکے تھے۔ لیزا لٹی ہوئی عزت کا ماتم کیا کرتی جبکہ ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ مارک اسے چرچ سے اٹھا کر لایا۔ اس کی ڈریسنگ کی وہ گھنٹوں بے ہوش پڑی رہی۔ ہوش تو ساتھ ہی بخارنے اس کے فکرتہ وجود پر قبضہ کر لیا۔ وہ بدبالی انداز میں چپچی رہ جاتی۔

”کرا سنٹ۔ کرا سنٹ تو نے مجھے چھوڑ دیا۔ تو نے مجھے دل سے گرا دیا۔“ پھر وہ اٹھ کر بھاگا۔ کوشش کرتی۔ مارک رات دن اس کی پٹی سے لگا بیٹھا، مسلسل تبادوری کر رہا تھا۔ لیزا کی دیوانگی کو خود بھی دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس کا ہسپتال دو مہینے سے بند پڑا تھا۔ اس کی بہن ایشیا جو اس کے پاس نرس کام کرتی تھی کئی بار آکے مارک سے لڑھکھچکی تھی کہ وہ کلینک کیوں نہیں کھولتا۔ وہ گھر بیٹھے پور ہو گئی تھی۔ لیکن مارک لمبے عرصے کے لیے بھی لیزا کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ آخر کار اس کی محنت جافشانی کام آئی اور لیزا کا بخارا اتر گیا۔ وہ آہستہ آہستہ حقیقت کی فتح و گھنٹائی دماغ میں واپس آنے لگی وہ جب بھی آنکھیں کھولتی۔ مارک کا شفیق چہرہ اپنے اوپر جھکا پاتی۔ اس کا دل خون خون ہو جاتا۔ آنکھیں دھندلا جاتیں۔

”لیزا مریچکی ہے مارک۔۔۔ مریچکی ہے۔ وہ بے حال ہوئے گئی۔۔۔ اور مارک کا دل کانپ اٹھتا۔“ لیزا ایک بار تو بتاؤ کہ تم پر کیا بیٹتی ہے۔ اس طرح بکھرے اور بے حال ہونے کا سبب کیا ہے لیکن لیزا پر خاموش طاری ہو جاتی۔ وہ بدلیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔ کچھ عرصے بعد جب وہ قدرے پھرنے کے قابل ہوئی تو اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا۔ مارک، ”لیزا۔۔۔ یہاں تک کہ جب تک اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے لیکن وہ کمرے سے باہر نہ آئی۔ زبردستی کچھ کھلایا جاتا اور لیتی۔ ورنہ بھوکی پڑی رہتی۔

”یہ کیا ہو گیا ہے یسوع۔۔۔ یہ تو کیا ظلم کیا۔۔۔ میری عبادتوں اور پرستش میں کیا کی رہ گئی تھی؟“ میرا کیا مستقبل ہو گا میں نے تو تیری چاہت میں خود کو دنیاوی لغزشوں سے پاک رکھا تھا۔ کوئی مرد

بنایا تھا۔۔۔ اپنی خواہشات پر برف کی بجائے سل رکھ دی تھی۔ میں تو تیری بچان بن کر اپنا کنوارا ان کا بدن لے کر کاؤنٹ جانا چاہتی تھی۔۔۔ یسوع انسان جب کبھی اپنے کسی پیارے کو خفقہ دیتا ہے تو وہ اس کے لئے اچھی سے اچھی چیز پسند کرتا ہے۔۔۔ نئی اور شفاف چیز جو پہلے استعمال نہ کی گئی ہو۔۔۔ اور میں جو یسوع کی خدمت میں خود کو پیش کرنا چاہتی تھی۔ اب کیا دان کرؤں؟ اپنا روندنا ہوا اپنی کھلی ہوئی روح؟ لیکن اس میں میرا کیا قصور۔۔۔ میں اپنی مرضی سے کب لٹی ہوں۔۔۔ مجھے روک لٹا گیا ہے۔۔۔ میں تو اس زعم میں تھی کہ میں نے خود کو یسوع اور مریم کی امان میں دیا ہوا ہے۔۔۔ میری حفاظت کریں گے اور مجھے ایسے گھناؤنے لحوں سے بچائیں گے۔ لیکن جب میرے محافظ بھی مراد ہونے سے نہیں بچا سکے۔۔۔ میں بہت کمزور اور بے بس لڑکی تھی۔۔۔ وہ یہی سوچے جاتی۔۔۔ اور ہمیشہ ہر بات میں نیکی اور اچھائی تلاش کرتی تھی۔ اب برائی کے وجود پر یقین کرنے لگی تھی۔ اس پر کچھ جانا بیکسر چھوڑ دیا تھا۔ وہ کمرے میں بند پڑی رہتی، اس کے دل و دماغ میں ایک کشش ایک سی جاری تھی۔ اور اس کا دل یسوع اور مذہب سے بالکل اچاٹ ہوئے لگتا۔

”لیزا بیٹی! خدا کے واسطے اپنے آپ کو سنبھالو۔ آخر کیا ہو گیا ہے تمہیں، کچھ بتاؤ تو سی۔ تین مہینے ہو گئے اور تمہاری حالت بد سے بدتر ہو جاتی رہی ہے ایک ہفتے بعد کر مس ہے۔ اٹھو پہلے کی طرح گر جا کر روؤ ورنہ شیاں لگاؤ۔“ لیزا نے بیٹی کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

”تین مہینے ہو گئے ہیں؟“ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی پھر اس کا رنگ بیلا پڑنے لگا۔ ”نہیں۔ نہیں خداوند۔“ ”یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکو گی میں اس آزمائش سے نہیں گزر سکتی۔ خداوند میں مریم لٹی ہوں۔“ وہ دیوانہ وار اٹھ کر دو دروازے کی طرف دوڑی تو لیزا نے اسے پکڑ لیا۔

”میں ہوش میں ہوں مجھے جانے دو اگر دیر ہو گئی تو بہت برا ہو گا۔“ اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ لیزا بہت بن کر دیکھتی رہ گئی۔

☆

”لیزا اتھ۔۔۔؟ فلف جیسے ہی گھر سے نکلا تو ایک دم درخت کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگئی اس کا دماغ ان چرا اور سوکھیا بدن دیکھ کر پہلے تو وہ پچھان نہ سکا پھر گھبرا گیا۔

”اں میں ہوں۔“ وہ گھبراؤ میں بولی۔ ”فلف مجھے تم سے نہایت ضروری بات کرنی ہے ذرا میرے

”ہاں ہاں تم گھر کے اندر آ جاؤ لیزا۔“ فلپ کے اندر کا گھٹا دنا انسان بیدار ہونے لگا۔ اسے لیزا کے ساتھ گزرے لمحات یاد آنے لگے۔ وہ اس کی زندگی کے حسین ترین لمحات تھے۔ کوئی عورت اتنی دلکش اور ہوش ربا ہو سکتی ہے۔ اس نے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

”نہیں فلپ! تم اور مرد رختوں کی طرف آ جاؤ میں نہیں چاہتی کہ تمہارے گھر کے لوگ مجھے تمہارے ساتھ دیکھیں۔“ وہ خوفزدہ انداز میں بولی۔

”یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے میں تو تمہیں پہچان ہی نہیں سکا اس قدر کمزور ہو گئی ہو تم؟“

”تم مرد کتنے ظالم ہوتے ہو کسی کو عمر بھر کا روگ لگا کر اس سے روگ کی وجہ پوچھتے ہو۔ تم نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا فلپ دل چاہتا ہے میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ تمہارے وجود کو اس طرح مسخ کر دوں کہ تمہارے اپنے بھی تجھیں شناخت نہ کر سکیں۔“ لیزا نے لڑتے ہوئے کہا۔

”آؤ میرے بیڈ روم میں چلو چکر چاہے مجھے سو بار قتل کر دنا میں اف تک نہیں کروں گا۔ اس دن تمہاری بے ہوشی نے میرے ہوش لوٹ لیے تھے۔ اب ہوش میں مزید قیامت ڈھاو گی۔ آؤ اب تو تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس صلیب پر لٹنے یعنی بے یہ گوشت پوست کا زندہ فلپ زیادہ کام کا آدمی ہے؟“

شدت جذبات سے سلگ اٹھا تھا۔ لیزا دور ہٹ گئی۔

”پلیز فلپ! خدا کے واسطے میری بات سن لو۔۔۔ تم مجھ سے شادی کر لو۔“ وہ گونگڑا کر بولی۔

”شادی؟“ وہ دنگ رہ گیا۔

”ہاں تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ بارہا تم نے مجھے پوچھ دیا تھا۔“

”اور تم نے بارہا انکار کیا تھا۔“

”لیکن فلپ اس وقت تو انکار کی وجہ یہ تھی کہ میں نہ بننا چاہتی تھی میں پاک تھی، پوتر تھی لیکن اب میں اپنا کھلا ہوا وجود یسوع اور مریم کے سامنے کیسے لے جاؤں؟“ وہ رو رہی تھی۔

”اب بھی نہ بننے کا امتناع خیال دل سے نہیں نکلا؟“ فلپ نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اجڑی محبتوں کا مزار لگ رہی تھی چہرے کی پہلی جیسی معصومیت و دلکشی کہیں زائل ہو گئی تھی۔ بکھرے پال دشت ژوہ آنکھیں، ابھری ہوئی بڑیاں۔ جب تک لیزا اس کے اختیار سے باہر تھی تب تک اس کی کشش فلپ کو دباؤ نہ بناتے تھی اب جبکہ وہ اسے پال کر چکا تھا۔ کشش و لگن کچھ مٹ سی گئی تھی اور پھر اب تو وہ اشیاء جیسی پر ہمار، زندہ دل لڑکی کی زلفوں کا اس پر ہو چکا تھا۔

”شیاء جو زندگی کو یک ڈانسنگ فلور سمجھتی تھی۔ اور ہر دکھ پر غم کو اپنے تیزی سے رقص کرتے

اوں تلے روند ڈالتی تھی۔ جو ہنسا جانتی تھی ہنسانا جانتی تھی زندگی سے بھرپور تھی۔ اف تو یہ۔ لیزا سے لڑائی کرنے سے بہتر ہے کہ میں خودکشی کر لوں۔“ فلپ نے جھرجھری لی۔

”دیکھو لیزا! میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں۔۔۔ میں تم سے دوستی کر سکتا ہوں لیکن شادی نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں برباد کر دیا ہے۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔۔۔؟ میں یہ ایلاک بے شمار لڑکیوں سے سن چکا ہوں اور تم بھی ان لڑکیوں سے مختلف نہیں ہو۔ تم نے معمولی سی بات کو اتنا بڑھا کر تین مہینے تک داویلا کیا۔۔۔ تو یہ ہستی کے ایک ایک گھر میں تمہاری دیوانگی کے لیے تھے۔ میں تو تمہارا ذکر نہ کر رہا ہوں۔“ وہ اکتا کر بولا۔

”فلپ تم اسے معمولی بات سمجھتے ہو؟ اور تم مجھے معمولی لڑکیوں سے ملائے ہو۔ میں ویسی نہیں ہوں۔۔۔ میں ہوں۔“ وہ چیخنے لگی۔

”اوکے۔۔۔ اوکے۔“ فلپ گھبرا گیا۔ ”دیکھو لیزا! آج میں بہت مصروف ہوں کل تمہارے گھر آؤں گا پھر تیلی سے بیٹھ کر بات کریں گے۔“

”نکل۔“ وہ واپس ہو گئی۔ ”پلیز فلپ ضرور آؤ گے نا؟“

”ضرور آؤں گا۔“ وہ سکھ کی سانس لے کر بولا۔ اس وقت تو یہ مصیبت کس طرح ٹل جائے۔ فلپ نے چکا تھا کہ اس کے باپ سرانٹھونی کا منہ چڑھا ملازم ڈیوڈ پر آئندے میں کھڑا کمری نظروں سے یہ منظور دیکھ رہا ہے۔ ڈیوڈ فلپ سے لیزا کی خاطر جھگڑا مول لے چکا تھا اور فلپ نے بشکل اسے جھوٹی قسمیں کھا کر لیکن دلا یا تھا کہ اس نے لیزا سے کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ سرانٹھونی نے بھی فلپ سے بڑی سختی سے باز کر لی تھی اور وارننگ دی کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے اور جلد از جلد اپنے لیے دلچسپ منتخب کر لے۔ وہ اس کی آواز کیوں سے ٹالنا ہیں اور اس کا جب خراج بند کر دیں گے۔ فلپ نے بہت سوچ بچار کیا بعد ایشیاء کا نام انہیں بتا دیا تھا۔

☆

لیزا آج خلاف معمول کمرے سے باہر آگئی تھی۔ اس نے کپڑے بھی ڈھنگ کے پہنے تھے۔ اور پال کی سنوار لیے تھے۔ اس نے مارک اور می کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور جیکب کہیں گیا ہوا تھا۔ ٹرپا ان اٹھا کر لے گئی تو مارک اور لیزا اسٹنگ روم میں آگئے۔ لیزا نے بار بار گھڑی دیکھی ساڑھے نو بج چکے۔ وہ اٹھ اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

”لیزا اس کی ہنسنے پر تم؟“ مارک نے پیار سے پوچھا۔

”ہاں۔ میں۔ میں فلیپ کا انتظار کر رہی ہوں اس نے آنے کا وعدہ کیا تھا۔“ وہ آہستہ سے بولی اور قریب بیٹھ گئی۔

”کیا؟“ مارک اچھل گیا۔

”ہاں مارک۔ مجھے اس سے بہت ضروری کام ہے، میں بہت خوفزدہ ہوں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے۔ مجھے کوئی نیا گاہ۔ کوئی سارا نظر نہیں آتا۔ یسوع نے بھی مجھے دھکا دیا ہے۔ مجھ سے اب صدمہ برداشت نہیں ہو گا۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی ہوئی مارک کے سینے سے لپٹ گئی۔

”بے لیا۔ لیزا۔ کیا بات ہے اپنے مارک کو نہیں بتاؤ گی؟“ وہ اسے چمکاتا ہوا بولا۔

”مارک۔۔۔ مارک میں کیا کہوں؟ کس سے کہوں کہ میں برباد ہو گئی ہوں میں لٹ گئی ہوں۔“ وہ چیخ کر روئی ہوئی بولی۔

”کیا۔ کیا مطلب؟“ مارک کا جسم اڑ گیا، دل اس طرح دھڑکا کہ چند لمحوں کے لیے سانس لینا وہ بے ہو گئی۔ لیزا تم کیا کہنا چاہتی ہو۔۔۔ کیا۔ کیا فلیپ نے؟“ وہ سوسوں کی پیلخار ہوئی تو اس نے لیزا کو ہاتھ ڈالا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ یہ جتنی کیفیت دیکھ کر لیزا ہنسا رہی تھی۔ اگر میں نے مارک حقیقت بتا دی۔۔۔ تو یہ۔۔۔ فلیپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔۔۔ اور پھر مارک کو پولیس پکڑے گی۔۔۔ نہیں مجھے چپ رہنا چاہیے۔“ اس نے سوچا۔

”مارک۔۔۔ تم غلط سمجھ ہو ایسی تو کوئی بات نہیں ہے کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟“ وہ سنبھل کر دھیرے دھیرے بولی۔

”تم پر اعتماد ہے لیزا۔ لیکن اس کیسے ذیل پر نہیں ہے۔“ مارک نے اسے پلو سے لگا لیا۔

”ہاں۔ وہ واقعی بہت ذیل ہے۔۔۔؟“ لیزا نے زندگی میں پہلی بار کسی کو کہا تھا۔ اور مارک کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ اس کے آنسو مارک کے گوت میں جذب ہونے لگے۔ مارک اس کی باتیں سن کر تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ لیزا تین چار بار فلیپ کے گھر گئی۔ لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ پھر وہ بری طرح خوفزدہ رہنے لگی تھی۔

”آج کرسمس تھی۔۔۔ لیزا فادر جیکب اور سب کے اصرار کے باوجود چھ نہیں گئی تھی نہ ہی کرسمس باہر نکلی۔ رات کو ہمیشہ کی طرح سرائی تھی کہ گھر کرسمس ڈنر تھا۔ لیزا نے بے حد کوشش کی کہ وہ ساتھ چلے لیکن لیزا نے سختی سے انکار کر دیا۔ مارک صبح اسے کرسمس کا تحفہ دے کر ایک مریض کو دیکھنے دے دی

لیزا کا تھا۔۔۔ لیزا تنہائی اور سکوت سے گھبرا کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور روشنیوں قسموں سے اپنے چہرے کو دیکھنے لگی۔۔۔ آج چاروں طرف عجیب نور چھایا ہوا تھا۔۔۔ آج۔۔۔ آج۔۔۔ صبح اور اس مریض کے گرد کتنی روشنیاں ہوں گی۔۔۔؟ اس نے سوچا۔ پھر اس کا دل بھر آیا۔ ہمیشوں سے اس نے اس میں قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ یسوع مسیح سے ناراض تھی۔ مقدس مریض سے رنجی ہوئی تھی کیونکہ اس نے اس کے اعتماد کو صدمہ پہنچایا تھا۔ اسے دنیا کے طوفان کا نشانہ بننے کے لئے تنہا چھوڑ دیا۔

”خداوند۔۔۔ جب دنیا والوں پر گناہوں کا راز افشا ہو گا۔۔۔ تو کیا ہو گا۔۔۔؟“ وہ کپکپا اٹھی۔ پھر اس نے اس میں قہر بھر آیا۔ ”خداوند وہ تو مریض تھی جو آپ کو بے حد عزیز تھیں اور جن کی پارسائی کی

اس آپ نے تو مولود بچے سے دونوں۔۔۔ اور۔۔۔ میں۔ میں ایک معمولی لڑکی۔ میری پارسائی کی

اس دن دے گا؟“ لیزا نے کرسمس میں نصب صلیب کی طرف دیکھ کر آواز بلند روتے ہوئے پوچھا۔

”لیزا بیٹی ہم دے گا تمہاری نیکی کی گواہی۔“ کسی نے نرمی سے اس کے کندھوں کو چھوا تو وہ اچھل گئی

اور لڑا، ہو کر مڑی تو اس کی نظریں بوڑھے بوڑھے آنسوؤں سے ٹکرائیں۔

”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ وہ شہر رہ گئی۔

”میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ ہم فلیپ کو مجبور کرے گا کہ وہ تم سے شادی کرے۔۔۔ چلو ہم

آئیے آئیے آج۔۔۔ آج باشرقیہ اور ایشیہ کی جنگ کا اعلان ہونے والا ہے۔“ ڈیوڈ حرمزہ لیزا کا ہاتھ پکڑ

ار میں آٹیشیا۔ جلد ہی وہ سرائی تھی کہ محل نما گھر میں پہنچے جو غریبوں سے بھرا ہوا تھا۔ رنگ

کیا اب اٹھا ہوا تھا وہاں۔ ڈیوڈ لیزا کا ہاتھ پکڑ کر اندر محفل میں پہنچا تو ایک سنا سنا سا چھایا گیا۔ سفید

اور لائٹ گاؤں پہنے کوئی کوئی سی لیزا کوئی بھیجی ہوئی روح لگ رہی تھی۔ فلیپ اور اس کے قریب

لیزا ایشیہ کا رنگ زرد ہو گیا۔

اسے لیزا بیٹی! تم کس طرح آگئیں؟“ لیزا نے حیران ہو کر پوچھا۔

”آہ! اس کو میں لایا ہوں۔“ ڈیوڈ اپنے نیکے کندھوں کو اوچاٹان کر زور سے بولا اور غصیلی نظروں

اس نے سہمی سہمی نظروں سے اپنے گرد بکھرے ہشاش بشاش چمکتے چروں کی طرف دیکھا۔ پھر سمٹ کر ا کے قریب ہو گئی۔

”خواتین و حضرات! میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں۔“ اسٹیج پر کھڑے سرانٹھوں کی آواز گونجی تو لوگ ہلکے ہو گئے۔

”پہلے تو میں آپ سب کو کرمس کی مبارک باد پیش کرتا ہوں اس کے بعد آپ کو یہ خوشخبری ملے گی کہ اگلے اوتار کو میرے بیٹے فلپ کی شادی ایشیا جاسن سے ہو رہی ہے اور آج منگنی کی رسم ادا ہو چکی ہے۔ یہ سنتی ہی ایک دم مبارک سلامت کا غور کیا۔ لوگ لیزا کو دھکیلنے تیزی سے فلپ کی ایشیا کی طرف بڑھ رہے اور لیزا پیچھے ہٹی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ فلپ کی شادی ہو رہی ہے تو... تو پھر لیزا کی شادی کیسے ہو گی؟ لیزا کا سر جھکانے لگا۔

”نہیں۔“ وہ پوری قوت طاقت سے چپنی اور اسٹیج پر چڑھ گئی۔ ”سرا انتھونی..... بلیز۔“
شادی رکاوٹ دیکھے۔ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“ وہ بولی تو مایکے پر اس کی آواز گونج کر رہ گئی۔ ہال میں ایک
خاموشی چھا گئی۔ لوگ منہ پھاڑ کر نکلنے لگے۔ وہ سرا انتھونی کا کہ بیان جھنجھوڑے ہوئے مسلسل جتنے چار
تھی۔

”لیڑا... لیڑا بیٹی...“ آخر کیوں نہیں ہو سکتی یہ شادی؟“ فادر جیکب نے برٹشان کو پوچھا۔
 ”چہا... چہا اگر فلپ اسیڈیا کی شادی ہو گئی تو میں... میں بریاد ہو جاؤں گی۔“ لیڑا نے چکرا مار
 رہا تھا اور پھر ایک دم کھانسی سے فرش پر گر کر بہوش ہو گئی۔

”یہ سب کیا ہے... کیا ہے...؟“ سب کے لبوں پر یہی سوال تھا، فلپ کپکپا رہا تھا اور اشیہ غور سے اس کے زرد چہرے کو بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

۳۱! ایشیا پیلز تیراں آؤ زور لیزا کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔" رانٹھونی نے ہلایا تو مجھ پر شیلہ کو جانا پڑا۔ اس نے زمین پر بکھرے ہوئے اس دوجو کو گرفت سے دیکھا۔ جس نے رنگ میں ہمارے دل کی تھی۔ پھر وہ ماہر نرس کی طرح لیزا کو سنبھالنے لگی۔ اچانک اس نے کچھ محسوس کیا تو اس کے سرے پر بے یقینی کے آثار ابھر آئے۔

”انکل.... آپ ذرا لیوا کاٹھا کر کرے میں لے چلیں میں ان کا چیک اپ کرنا چاہتی ہوں۔“ بھر دم مرا تھوئی نے نازکی سی لیزا کو انڈوں میں اٹھایا اور رٹا کے بیڈروم میں پہنچا دیا۔ فلیپ کی ماں اور رٹا کے کمرے میں چلی گئیں۔ اسیلہ نے دروازہ بند کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر نکلی تو اس کے چہرے

سی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

ایٹلیا بیٹی کوئی سیریس اور خسرے والی بات تو نہیں ہے؟“ قادر جبک نے پوچھا۔
 افسر قادر... بات اگر معمولی سمجھو... تو معمولی ہے۔۔۔ ایٹلیا آگے کہتے ہوئے ہنچکا رہی تھی۔ اس
 خاموش کھڑے لوگوں پر نظر ڈالی جو خنجر والہ نگاہیں اٹھائے اسے دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں مارک جو
 لوں کو دیکھنے گیا ہوا تھا واپس آیا تو ہاں میں داخل ہوتے ہی ٹھک گیا۔ اسے دیکھ کر ایٹلیا کے لبوں پر
 مسکراہٹ پھیل گئی۔

..... آؤ۔۔۔ میرے پیارے بھائی مارک۔۔۔ صرف تمہاری کمی تھی۔ لوگ ابھی تو خاموش ہیں لیکن ان کے بعد جب حقیقت کھلے گی تب ان کے تاثرات دیکھنے کے قابل ہوں گے۔ ”لاؤڈ اسپیکر پر ایک ایسی گونج اٹھی۔

”اراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے! سیدھی طرح بتاؤں بات کیا ہے؟“ مارک نے قریب آکر
 ”ابا سب کے سامنے بتاؤ مارک؟“ ارا کے انداز میں چیلنج تھا۔

”اے!... تمہاری یہ جنس پیدا کرنے والی عادت مجھے زہر لگتی ہے۔“ وہ چڑکیا۔
 سنائی دے جاتے ہو تو سنو۔ وہ تمہاری لیزا اچانک بوڑھے کے ساتھ یہاں ٹائٹ گاؤں پہنچے ہوئے آئی تھی
 کہ جب اکل انصونی نے میری اوپر ٹپ کی شادی کا اعلان کیا تو مجھیں مارتی ہوئی بے ہوش ہو گئی۔ میں
 کرے میں جا کر اس کا چپک اپ کیا۔“

”ارک! وہ شریف پاکباز چھوٹی موٹی لیزا ماں بننے والی ہے؟“ اسٹیل نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا تو ہال میں دو لوگ جیسے سانس لینا بھول گئے تھے۔

لو اس بندہ کرو۔ ”مارک نے مزہ کر اٹھا کہ منہ پر ٹھانپوں کی بارش کر دی۔ ” کمپنی ذیل مجھے ایسی کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ ” وہ چیخا

”ماں باپ کو کھائی اور اوپر سے پارسائی کا ڈھونگ رہا رہی ہے۔“ لوگ طیش میں آگئے۔

”ٹھہرو لوگ..... مجھے اپنے بیٹے قلب سے پوچھتے دو۔“ سراختنی آگے بڑھا۔

”قلب..... تم میرے اکلوتی اولاد ہو میں نے بہت دعاؤں کے بعد تمہیں پایا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میرے تین بھائی بے اولاد ہیں میری دو بیٹیاں اولاد کے لیے بڑی ترستی رہیں لیکن ان کی کوکھ ویران رہی قلب ہمارے خاندان میں اولاد کی بہت کمی ہے۔ اگر..... اگر..... یہ تمہارا بچہ ہے تو اب بھی وقت مجھے بتا دو۔ کیسے ایسا نہ ہو۔ تمہارے مقدّر میں بھی خداوند نے یہی ایک بچہ لکھا ہو اور تم اسے اپنی ناکھی سے گنوا بیٹھو اور پھر ساری عمر اولاد کے لیے ترستے رہ جاؤ بولو قلب؟“ سراختنی نے اس کا ہاتھ ہلایا۔

”بچہ..... بچہ..... میرا کوئی بچہ نہیں ہے..... نہیں ہے۔“ قلب دیوانہ وار چیخ اٹھا تو لیزا چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”سراختنی آج سے تمہارے گھرانے اور تمہاری نسل کو فرشتوں کی کتاب سے مٹا دیا جائے گا۔ اب قلب کبھی باپ نہیں بنے گا۔“ نس بنے گا۔“ لیزا کی سرگوشی ابھری تو سب خراٹھے۔ وہ اپنا بھائی خون آلود لباس سنبھال کر قادر جیکب اور نرینا کی لاشوں کی طرف بڑھی جو صوفے پر ڈال دی گئی تھیں۔ ”بی بی! آپ لوگوں نے مجھے صفائی کا موقع تو دیا ہوتا..... مجھ سے پوچھتے تو میں کس طرح لٹ گئی۔“ شدید صدمے نے لیزا کے آنسو خشک کر دیے تھے۔ وہ جھکی اور ماں باپ کی سرپوشیاں چوش۔

”بھائی! اسے دور کر دو قادر کے بہترک جسم سے.....“ ایک آدمی نے لیزا کو بازو سے کھینچا۔

”دیوانے لوگ..... میں اسی بہترک جسم کا ایک حصہ ہوں۔ میں ان کی اولاد ہوں..... خدایا..... خدایا! تیرے بندوں کے بارے میں میرے خیالات کس قدر بلند تھے۔ میں ان برا نہیں کہتی تھی۔ لیکن اب..... اب میں اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہو گئی ہوں۔“ وہ دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

”باہر نکالو اس بدکار کو۔“ اور ایک سے قابو رہیں۔ لیزا کو ہال سے باہر دھکیل دیا۔

”ہٹو..... راستہ چھوڑو۔“ مارک دیوانہ دار انھیں ہٹاتا ہوا بڑھا اور لیزا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”ہمارا کوئی آدمی لوگ دیوانے ہو گئے ہیں یہ جہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ وہ اسے کھینچ کر بھاگا۔

”میں چرچ جانا چاہتی ہوں۔“ وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ”آج میرے لیے یوم حساب ہے۔“

”ماں باپ کو کھائی۔“ وہ ایک جوش اور دلولے سے بھانگی ہوئی چرچ میں داخل ہو کر سیدھی صلیب کے پار کی۔ ہال رنگ برنگی رہشیدوں سے جھگڑا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر دہائی دی۔

”یہ“ اسے مقدس مریم کے عظیم بیٹے..... قلب کہتا تھا کہ تو فقط ایک پتھر کا بت ہے..... وہ بت جسے اس کی ہاتھ چاہے وہ کسی گناہ گار کا ہو یا پارسا کا..... اٹھا کر عبادت خانے میں رکھ دے۔ یا ریشی کے لیے..... وہ کہتا تھا کہ تو کڑی کے تختوں پر گڑا ہوا بے بس عیسیٰ ہے..... ایک کھلوتا ہے..... اور..... جو اپنا وجود تجھ پر قربان کرنا چاہتی تھی۔ ہر وقت تیری طرف داری کرتے ہوئے قلب سے لڑتی..... اس کا ہاتھ اور تو نے جیسے میری محبت دھانسل اور عبادت کے لاتعداد جدوں کا یہ صلہ دیا کہ میرے ماں.....

..... مجھے بے عزت کیا..... ایک گناہ کا بیج میرے تن میں بویا مقدس ماں..... میں اس بوجھ کو اٹھاؤں..... کیونکہ ان وحشی دردندوں کا مقابلہ کروں۔ میں کہاں سے اپنے زخموں پر وجود کے لیے مریم لاؤں۔ مقدس مریم کی بے گناہی دینے والا کون ہے.....“ لیزا روتے ہوئے اس کے بل جھک گئی اور یسوع کے گرد بازو ڈال کر اپنا سر اس کے پیروں پر رکھ دیا۔ لگتا تھا کہ چرچ ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے ہر طرف شور اور ہنگامہ بپا تھا..... مارک بڑی مشکل سے سمجھے ہوئے الفاظ بول رہا تھا۔ ”میں لیزا کو چرچ سے نکال باہر کرنے پر زور دے رہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا پانچ راست قسم کے لوگ اس کے مارک کو دھکیل کر اندر داخل ہوئے اور لیزا کو باہر کھینچ لائے۔

”یسوع..... یسوع مجھے بے سہارا مت رکھیے۔“ چیخ رہی تھی۔ مارک نے زمین پر پڑی بے جان سی لاش کو بازوؤں میں اٹھا لیا تو وہ سسکیاں لینے لگی۔

”اے ہماری نظروں سے دور سے جاؤ۔“ مل منیجر رابرٹ نے نفرت سے کہا۔

”سراختنی! تم سب لوگ میری خاموشی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔“ مارک سلگ اٹھا۔

”ارے جاؤ..... جاؤ..... ہمارا تو خیال ہے کہ مارک قلب ٹھیک کہتا ہے تم لیزا کی اتنی طرف داری کر رہے ہو۔“

”یقیناً“ تمہارا ہے۔“ رابرٹ نے کہا۔

”ہاں..... ہاں..... اس بات کی تو اس کی بہن نے بھی تصدیق کی ہے۔“ ایک آواز ابھری۔

”الاش بیچ ہوتا..... کاش یہ بیچ واقعی میرا ہوتا..... لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ یہ بیچ میرا نہیں تمہارے آقا

نہیں بلکہ خداوند مسیح کا ذکر اور عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آج تم نے اس عبادت گاہ کو اکھاڑا بدل دیا ہے یہ تو وہ جگہ ہے جہاں غیر مذہب کے لوگ آکر پناہ مانگیں تو انہیں بھی امان دے دی جاتی اور تم وہ شیوں نے اپنا ہم مذہب، ایک تیار، ستم زدہ، کمزور لڑکی پر تشدد کیا۔ کل تک یہ لڑکی تمہارے لٹاکو میں دیوی تھی آج تم اسے ٹھوکر میں مار رہے ہو۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ فادر جیک کی ہے وہی فادر جس نے ۲۵ سال تمہاری خدمت کی۔ دکھ دکھ میں شریک رہا۔ اس کے مرتے ہی تم انہیں پھیر لیں۔ "مارک کی دکھ اور غصے بھری آواز گونجی تھی۔

"واؤ! تم تبلیغ کرنے کی کوشش مت کرو۔ اس بدکار لڑکی کی وجہ سے فادر اور اس کی بیوی کو جان پڑی۔" رابرٹ بڑھ چڑھ کر بول رہا تھا۔

"رابرٹ تم بار بار لیزا کو بدکار کہہ رہے ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں اور میرے پاس ہر کے مریض آتے ہیں۔ امیر غریب سب کے راز ہو تے ہیں، ان کی کمزوریاں ہوتی ہیں جن کا ڈاکٹر کو ہوتا ہے رابرٹ تمہاری بھی دو بیٹیاں ہیں اور وہ کتنی نیک اور پارسا ہیں کبھی تم نے یہ جانتے کی کوشش کی۔ اگر تم نہیں جانتے تو مجھ سے پوچھ لیتا فرق ہے تو صرف یہ کہ تم مجھے بے غیرت باپ، اولاد کو کرتوتوں پر پردہ ڈال کر بار سائی کا ڈھونڈ رکھاتے ہیں اور اپنی اولاد کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹانے لیے دوسروں کی بدنامی کی عزت سربا زار اچھالتے ہیں۔ رابرٹ تم ہی نہیں۔ میں اس مجمع میں اسی بہت سے چہرے دیکھ رہا ہوں جو کہ لیزا کو مارنے پینے میں پیش پیش تھے اور اگر میں ان کی بدنامیوں بھانڈے پھیل دوں تو وہ سر جھکا کر یہاں سے نکل بھاگیں گے جو لوگ سب سے زیادہ شور مچا رہے ہیں ان کو بدنامی۔ بیٹیاں اپنی مرضی سے اپنی عزتیں نلام کر آتی ہیں اور یہی لوگ جان بوجھ کر انہیں بدنام کرنے سے روکتے ہیں بغیر لیزا کو تو جبرا "لوٹا گیا ہے۔ لوگو! میں یہی وہ ڈاکٹر مارک ہوں جو تمہاری عزتیں بچانے کے لیے ان گناہ کے بیجوں کو غم مار سے کاٹ کر پھینک دیتا ہوں۔ تم سب لوگ کہتے پانی میں مویں میں جانا ہوں اور اگر اب بھی کسی نے لیزا پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو میں۔۔۔ ان کی بیٹیوں بھٹیوں کے نام سے لے کر ان کے گھناؤنے قصے بیان کروں گا۔" مارک نے سخت لہجے میں دھمکی دی تو کچھ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔

"ڈاکٹر۔ تم کیسی گہرا آواز آتے ہو اور ہمیں بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟" رابرٹ آستین چڑھا ہوا بولا۔ ڈیڈی۔ ڈیڈی پلیز رک جائیے۔ اس کی بیٹی سوزن نے زرد ہو کر باپ کو پکڑ لیا رابرٹ کی نظر میں کے پریشان گھبراہٹ ہوئے چہرے پر پڑی تو وہ غم صم گیا۔

فادر ایوزر غفاری کو ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ جسم پر بدوں والا کسل لینے چلے آ رہے ہیں۔ کسی نے کہا۔ "ایوزر! کل تو تمہارے جسم پر تین لباس تھا وہ کیا ہوا؟" اور نے جواب دیا۔ "ایک جسم سے زیادہ پریشان شخص نے مسلا بر کیا۔ میں نے اسے دے دیا۔" ان شخص نے جواب کا بڑا تاثر لیا "بولو۔" لیکن خدا کی قسم ایوزر وہ شخص تم سے زیادہ پریشان ہرگز نہ ہو گا۔" فادر ایوزر کچھ ناراض سے ہو گئے۔ فرمائے گئے۔ "میں شخص اخلاقیے صاف کرے تو دنیا کو عصمت کی نگاہ میں لے لیکن تو یہ نہیں جانتا کہ سوال کرنے والے کے پاس تو ایسے کسل کا ٹکڑا تک نہ تھا۔ میرے پاس ہیں جن کا دودھ پیتا ہوں مگر میں گھسے ہیں جن سے بار بار داری کا کام لیتا ہوں۔ غلام ہیں جو میرا کام انجام دیتے ایک فائدہ بجا ہے جسے عید، عید، عید کے موقع پر استعمال کرنا ہوتا اور میں خدا سے خوفزدہ رہتا ہوں کہ میں اس کا مجاہد نہ کرے۔" کہتے کہتے حضرت ایوزر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

لوگوں کے ساتھ کینہ بننا پڑتا ہے مگر رابرٹ۔۔۔ اور اگر تم لوگ اسنے ہی غیر متند ہو کہ لیزا کو سزا دے ہو تو جاؤ مت کر کے اپنے مالک فلیپ کو بھی پکڑ لاؤ اور اسے بھی انتہائی مارو، دشمنی کرنا جتنا لیزا کو اسنے میں چرچ کے احاطے میں ایسٹریٹس اور دو کالیں آکر رکھیں۔ ایک کار سے انتہائی دو سری گاڑی ڈاکٹر مارک کی تھی جو ڈیوڈ اور انیو کر کے لایا تھا۔ اسٹریچر پر فادر جیک اور نرسا کی گاڑی لگی۔ لاشوں کو دیکھتے ہی لیزا کے خلاف جوش و خروش ہوئے لگا۔ اصل واقعے کا پتہ چلتے ہی لگنے لگے۔

ایوزر مارک۔۔۔ لوگ قابو سے باہر ہو رہے ہیں تم لیزا کو گھر لے جاؤ۔" سرائٹونی نے گھبرا کر کہا۔ میں۔۔۔ نہیں یہ لڑکی فادر کے گھر میں قدم بھی نہیں رکھے گی۔ ورنہ ہم گھر کو آگ لگا دیں گے۔ اس طرح شور مچا رہے تھے۔ چپے لیزا کا فادر جیک سے کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ وہ چپے فادر کی لاڈلی بیٹی تھی بس یہ جتنے چلاتے دھکی لوگ ہی فادر کے سب کچھ تھے۔

ایوزر جاؤں گی۔۔۔ اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک میرے باپ اور ماں کی لاشیں موجود ہیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے ان کی قبر کو مٹی دوں گی تم سنگدل۔۔۔ ورنہ سے تم پر خدا کا قہر کیوں اڑا رہی! ابھی تم گھر چلی جاؤ ہم آخری رسومات کے لیے تمہیں بلوالیں گے آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ

دے رہی ہوتے ہوئے یہ لوگ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" سرائٹونی نے اسے سمجھایا۔ میں مارنے دیجئے ان لوگوں کو۔۔۔ مت روکیے انہیں۔ مجھے یسوع سے محبت کرنے کی سزا مل رہی ہے جانے دیجئے مجھے۔" وہ چپٹی۔ سرائٹونی اسے فادر جیک کے اجڑے گھر میں چھوڑ کر واپس

چلا گیا۔ مارک نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور اسے صوفے پر بٹھایا۔ اسے جیسے سکتے ہو گیا تو دیواروں کو پھٹی پھٹی نظروں سے گھورے جاری تھی۔ مارک تالیہ گیلیا کر کے لے آیا اور گھٹنوں کے جھک کر نرمی سے اس کے چہرے کو چھوا اور زخم صاف کرنے لگا۔ لیزا کے ہونٹ مسلسل مل رہے تھے اپنے پیارے ماں باپ کی قاتل ہوں۔ صرف میری وجہ سے اتنے پیارے لوگ مر گئے۔ میں ان کی قاتل ہوں۔ قاتل ہوں۔ لیزا نے خون آلود تالیہ مارک سے چھین کے دور پیٹھ تک دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ چہرے میں بے شمار لوگ اکٹھے تھے۔

”بیٹا! بیٹا! لیزا نے گنگے پاؤں چلتی ہوئی بھاگی اور لوگوں کو دھکیلتی ہوئی فادر جیک کی لاش پر جا کر ”بیٹا میرے بیٹا! اپنی لیزا کو کچھ کھنے کا موقع تو دینے اس سے سن تو لیتے کہ وہ کس طرح مر چکی ہے۔ وہ دھڑلے مار مار کر رو رہی تھی اور مارک کے سینے سے سر کر رہی تھی۔

”ڈیوڈ! میری کار میں سے دواؤں والا بیگ نکال لاؤ۔ میں اسے بیہوشی کا انجکشن لگا دوں۔“

بھاگ کر بیک لے آیا تو مارک انجکشن لگانے لگا۔

”نہیں! نہیں! میں انجکشن نہیں لگواؤں گی پہلے فلوپ نے مجھے انجکشن لگوا دیا اور میرا سب کچھ لیا اور اب۔۔۔ تم۔۔۔ تم ڈاکٹر مارک۔۔۔ تم جیسے دینے کے لیے تو میرے پاس کچھ نہیں رہا۔“ وہ زور آواز کرتے لگی تو مارک نے ڈیوڈ کی مدد سے اسے انجکشن لگایا۔

”ڈاکٹر مارک تم زرا غصہ جاؤ ہمیں تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“ ربرٹ اور بیتی کے چند لوگوں نے اسے روکا تو مارک نے ڈیوڈ کے ہمراہ لیزا کو گھر بھیج دیا۔

”ڈاکٹر مارک۔۔۔ یہاں سب لوگ لیزا سے سخت خفق ہو گئے ہیں وہی ابھی بت کم لوگوں کو۔۔۔ ہے لیکن صبح ہوتے ہی یہ بات ہر خاص و عام کی زبان پر ہو گئی اور مشتعل لوگوں کے ہاتھوں لیزا کو دھار ہو گا ایسی حالت میں کوئی بھی چوٹ اس کے لیے نقصان دہ اور جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ عام فادر جیکب سے والمانہ عقیدت تھی۔ وہ لیزا کو فادر کی بیٹی نہیں بلکہ قاتل سمجھ کر حملہ کریں گے اس ہمارا مشورہ ہے کہ تم لیزا کو گھر میں رکھنا اور تدفین پر نہ آنے دینا۔ اب بھی سرائفٹنی کی وجہ سے لوگ خاموش ہیں اس کے علاوہ کل نیپادری بھی آجائے گا اس کے لیے گھر خالی کرنا پڑے گا۔ تم لیزا کی رہائی کا بندوبست کرو۔“

”سٹرا ربرٹ ہائسل کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا لیکن میں لیزا کو قبرستان جانے سے کیسے روک سکتا ہوں یہ تو ظلم ہے کہ وہ آخری بار اپنے ماں باپ کی شکل بھی نہ دیکھ سکے؟“

”فہ اس کی شکل کتنی معصوم اور بھولی بھائی ہے جاؤ لڑکی جاؤ۔ ایک بار مروے کو زمین کے کر دیا جائے تو دوبارہ نہیں نکلا جائیے تمہیں تمہارے کرتوتوں کی سزا ملی ہے۔“

”تم تم ایک ادنیٰ انسان..... تم کون ہوتے ہو میرے لیے سزا تجویز کرنے والے۔ تم کم اندھے ہو ہٹ جاؤ میرے راستے سے تم چپا مٹی کی شکل ضرور دیکھو گی۔“ لیزا نے پادری کو زور دھکا دیا اور قبریں اترنے لگی۔

”رک جاؤ..... پتھر اس بد بخت لڑکی کو؟“ قادر زمین سے اٹھتا ہوا غصے سے بولا۔ چند مردوں کو بڑی بے دردی سے کیچھا اور قبر سے پرے دھکیل دیا تو مارک نے اسے سنبھال لیا۔

”مارک..... مارک تم بھی مجھے ختم چھوڑ کر یہاں چلے آئے ہو۔ دیکھو یہ لوگ کتنا ظلم کر رہے ہیں یسوع مسیح کا واسطہ ان سے کو صرف ایک بار مجھے عزیز انا جان چرے دیکھ لینے دیں پھر جان بھوکے درندے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔“ وہ نہیں کرنے لگی۔

”ڈاکٹر اس لڑکی کو یہاں سے لے جاؤ یہ تدفین میں رکاوٹ ڈال رہی ہے۔ لڑکی تمہیں خداوند نے سزا دی ہے اور اب تم اپنے والدین کا چہرہ نہ دیکھ سکو گی اور تمام عمر احساسِ ندامت میں رہو گی۔“

”قادر یسوع کے نام کو بدنام مت کرو۔ وہ دنیا میں محبت بھائی چارے اور رحم کی تبلیغ کرتا رہا۔ میں کس جگہ لکھا ہے کہ مجبوروں اور یتیموں پرستم و ہذا؟ قادر جیکب پچیس سال ہمارے ساتھ رہا نے تو کبھی کسی سے سختی سے بات نہیں کی تھی کسی کا دل نہیں دھکیلا تھا لیکن تم..... تمہیں ہماری ہمت آنے ابھی ایک ہی دن ہوا ہے اور تم اتنے روکے کرخت لہجے میں بات کر رہے ہو۔ یہ لہجہ کسی مذہبی کے لیے مناسب نہیں ہے..... اور پھر ہم کیا تم کو ہوتے ہیں کسی انسان کے لیے سزا تجویز کرنے والا خداوند اور بندے کا معاملہ ہے وہی یوم حساب اس کا فیصلہ کرے گا۔“ بوڑھا ڈیوڈ پھر اٹھا۔

”میں نہیں جاؤں گی..... کبھی نہیں جاؤں گی۔“ لیزا پتھروں سے سر ٹکراتے ہوئے لگی مارک نے اسے قہار وہ تو بالکل دیوانی ہو رہی تھی۔ قادر کے اشارے پر لوگ جلدی جلدی قبروں پر مٹی پھینکتے لگے اور لیزا چنچیں دلوں کو دہرا رہی تھیں۔

”یسوع مسیح! آج مجھے تیرے نام سے بھی نفرت ہو گئی تو بے حس اور ظالم ہے۔ واقعی تو جانے تیرے اختیار میں کچھ نہیں۔ واقعی میں بالکل ختمی ہو چکے لو دماغ میں بے بسی مٹی۔ تو نے میرا رب کو کیا مجھے بے سہارا چھوڑ دیا۔ میری ریا تنوں عبادتوں کا یہ صلہ دیا ہے۔ آج اگر تو میرے سامنے ہوتا تو

داروینی ہاں قلم ٹھیک کھتا تھا تو ایک کھلوتا ہے اور میں چرچ میں بچے سب کھلوتے تو ڈالوں گی ریزہ ریزہ کر دوں گی آج سے تیرا میرا ہر ثا ٹوٹ گیا۔“ وہ دیوانی کے عالم میں چنچتی ہوئی چرچ کی مہا کی۔ قادر اور کئی لوگ اس کے پیچھے دوڑ پڑے وہ بھاگتی ہوئی ہال میں داخل ہو کر سیدھی اسٹیج پر لی اور دونوں ہاتھوں سے زور لگا لگا کر اپنی پسندیدہ صلیب کو اکھاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ بارہفت اور آٹھ فٹ چوڑی بے حد ذہنی صلیب آدھا ناچ بھی ادھر ادھر نہیں ہوئی۔

”ہاں اس کا فر ولحون لڑکی۔ اس نے مقدس ماں اور عظیم کرا سن کی شان میں گستاخی کی ہے۔“

لیا اواز پر کئی ہاتھ اس کی جانب برسے۔

لیا مارک اس کا فر لڑکی کو یہاں سے لے جاؤ۔ آئندہ اس نے چرچ کا رخ بھی کیا تو اسے کڑی سزا ملے گی۔“ قادر نے غصے سے چیخے ہوئے کہا۔ پھر مارک اور ڈیوڈ بمشکل لیزا کو لے کر گھر پہنچے اس کی راری نے آسمان کو بھی بھلا دیا تھا کیا ایک شہید بارش شروع ہو گئی تھی۔ لیزا ماں باپ کے کپڑے کے استعمال کی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر چوم چوم کر دیوانی ہو رہی تھی پھر مارک نے زبردستی لیزا کو غیند کی گھا کر سلا دیا۔

”اب تو ہم مس کے پاس بیٹھے۔“ ڈیوڈ نے مارک کو زبردستی سونے کے لیے بھیجا۔

..... ڈیوڈ لیزا کہاں ہے؟“ صبح مارک نے اسے بری طرح جھنجھوڑا وہ بو کھلا کر اٹھا۔ لیزا کا بستر

کا! اکیس مس چرچ تو نہیں چلا گیا۔ اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہو گا وہ نیا پادری بہت سخت گیر آدمی دونوں دوڑتے ہوئے باہر نکلتے ہی تھے کہ ٹھٹھک گئے سامنے سے قادر ڈیوڈ، چند آدمیوں کے اہلکاران میں سے ایک کچھ، مٹی میں لپٹ کر لیزا کو اٹھائے ہوئے تھا۔

لیا سنبھالو اسے..... یہ لڑکی تو ہمارے لیے مصیبت بن گئی ہے۔ اس کعبت نے رات کو قادر اور لیزا کی قبریں کھود ڈالیں تابوت کھول دیے اور ان کی لاشوں سے لپٹ کر چنچیں مارتی رہی۔“

..... سے بتایا۔

لیا اسے تو بہت تیز بخار ہے۔“ مارک اسے سنبھالتے ہوئے گھبرا گیا۔

لیا تو اس بننے والی ہے دوسرے رات کو شہید ہوناف میں بھیجی رہی ہے اس لیے بخار تو ہونا ہی تھا مارک آج میرا سامان آجائے گا تم فوراً مکان خالی کر دو۔“ قادر نے حکم دیا۔ مارک نے اس اوپر ہاتھ کئے کرخت چہرے والے پادری کو بخور دیکھا پھر لیزا کو اٹھا کر مڑ گیا۔ اور اسی دن وہ لیزا اور

ڈیوڈ کے ساتھ اپنے پہاڑی بچکے میں منتقل ہو گیا۔ لیزا کو گھٹل لگ گئی تھی وہ پہلے ہی بیمار رہنے کی کزور ہو گئی تھی اب بیماری کا حملہ ہوا تو بالکل ڈھے کر رہ گئی تھی۔ دو ہفتے تک وہ ہسپتال میں رہی۔ ڈیوڈ اور مارک ڈیوڈیاں بدل بدل کر نینداری کرتے رہے۔ بخار تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا لیزا لیجی تو کھٹی کھٹی خرخرات کی آواز کمرے میں بجھل جاتی تھی۔ مارک مایوسیوں کے گھرے ہنس پھنس گیا تھا۔ موت کا ہسپتال بے رحم سایہ لیزا کے وجود کو اپنے گھرے میں لے رہا تھا۔ لیکن آج حیرت انگیز طور پر لیزا نے آنکھ کھولی۔ اس وقت مارک اور ڈیوڈ دونوں قریب بیٹھے ہوئے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔

”مارک“ لیزا نے لرزتی ہوئی آواز میں پکارا تو مارک کے ہاتھ سے کپ پھوٹ گیا۔ وہ حیران پھر بے اختیار جھکا۔

”لیزا! لیزا تم ہوش میں ہو۔“

”ہاں مارک! انوسیک حادثہ ہو گیا ہے۔“ وہ اس کا بازو تھام کر مسکرائی

”جس کو حادثہ ہونا تھا ہو گیا ہے۔ ایک ہفتہ پہلے ماسٹر فلپ اور ایشیا شادی ہو گیا۔ اور کپوڈر جان ٹرین کے نیچے آکر ٹمرا ہے۔“

”نہیں! ڈیوڈ کچھ اور بھی ہو گیا ہے۔“ وہ آہستہ سے ہنسی تو مارک نے پریشان ہو کر دیکھا۔

”ہیان تک رہی ہے؟ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا یا پروردہ آئے زور زور سے بجھا اور پھر پریشان حال اپنے بیٹوں بھائیوں کے ساتھ اندر آیا ڈیوڈ اور مارک حیران رہ گئے۔

”مر آپ اور یہاں....؟“ مارک نے پوچھا۔

”ہاں مارک! میرے بیٹے فلپ کو اس کی کٹنی کا پھل مل گیا ہے۔ لیزا کی بات سچ نکلی ہم زیادہ یہ کہتے تھے سرائقو جیسا مضبوط اعصاب والا انسان بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”پرسوں ایشیا اور فلپ کا ایکسینٹ ہو گیا۔ جس میں ایشیا تو ختم ہو گئی اور فلپ زخمی ہو گیا۔ اور ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ.... اب.... فلپ کبھی باپ نہیں بن سکے گا.... لیزا بیٹی! تم میرے بچے کی ماں بننے والی ہو اب تم ہی میرے خاندان اور میری نسل کو مننے سے بچا سکتی ہو۔ فلپ سب کچھ بتا دیا ہے وہ کہتا ہے کہ تم بچک ایک نیک لڑکی ہو.... واقعی تم پر کرا سنٹ کی رحمت خداوند پر ایمان لاتا ہوں تم مجھے معاف کر دو اور اسے قبول کر لو“

لیزا وہ تم سے شادی کر لے گا....“ سرائقو نے تیزی سے جھک کے لیزا کے پاؤں پکڑ لیے۔

ال انسانی طاقت حلول کر گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنے پاؤں چمڑائے اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

موت ہو لیے سرائقو! فلپ نے تو اب آپ کے سامنے میری عزت لوٹنے کا اعتراف کیا ہے آپ تو کمرس والے دن بھی میری چٹائی کے قائل ہو گئے تھے آپ جانتے تھے کہ میں جھوٹی ہوں لیکن اپنے بیٹے کو بے نقاب نہیں کیا.... گناہ گار آپ کا بیٹا تھا اور پھر میں نے کہا۔ علاوہ

اسے والدین کی جان گئی۔ سرائقو میں تمہارے بیٹے کے بچے کی ماں بننے والی تھی لیکن تم نے اپنے بچے کی جگہ بچانے کی کوشش نہ کی اور آج.... آج جب تمہاری اپنی نسل مٹ رہی ہے تو تم

اڑاں پکڑنے آگئے؟ لیکن سرائقو اب بہت دیر ہو گئی.... میں نے اس دن کہا تھا کہ آج فرشتوں سے تمہارے خاندان کا نام مٹ جائے گا.... اب تم.... لوگ تقدیر کے اٹل فیصلے کو اس طرح

جس طرح میں نے قبول کیا ہے۔“ وہ عالم دیوانگی میں زور زور سے بولے جاری تھی اور جلال ہرے سے نچک رہا تھا۔ مارک دم بخود کھڑا تھا بہن کی موت کی خبر سن کر بھی اس کی آنکھیں خشک

سرائقو نے اس کے بھائیوں نے ہزار فٹیں کیں ”لیزا کے پاؤں پکڑ لیے لیکن ان کی ساری اس رائیگاں گئیں لیزا کے ہونٹوں پر بس ایک ہی فقرہ تھا.... ”بہت دیر ہو چکی ہے تقدیر کے لکھے کو

اس میں بدل سکتا۔“ سرائقو پاپس ہو کر جاتے جاتے ڈیوڈ اور مارک کی فٹیں کرنے لگا کہ لیزا کو

مارک اور ڈیوڈ جب انھیں باہر تک چھوڑ کر واپس آئے تو لیزا ہسپتال موجود نہیں تھی۔ وہ گھبرا

نے لگا۔ بڑے کمرے میں دیوار پر نصب یسوع کی بڑی سی تصویر کے سامنے.... لیزا دوڑا تو جھکی

کرے صبح.... مجھے معاف کر دو.... میں بھٹک گئی تھی اور تیری محبت پر شبہ کر بیٹھی

خداوند نے یہ میرے مقدر میں لکھا تھا کہ فلپ جیسا مدھیے پال کرے.... لیکن یسوع تو ہر

کے ساتھ رہا اور مجھے پتہ نہ چلا.... تو نے پہلے بھی فلپ کو سزا دی تھی اور اب بھی تو نے اس سے

عزلی کا انتقام لیا.... اے یسوع میں تیری پکاراں تجھ سے آخری التجا کرتی ہوں کہ تو مجھے اپنے

دل میں بہت بار بچی ہوں بہت تھک چکی ہوں.... مجھ میں اب اس ظالم سانج کا مقابلہ کرنے کی

طاقت ہے۔“ وہ روتے روتے غمناک ہو گئی تو مارک اسے سہارا دے کر کمرے میں لے آیا۔

تم جانتے ہو کہ میں انسانوں کو دیکھ کر تڑپ اٹھتی تھی میں کسی کا برا نہیں چاہتی تھی.... مگر اس

تمہاری منت کرتی ہوں کہ مجھے ابھی اور اسی وقت چرچ لے چلو۔“ لیزا مارک کے ہاتھ پکڑ کر

”لیزا مجھے افسوس ہے میں تمہیں چرچ نہیں لے جاسکتا۔ فادر نے سختی سے منع کیا ہے۔“
 ایسی ہی بولا۔

”فادر کون ہوتا ہے مجھے یسوع مسیح کے گھر جانے سے روکنے والا۔ تم نہیں لے جاؤ گے تو میں جاؤں گی۔“ لیزا کی سانس دھونکتی کی طرح چل رہی تھی۔ اس کے قدموں سے لڑکھائیت عیاں تھی۔
 ”اچھا! لیزا کل چلیں گے۔ آج تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔“ مارک کو لیزا بچتے دیکھ کر
 طرح لگ رہی تھی۔

”نہیں مارک میرے پاس وقت نہیں ہے۔۔۔ اب کوئی اور کل میری زندگی میں نہیں آئے گا۔“
 صلیب جسے بچپن سے اب تک میں اپنے ہاتھوں سے صاف کرتی رہی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اس
 قدموں میں جان دوں۔۔۔ چلو مارک ضد مت کرو۔“

محزوزہ سامارک اور ڈیوڈ اسے کار میں لے کر چرچ پہنچے۔ شام کے دھندلے سارے چاروں طرف
 چمکتے تھے ہر طرف عجیب سا سناٹا بکھرا ہوا تھا، موسم کے تیور بھی زیادہ خطرناک نظر آتے ہیں۔
 میں داخل ہوئی رہے تھے کہ ایک دم فادر ڈیوڈ بیل کے گھر کا دروازہ کھلا اور وہ باہر گیا۔ لیزا نے ایک
 ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور آگے بڑھتی چلی لیکن مارک اور ڈیوڈ کے قدموں کو جیسے زمین نے جکڑ لیا
 ”غصہ جاؤ۔“ فادر کی گرد آواز گونجی لیکن لیزا کے قدم آگے بڑھتے گئے یوں لگتا تھا کہ وہ اس
 ذہنی اور روحانی طور پر عالم بالا میں پہنچی ہوئی ہے لیزا چرچ میں داخل ہوئی تو فادر دوڑ کر اس کا ہاتھ
 باہر کھینچنے لگا۔

”تم اپنے ناپاک قدم اس مقدس جگہ پر نہیں رکھ سکتیں۔“ وہ گرجا۔
 ”اگر میں اندر نہیں جاسکتی تو پھر پادری تم مقدس مریم کا مجسمہ بھی باہر نکال بھیجیو۔“ وہ
 سے بولی۔

”کیا کیوسا کر رہی ہو تم؟“ فادر گرجا۔
 ”کیوسا نہیں حقیقت بیان کر رہی ہوں مریم بھی ماں ہی تھی اور میں بھی ماں بننے والی ہوں
 عفت کی گواہی خود یسوع نے دی تھی۔ میری بے گناہی کی گواہی بھی وہی دے گا۔“ وہ یقین سے بولی
 ”تم..... تم ایک بد چلن، کسینی لڑکی خود کو مقدس مریم سے ملنا رہی ہو؟“ فادر غصے سے پکپکا کر
 ”نہیں..... میں تو ان کی خاک پا بھی نہیں ہوں۔ لیکن پادری تم ماہ پرست لوگ عشق و محبت
 جنوں کی ان محفلوں سے نہیں گزر رہے جن سے میں گرجا چکی ہوں۔ اس لیے تم میری باتوں کو نہیں

میرے راستے سے ہٹ جاؤ اور مجھے اندر جانے دو اسی میں تمہاری بہتری ہے۔“ لیزا فادر کی
 اس میں آنکھیں ڈال کر عجیب سے محرزہ لہجے میں بولی۔

الٹا رخ بے ادب لڑکی..... میں تمہیں ایسی کڑی سزا دوں گا کہ تم زندگی بھر یاد کرو گی میں ابھی بستی کے
 کو اکٹھا کرتا ہوں۔“ پادری نے بڑھ کر زور سے رسا کھینچا تو کئی من و زنی کھنڈہ زور زور سے بچتے
 ساری بستی گونج اٹھی بند دروازے کھلے گئے لوگ گھروں سے باہر نکل کر چرچ کے وسیع احاطے میں
 گئے..... فادر بیڑھیوں پر چڑھ گیا اور دونوں ہاتھ اونچے کر کے لوگوں کو اشارا کیا..... لیزا بھی آہستہ
 بیڑھیوں پر چڑھی پادری کے برابر کڑی ہو گئی ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعیں اس کے چہرے کو
 لگیں اس کے چہرے پر سکون اور عزم تھا..... پادری نے نفرت سے اسے دیکھا اور لوگوں سے

لوگو! تمہیں سارے حقائق اور واقعات کا بخوبی علم ہے۔ لیزا کو چرچ میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔
 ان چرچ آئی اور میں نے اسے اندر آنے سے روکا تو کفر کینے لگی۔ کتنے گلی اگر میں اندر نہیں
 تو تم مریم کا مجسمہ بھی اٹھا کر باہر پھینک دو۔ وہ بھی کتواری ماں تھی اور میں بھی کتواری ماں
 یسوع میری پادری کی بھی گواہی دے گا۔ یہ بد بخت خود کو مقدس مریم کا رتبہ دے رہی ہے اس
 میں یوحنا جاری ہیں۔ اس پر شیطان نے قبضہ کر لیا ہے۔ اگر یہ لڑکی ہماری بستی میں رہی تو
 اور چرچ کے لیے خطرہ بن جائے گی..... میں نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے اب تم ہی اس کا فیصلہ
 پادری گرج گرج کر بول رہا تھا۔ اور لیزا کے ہونٹوں پر پر سکون مسکان بکھری ہوئی تھی۔

اور..... ماردا سے دین کا قفر کو مارو۔“ لوگوں کا جوش بڑھنے لگا۔
 اور..... اے لوگو اب تم میرے تن کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکو گے۔ جو گستاخ وحشی ہاتھ میرے بدن
 پر مارا وہ ملعون ہو جائے گا جس نے مجھے مارا وہ کوڑھی ہو جائے گا۔“ اور پھر اس بڑھتے ہوئے
 میں لیزا کے چہرے کے گرد ایک روشن ہالہ سا بگڑیا۔ اس پاس ایک نرم زم بھڑی سج روشنی پھیل
 اٹھائی گئی۔

یہ بستی والو! تم نے آج مجھ پر سیس اور خدا کے دروازے بند کر دیے ہیں لیکن میرے لیے
 خدا دروازہ اپنے دل کے دروازے کھول دیے ہیں..... وہاں جانے سے کون سا پادری مجھے
 کا..... غلامو! تم مجھے یسوع کی صلیب تک نہیں جانے دے رہے ہو اور اگر وہ صلیب خود مجھ
 کی تو دنیا کی کون سی طاقت اسے روک سکے گی؟ بتاؤ مجھے۔“ لوگ دم بخود کھڑے تھے پھر لیزا

میزبوں سے نیچے اتری اور گم صم کھڑے مارک اور ڈیوڈ کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکلے گئی۔ عجیب سا رنگ
بدبہ اس کی شخصیت سے ٹپک رہا تھا بھرے شور مچا رہے تھے جو جیسے سانپ سو گھ گیا تھا۔ مارک
لیزاکے دائیں بائیں ڈرے ڈرے سے چل رہے تھے لوگ خود بخود دو دو بہ ہو کر انھیں راستہ
لیزا جہاں جہاں سے گزرتی۔۔۔ لوگوں کی گردنیں ان کے ساتھ ساتھ گھومتی جاتی تھیں۔۔۔ لیزا کا رنگ
سے پہلے رکی دونوں ہاتھ بندھے کی اور پراسرار آوازیں بولی۔

”یسوع مسیح میری آرزو تھی کہ آج میرا دم تیرے قدموں میں لگتا۔۔۔ لیکن تیرے ان بندوں
تیرے دیدار سے محروم رکھا ہے مگر اے میرے مسیح تو مجھے مایوس نہ کرنا۔ اپنے دیدار سے محروم
کرنا۔“ اچانک بجلی جیسی دل ہلا دینے والا ترنا اٹھا ہوا۔ وہاں موجود کی افرادی جینیں نکل گئیں۔
مارک نے سہارا دے کر کار میں بٹھایا جب وہ گھر پہنچے تو مولادھار پاش شروع ہوئی تھی۔۔۔ مارک
بڑی کوشش کی کہ لیزا آرام کر لے لیکن اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

”مارک اب تو سب کچھ ختم ہونے والا ہے اب تم مجھے مت روکو۔ یہاں آؤ مارک۔۔۔“
پیارے مارک کا تھکا تھکا چہرہ ہاتھوں کے کٹوروں میں تمام کر اے۔ بخود دیکھتی رہی پھر نہایت
اپنے تپتے ہوٹ مارک کی پیشانی پر رکھ دیے۔ ”مارک تم نے میرے ساتھ بہت نیکیاں کی ہیں
میرا ساتھ دیا ہے، خدا تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔ مارک! بچے پیار کرنے والوں کو خدا اپنے
میں دوسری دنیا میں تمہاری منتھن رویوں کی جب تم آؤ گے تو میں دونوں بائیں پہیلا کر تمہارا
کروں گی۔ جاؤ مارک! اب تم مجھے تنہا چھو ڈو۔“ لیزا اٹھ کر مسیح کی تصویر کے سامنے جھک گئی۔
دروازہ بند کر کے باہر چلا گیا۔

”ڈاکٹر! رات کے تقریباً تین بجے ڈیوڈ نے اسے بری طرح جھنجھوڑا۔ تو وہ کمر
بٹھا۔ ”ڈاکٹر! مس کے کمرے سے عجیب عجیب قسم کی آوازیں آ رہی ہیں۔ جیسے بہت سے لوگ
گیت گارے ہوں۔“ وہ دونوں دوڑتے ہوئے کمرے تک پہنچے تو واقعی کمرے سے خاصی بلند
آ رہی تھیں مارک تیزی سے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ایک دم سکوت سا طاری ہو گیا اس
اور خوفزدہ ہو کر ارد گرد دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر وہ آوازیں۔۔۔؟ لیزا فرش پر اونچے ہاتھ
مارک نے اسے سیدھا کیا۔۔۔ اس کا جسم تپ رہا تھا، ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے اور سانس رک رک
تھی۔ مارک نے اسے اٹھایا چاہا لیکن لیزا نے اسے اشارے سے روک دیا۔

”نہیں مارک مجھے مسیح کی تصویر کے سامنے پڑا رہنے دو لیکن مارک میں اس بڑی صلیب کے

اٹھانے پہل شاہجہاں پوری اپنا دیوانہ شائع کرانے کی فکر میں تھے لیکن نام کچھ اس طرح رکھا جاتے تھے کہ کسی
طرز پر ان کا تخلص بیکل ضرور آجائے۔ اسی دوران ان کے ایک دوست ان سے ملنے آئے۔ دوست نے
اس کو فکر مند دیکھا تو دریافت کیا۔ ”کیا بات ہے مولانا؟ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“ مولانا بیکل نے جواب
دیا ”اپنی اپنا دیوانہ مرتب کر چکا ہوں اسے بچھانے کا پروگرام ہے لیکن مجھ میں نہیں آتا کہ اس کا نام کیا
رہے۔“

”نہیں جواب دیا۔“ اس میں فکر کی کیا بات ہے کوئی بھلا سا نام رکھ لے۔“
”نام؟“ نام اپنے تخلص کی رعایت سے رکھنا چاہتا ہوں، جیسے فانی بایونی نے اپنے مجموعہ کلام کا نام
فانی رکھا۔ اور بخور دہلوی نے ہادیہ رکھا تھا۔“
”اس کے دوست نے فوراً جواب دیا۔“ اس لحاظ سے آپ کے مجموعہ کلام کا نام ”مرغ نعل“ بہت اچھا

اجا ہوتا ہوں۔ مجھے چرچ لے چلو ورنہ میری جان نہیں لگے گی۔“ وہ تڑپا۔
”را! میں وہاں تمہیں کیسے لے جاؤں پادری بہت ظالم اور سنگدل ہے۔“ مارک جان چکا تھا کہ لیزا کا
رفتہ قریب ہے۔

مارک تم نے بیش میری ہر بات مانی ہے اب آخری خواہش کو کیوں ٹھکرا رہے ہو میں جاں کنی کے
بیکل ہوں۔ مجھے لے چلو۔“ اس کا سانس اٹھنے لگا۔

لیزا ڈاکٹر مارک! جا کر پادری سے بات کرو اسے سمجھانے کی کوشش کرو۔ ”ڈیوڈ نے مارک کو
اس کی طرف دھکیلا وہ دوڑتا ہوا باہر چلا گیا ڈیوڈ نیچے فرش پر بیٹھ گیا اور لیزا کا ہاتھ تمام لیا۔
”اے! گاؤ بلس یو (God Bless You) میں تمہارے لیے دعا کروں گی تم ایک نیک اور سچے
انسان ہو۔“ وہ بیشکل مسکرائی مارک دوڑتا ہوا چرچ پہنچا اور اس نے فادر کو راضی کرنے کی ہر ممکن
کوشش کی، یسوع مسیح کی دہائیاں دیں لیکن فادر نے سختی سے انکار کر دیا اور ابھتی ہوئی موسم بیٹوں کو
سے دوبارہ جلاتا رہا۔

لیزا! اگر تم نے لیزا کو یہاں آنے کی اجازت نہ دی تو میں اس صلیب کو یہاں سے اکھیر کر لے جاؤں
مارک مایوس ہو کر چرچ اٹھا تو فادر غصے سے مڑا۔

لیزا! مارک تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ تم ایک کمزور ادنیٰ انسان اس دیو قامت وزنی صلیب کو اکھاڑ
لے جاؤ گے اسے تو پتہ نہیں آدمی نہیں اٹھا سکتے۔“ یکدم زور سے بجلی جیسی اور ایسا ترنا اٹھا ہوا
ان کے درویدوار تک تھا اٹھنے۔۔۔ فادر نے گھبرا کر زور سے دعا پڑھتے ہوئے سینے پر کراس بنایا
مارک مرے مرے قدموں سے واپس پٹا۔ طوفان نے شرت اختیار کر لی تھی۔ درخت جڑوں سے

اکثر اکڑ کر گر رہے تھے۔۔۔۔۔ گر بے کاٹھنہ بچے جا رہا تھا۔ بدحواس گھبرائے ہوئے لوگ گرہا کے بھاگے۔۔۔۔۔ بارش سے شرابور حیران، پریشان جب وہ گرے میں داخل ہوئے تو چونک اٹھے۔۔۔۔۔ اپنی جگہ سے غائب تھی اور خالی دیوار کے سامنے فادر ڈیبل سر بہرہ تھا۔

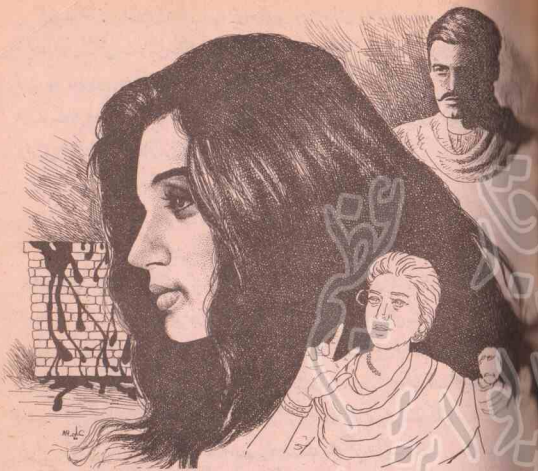
”فادر فادر کیا بات ہے؟“ مکی آواز میں ایک ساتھ ابھریں۔

”لوگو! لیزا چچی تھی۔۔۔۔۔ اس کی بے گناہی اور پارسانی کی گواہی یسوع مسیح نے خود دی ہے۔۔۔۔۔ کو مسیح کے گھر آنے سے روکا تھا تو مسیح ناراض ہو گیا اور وہ صلیب جو صدیوں سے اس چرچ کی تھی۔۔۔۔۔ ابھی ابھی اچانک میری آنکھوں کے سامنے غائب ہو گئی ہے۔ اے مکی، اے مقدس ماں! بیٹے ہمیں معاف کر دے۔۔۔۔۔ لوگو! لیزا کوئی معمولی لڑکی نہیں وہ سینٹ Saint ہے۔۔۔۔۔ اے بستی! چل کر سینٹ لیزا سے معافی مانگو۔۔۔۔۔ چلو۔“

مارک ابھی گیٹ تک ہی پہنچا تھا کہ ڈیوڈ بھاگتا ہوا آکر مارک سے لپٹ گیا۔ اے اپنی آنکھوں میں نہیں آ رہا تھا۔

”ڈاکٹر! ڈاکٹر! دیکھو تو سہی یہ کیا معجزہ رونما ہو گیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے انگلی سے پائیں باغ کی طرف اشارہ کیا۔ مارک نے ادھر دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا کہ صلیب باغ کے پتوں میں چمک رہی تھی اور صلیب کے قدموں سے لپٹی لیزا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس تیز رو آواز بھی دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

”ڈاکٹر! میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ تمہارے جانے کے تھوڑی دیر بعد اچانک مس تم آ گئے۔“ کی صدا بلند کرتے ہوئے باہر دوڑیں تو ہم بھی ان کے پیچھے دوڑے آئے تو ہماری آنکھوں کی چمکی رہ گئیں یہ بڑی سنہری صلیب یہاں کڑی ہوئی تھی اور مس اس سے چسپی ہوئی تھیں اور اس سے زیادہ انسانی بات تو یہ ہے کہ یسوع مسیح دھیرے سے صلیب سے اتر کر لیزا پر چھکا اس شفقت سے ہاتھ پھیرا تو مس اطمینان کے گرے گرے سانس لینے لگیں اور مسیح میری نظر اوچھل ہو گئے لیکن دیکھو ڈاکٹر! میں ابھی تک یسوع مسیح کی قدموں میں پڑی ہے۔“ مارک نے اپنے اعصاب کو قابو میں کیا اور لیزا کو اٹھانے کے لئے آگے بڑھا لیکن اسے چھوتے ہی مارک لگا۔ لیزا کا جسم ساکت ہو گیا تھا وہ اپنی پسندیدہ سنہری صلیب پر حضرت عیسیٰ کے قدموں میں ہی رہا تھی اسے اب کوئی یسوع مسیح اور سنہری صلیب سے جدا نہیں کر سکتا تھا۔



الاول والا

سانپ بھی سر جھانڈے اور لائی بھی نہ دھینڈے۔ ”یہ تمام زندگی کی ہی سو چھترہ اور بیسویں کی عمر گزر گئی، کتنی سوچیں باپ کا اس معصوم بیٹی کی زندگی کا احوال جو بچہ تھا۔

جیتتی اور مرتی رہی

زاہدہ پروین



”اگر کیں اور..... عقل خراب ہوئی ہے کیا ہماری! بڑے آئے تھے چیز طلب کرنے والے اور
اب ملے ہیں صاحبیاں مانگنے..... مارے ٹھوکروں کے بھیجنے اور دلوں کا سالن کا ایک منگے کہیں کے۔
اٹھنا کر بارواں میں کیوں نہیں نکل جاتے..... دیکھتے والے بہت بھیک ڈال دیں گے جھولی
..... لا حول ولاقوتہ۔“

وہ غامضی دیر تک مثل مثل کراہی قسم کے زہریلے خیالات کا اظہار کر کے بیوی کا کلبہ چھیدتے اور
اس کی لیے رنجی سے اس کے آنسوؤں میں اضافہ کرتے رہے۔ اچانک ان کی ذہنی رو بہک گئی۔ شلٹے
اور رخت کے قریب رک کر چٹکوں پرکوں روتی بیوی کے بنتے بگھڑتے نقوش بغور دیکھتے ہوئے کڑک کر
.....

”مالی کی میت پر پچھاڑیں کھائے والی عورت! اب یہ بین بند کر دے۔ آج تیرے لاٹھے بچھنے کے
کے پھول نہیں کھل رہے بلکہ اس کے جنازے کی تیاریاں.....“

”ہائے میں مرجاؤں میاں صاحب! ایسی بدفال!“ وہ گھائل پیچھی کی طرح ہلبلا کر ان کے پیر پکڑنے
اور منقصاب صفت میاں نے ایک زوردار ٹھوکرا سے رسید کر لی اور وہ پکٹے فرش پر پھلتی تخت کے
..... غرا گئے لیکن اس کی حالت زار دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ ندرت ہمیشہ کی طرح میاں کی بھیڑی
..... ہو کر کمرے میں جا چکی تھی اور اب دروازے سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میاں صاحب
ایک پاؤں تخت پر رکھا اور تخت پر سے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولے۔

”اب میں ایک آنسو بھی برداشت نہیں کر سکتا اور کان کھول کے سن لے! آج سے تیرا ناخبر بھائی
..... لیے مرجکا۔ اس کا ہم پر اور ہمارا اس پر کوئی حق نہیں رہا۔ ہمارے دروازے، آنا جانا، بول چال
..... ان کی اور انھیں ہماری غی خوشی سے کوئی مطلب نہیں۔ وہاں کوئی موت ہو جائے ہم نہیں
..... اور یہاں، اس دلہیز کے اندر اگر تو مرجائے تو وہ تیرے جتنا زور کو کا نہ دے گا۔“
..... بعد ان کے کسی چھوٹے سے چھوٹے بچے بلکہ ان کے گھر کے کتے نے بھی میرے گھر میں قدم رکھا
..... جس چیز پر بھیک دوں گا سالوں کی اور اگر..... تو نے یہ دلہیز یا نہ کرنے کی کوکشی کی تو تیری سزا طلاق
..... ہو! منظور ہے۔ اگر بھائی بچھتے بہت یاد آ رہے ہوں تو دوسے دوں ابھی مل..... لاق.....“

..... سم تخت پر سہارا لیے ہوئے بیٹھی گھڑی کا سر مشقی انداز میں زور زور سے ہلکے لگا کر مارے رقت
..... کے زبان سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔ قوت گویا جیسے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکی تھی۔
..... تو پھر ٹھیک ہے۔“ میاں صاحب..... ٹھیک ہو کر پنے تے قدم اٹھاتے ہوئے بھٹک کر راہ گھر سے

”ارے کمال کرتے ہیں مولانا آپ بھی۔ میں اور بھلا اس جفاکاری بے لے کے لڑکے کی شادی
شرکت کروں! عقل کے ناخن لیجئے۔“ میاں صاحب نے پاٹ وار آواز میں اعلان کیا۔ منہ میں دلی
کو چند بار زور زور سے پکچا پکچا ناخ سے سارا مغلیہ انگلند میں تھوک دیا۔ گزشتہ گھنٹے گھر سے
کرنے کے باوجود مٹکے کی مسجد کے پیش امام چراغ دین کو اب بھی جانے کون سی امید تھی۔ اپنی
آوازیں ایک بار پھر استغفار کر بیٹھے۔

”تو یہ آپ کا قطعی اور آخری فیصلہ ہے؟“
میاں صاحب کو تو جیسے پچھوئے ڈک مار دیا اپنی نشست سے دوبارہ ایک کر غرائے۔
”اجی تو کیا اب آپ کو گواہوں کے درمیان کچے کاغذ پر دستخط کر کے تین دلاؤں!“

”بہت بہتر جناب! جیسی آپ کی مرضی۔“ مولانا چراغ دین نے برامانے بغیر بڑے عقل سے کہا
”اسلام علیکم“ کہہ کر ہلکے ہلکے قدموں چلتے ہوئے ان کی بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

پردے کے پیچھے کھڑی میاں صاحب کی بیوی کلبہ تھاے اندر کی طرف بھاگیں پھر تخت پر
زار و قطار روئے لگیں۔ ان کے ہماری بھر کم بدن پر جیسے رازا سمار دی ہو گیا تھا۔ بچکیوں اور اٹھ
برسات انھیں ہمائے لیے جاتی تھی مگر ان کے برعکس اٹھارہ سالہ ندرت نے کمال ضبط سے اپنی
سنبھالی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گوشے ضرور کھلے ہوئے تھے مگر وہ ایک ہاتھ ماں کے شانے پر
خاموشی کی زبان سے تلی دینے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ہی کسی ہوئی نظروں سے پیشک
والے دروازے کی جانب بھی دیکھے جاری تھی۔

چند ثانیے بعد کواڑ کھلے اور میاں صاحب نے تے قدم رکھتے ہوئے برآمدے میں آکھڑے اور
ایک کڑوی سی نگاہ انھوں نے اپنی بیوی پر ڈالی اور جلتے کتے لیے میں بولے۔
”یہ کس کو رو رہی ہو! بھائی کے مرنے کی اطلاع آئی ہے کیا! لا حول ولاقوتہ۔“

”خدا کے لیے میاں صاحب.....“ بس بے سسکیاں ہوئی بیوی عورت تڑپ کر سیدھی ہو بیٹھی
”اب تو ہمارے رشتے بھی چھوٹ گئے۔ اب کیوں میرے بھائی کے لیے بدفال منہ سے نکالتے ہیں
”اودنہ! بدفال!“ وہ زہر خند سے بولے۔ ”میری بلا سے وہ بد بخت لاٹھی دو سرے کے مال پر نظر
والا جفاکاری تالا کل کا مرا ابھی مرجائے۔“ میاں صاحب مارے غصے کے پورے برآمدے میں پکارا
.....

”لوئی! ہم اپنے خون پسینے کی کمائی اور عمر بھر دماغ لڑا لڑا کر حاصل کی ہوئی آمدنی بھی ان کے

باہر رات بڑے دوروں میں چڑھی تھی شہنائیوں کی مدھر آوازیں اور باجوں کی گنگنائی سحر آفریں
 ایں سننے والوں کے دلوں میں گدگدی سی کر رہی تھیں مگر وہ بے بس دلا چار عورت جو ماں اور بیوی ہونے
 کے علاوہ بیک وقت کسی کی بہن اور پھوپھی بھی تھی 'انتہائی کسپرہی کے عالم میں کڑھ رہی اور ترپ رہی
 کی۔

عصمت بی بی میاں صاحب سے شادی ہوئے تقریباً اسی سال گزر چکے تھے۔ شادی کے پورے گیارہ
 سال بعد بھی ان کے ہاں بچہ پیدا نہ ہوا۔ عورت ذات اپنی فطرت اور افتاد طبع سے مجبور دوا دارو حتیٰ کہ
 دوا کے بغیر کمر کر کے ہار گئی مگر قدرت کو جب مہربان ہوا تھا اسی وقت مہربان ہوئی اور برسوں انتظار کے
 بعد بے گزرنے کے بعد قدرت ان کے گھر میں خوشیاں بکھیرنے کے لیے آئی۔

عصمت بی بی کے بچے کے نام پر فقط ایک چھوٹے بھائی تھے جو برسوں سے اس محلے میں آباد تھے۔ تقسیم
 اور کے موقع پر ہی دونوں بہن بھائی خاندان بھر کا زمین پر سجائے ہوئے پاک سرزمین پر خیمہ زن ہوئے
 اور اس دن سے آج تک اسی محلے میں آباد تھے۔ عصمت بی بی ان دنوں عید جوانی میں قدم رکھ چکی
 تھیں اور اب عصمت بی بی کی شادی کے لیے وہ سرگرواں و پیشان پھرتے تھے۔ نیا نیا ملک حاصل ہوا تھا۔
 انہیں اپنی مملکت جو نو زائیدہ ہو اور دنیا کے نقشے پر نئی ہووے اسے سنبھالنے، قدم بھانے اور آباد و شاداب
 بنانے میں کچھ مدت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے میں مسائل بے شمار اور مسائل بہت کم ہوتے ہیں۔

لیکن مدتوں کی بھاگ دوڑ بار آور ہوئی اور عصمت بی بی کے بھائی کو اسی محلے میں ایک بڑے سے پختہ
 مکان کے مالک میاں صاحب تک رسائی ہو گئی۔ اپنی ذات میں تمام اور آسودہ حال میاں صاحب انھیں
 بلا کر آئے۔ گوشتوں کے رئیس خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے تاہم مزگ میں ان کی بان اور سلی
 کی بان ہوئی وہاں تھی۔ جہاں سے ہر روز اتنی آمدنی تو ہوتی تھی کہ بلا کھنگے وال روٹی میاں ہو جاتی۔ نہ
 ان کی بہن بھائی تھے نہ والدین حیات تھے خبر نہیں کہاں سے آئے تھے اور یہاں آکر آباد ہو گئے۔ عصمت
 بی بی نے تو تفصیل میں گئے اور نہ ہی زیادہ کرید میں سو عصمت بی بی میاں صاحب کے عقد میں آ گئیں۔

ان کے بچے اور سسرال کے درمیان فقط ایک چار بیٹا بیٹوں والی اپنی بیٹی خوبصورت مسجد حاصل تھی۔
 ان کے ہمارے جانب اہل محلہ کے کچے کچے مکانات سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ہر ذات اور ہر رنگ روپ کے
 لوگ اہل محلہ تھے۔ کوئی فیصلہ لگانے والا کوئی دیکھ جانے والا تو کوئی محنت مزدوری کرنے والا اور کوئی بچوں
 کو پالنے والا۔ غرضیکہ اس محلے میں ہر قوم ہر پیشے کے محنت کش طبقے کی ریل پیل تھی۔ ایک ہنگامہ
 اور گامی تھی۔

باہر نکل گئے۔ جب ان کی جھلاہٹ عروج پر ہوئی تو وہ نیکو کلام بھول جاتے تھے ان کے نکلے ہی نہ رہتے
 آسودہ ہو چھٹی ہوئی تھری طرح کمر سے برآمد ہوئی اور بچوں کی طرح ماں کے پیٹ پر جوتہ وجود سے لپٹ
 ہوئے ہوئے رونے لگی۔ آج اسے بہت دنوں بعد روٹا آیا تھا اور یہ فقط در فقا رہتے آسودہ لیے لیے
 تھے کہ آج اس کے بچپن کے گھٹیر کی شادی ہو رہی تھی بلکہ روٹا تو اسے اس بات پر آ رہا تھا کہ اب
 میاں صاحب اس کی ماں پر باقاعدہ ہاتھ اٹھانے لگے تھے۔ آگے جانے کیا ہونے والا تھا! بسا اوقات اس
 ننھا ماصوم دل چاہتا تھا کہ وہ اپنی جان دے کر اس گھر میں سکون اور شادی کے سامنے بکیر والے گھر
 اس سے زیادہ اس سادہ لوح، گھریلو ٹائپ اور نادان لڑکی کے ذہن میں اور کوئی خیال نہ آتا تھا۔ یہی
 تھی اسے اپنے ناموں کا ساتھ چھوٹ جانے سے زیادہ اپنے والدین کے جھگڑے اور توٹکار سے سادہ فضا
 اس نے بھٹک کر تمام ماں کو سہارا دے کر کمرے میں پٹنگ پر لٹا دیا۔ گلاس بھر کر لائی پانی پلایا اور چائے
 چاہ بیٹھ کر ان کا سر دبانے لگی۔ ماں بیٹی کے درمیان چپ کی فضا حاصل تھی۔ ایک دوسرے کا
 خوب جانتی تھیں مگر اظہار کا یا ر نہ تھا۔ خاموشی میں پناہ و حوصلہ نکالی سو خاموش تھیں۔ سورج بچہ اور
 ہوا تھا کہ فضا میں شہنائیاں کو بجتے لگیں۔ دیکھ کر عورت ترپ کر پٹنگ پر اٹھ بیٹھی۔ آج اس
 اکلوتے بھائی کے دروازے پر باجے بج رہے تھے۔ برات دہن کے گھر جانے کو تیار کڑی تھی۔ بہت
 بنایا جا رہا ہوگا۔ انھوں نے بیکھ کو کاٹ دینے والی ٹھنڈی سانس بھری اور کان لگا کر باجے کی آواز
 لگیں وہ سراپا ساعت بنی جا رہی تھیں۔

ندرت سے برداشت نہ ہو سکا تو اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کرنا چاہا کہ ماں کے دکھوں
 اضافہ نہ ہو مگر ماں نے منع کر دیا۔ پولیس۔ "نہیں نہرت! دروازے بند نہ کرو کم از کم مجھے یہ بھی
 مدد نہیں سننے سے تو محروم نہ کرو۔ بے شک! یہ برات آج آگن میں اترا تھی مگر تمہارے پاس
 گوارا نہ ہوا لیکن میرا بھائی پھر بھی مجھے نہ بھولا اور آج کے دن تک صلی کی کوشش جاری رکھی۔
 جو بھی میاں صاحب کی مرضی میں یا تم دخل اندازی نہیں کر سکتے۔ انھوں نے سدا مانی کی
 اور مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ ان کی حکم عدولی کر سکوں کیونکہ میں بہت بزدل ہوں۔ تمہاری بددلی اور
 طلاق جیسے پتھر لیے اور منہوں لفظ کا الزام برداشت نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں....."

ندرت ایک بار پھر ماں کے ہر شفقت اور مہربانی سے بے لپٹ گئی اور سسکیاں لے لے کر
 گئی لیکن ماں اس سے ایک لفظ بھی تسلی و تسکینی کا نہ کہہ سکی۔ چپ کی مہربانی پر لگائے اسے
 چٹائے دھیرے دھیرے تھپتھپ گئی۔

عصمت بی کی گود گیارہ برس تک بھائیں بھائیں کرتی رہی، نہ کوئی شور مچانے والا تھا نہ ضدیں کلا والا۔ میاں صاحب کو اولاد کے ہونے نہ ہونے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ صبح سویرے ناشتہ پانی فرصت پا کر وہ اپنی دکان کو سدھارتے وقت کتنی کے چند کام نہانے کے بعد عصمت بی کو فرصت ہی فرم ہوتی۔ پڑھی لکھی خاک نہ تھیں۔ جی کاہے سے بہلاتیں۔ بیچ و خرید نماز اور تلاوت کلام پاک کے ڈھیروں وقت بیچ رہتا۔ سیکے کی طرف سے بڑے دیدار اور پکے مذہبی خیالات کے حامل گھرانے سے رکھتی تھیں۔ چنانچہ اپنے بیچے ہوئے وقت کا انھوں نے یہ مصرف نکالا کہ حفظ کلام پاک کی طرف دینے لگیں۔ نیت پاک اور ارادہ سچا ہو تو ہر کام میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ قدرت کی طرف ذہانت اور متانت وافر مقدار میں عطا ہوئی تھی چنانچہ میاں صاحب کو کالوں کان خبر بھی نہ ہو سکی۔

عصمت بی چند برسوں میں پورے قرآن حکیم کی حافظہ ہو گئیں۔
بہاؤ وقت تمامیاں حد سے سوا ہو جاتیں تو سر سے پاؤں تک سفید ٹٹھے کا برقعہ بن کر پھیلت کر بھائی کے ہاں چلی جاتیں اور گھنٹوں جھنجھٹے بھتیجیوں سے جی بہلایا کرتیں یا بھاوج کے گھلو گلو کام کاج میں بنا دیتیں۔ طبیعت میں انتہائی علم، نرم گفتاری، خوش خلقی اور مہربانی وہی کی وجہ سے بھاون اپنی اکلوتی نندہ سے بہت خوش اور مطمئن رہتی تھی اور بیٹھ پیچھے بھی غریب ذکر کرتی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میاں صاحب کے مزاج میں بھی تنگ اور اکڑ نہ تھی اگر انھوں نے کبھی کبھی سلسلے میں عصمت بی کی تعریف نہیں کی تھی تو کبھی کوئی خامی یا کسی کی نشاندہی بھی نہ کرتے تھے۔ زبان میں تلخی اور لہجے میں کات نام کو بھی نہ تھی۔ ان دنوں میاں بیوی کے درمیان کبھی بھی جھگڑا نہیں ہوتی تھی۔ میاں صاحب ایک کم کم اور اپنے کاروبار میں گم رہنے والے شخص سے زیادہ تھے۔ وقت پر گھر کی ضرورت میاں کرنا پانا بلا فرض سمجھتے تھے اور بیوی کو پیر کی جوتی سمجھنے کے ہمارا کی انچارج سمجھتے تھے۔ جیسی تو ان کا رویہ کبھی عصمت بی کو کھانا نہ تھا بے شک ان کی زندگی میں اولاد کا خلا بری طرح کھٹکتا تھا مگر شوہر کی طرف سے انھیں بید سکون اور طمانیت حاصل تھی اور یہ ذہنی ان کے لیے بہت بڑی نعمت تھی وہ ہزار بار خدا کا شکر ادا کرتی تھیں۔

تب شادی کے گیارہویں برس قدرت نے انھیں ایک من مہو بی بی بیچی سے نواز دیا۔ خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا کہ وہ میاں صاحب کو بیچی کی پیدائش ایک آنکھ نہ بھائی تھی اور وہ بی بی میں جنم کر رہ گئے تھے تاہم منہ سے برا یا بھلا ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ عصمت بی کے لیے یہی بہت شہر کی کیفیت کو کچھ کچھ جانتے ہوئے انھوں نے عام بیویوں کی طرح ان سے نام تجویز کرنے کی

یاد اور بہت سوچ بچار کے بعد اپنے نام سے میل کھاتا ہوا نام خود ہی رکھ لیا اور اس اپنی منجھی سی قدرت کی پیدائش کے بعد پھر پلٹ کر بھی قدرت کی فیاضی نے ان کی طرف نہیں دیکھا لیکن عصمت اور اسی قلق نہ ہوا وہ تو قدرت میں ہی گم ہو کر رہ گئی تھیں۔ اب انھیں اور کیا چاہیے تھا۔ میاں صاحب کوئی ان کے لیے مزید غبرائہم ہو کر رہ گئی۔ وہ دن رات قدرت کی ضروریات کام اور دیکھ بھال مصروف رہنے لگیں۔ آپ ہی آپ ان کی زندگی ایک نئے خوبصورت اور خوش رنگ راستے پر

رفتار بن برس کی تھی تو آپ ہی ایک روز عصمت بی اپنے میکے سے یہ خوشخبری لے کر آئیں کہ ان کے لیے اپنے بچھلے لڑکے کے لیے قدرت کو نام لیا ہے۔ میاں صاحب کو اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ان کو رضامند یا کر عصمت بی کی خوشیوں کا ٹھکانا نہ رہا۔ قدرت کی طور پر انھیں اپنے بھائی اور ان کے شہید دلی لگاؤ تھا اور قدرت کی نسبت طے کروانے میں خود انھی کی کوشش کو زیادہ دخل تھا۔ ان رکھنے کے لیے بھائی اور بھاون نے خوشی خوشی ہاشی بھری تھی۔ یوں قدرت کی منگنی طے پا گئی۔ قدرت قدرت بڑی ہو رہی تھی تول تول میاں صاحب کے کاروبار میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ بان ایک دکان سے مزید چار دکانوں کا اضافہ ہو گیا۔ اتنا کاروبار تمامیاں صاحب کیسے سنبھالے چنانچہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ مزگ میں قدم اور مشہور ترین دکان انھی کی تھی۔ چند برسوں کے دوران کا شمار جوتی کے تاجروں میں ہونے لگا اور بازار میں ان کی زبردست ساکھ بن گئی۔

ان کے ساتھ ساتھ ان کے محلے میں دوسرے لوگوں نے بھی اچھی ترقی کی تھی۔ خود عصمت بی کے اپنے بچے افراد میں شامل ہونے لگے تھے۔ محلے کے کچے مکانات میں بھی اب کئی آگئی تھی۔ لوگوں نے رہنے کا شعور آگیا تھا اور معیار زندگی بھی بلند ہو گیا تھا مگر میاں صاحب کی سی ترقی اور عروج کسی میں نہیں آیا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ جمع کرنے کے خط میں مبتلا ہو گئے تھے۔ جیسے جیسے دولت

عصمت بی کی گود گیارہ برس تک بھائیں بھائیں کرتی رہی، نہ کوئی شور مچانے والا تھا نہ ضدیں کلا والا۔ میاں صاحب کو اولاد کے ہونے نہ ہونے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ صبح سویرے ناشتہ پانی فرصت پا کر وہ اپنی دکان کو سدھارتے وقت کتنی کے چند کام نہانے کے بعد عصمت بی کو فرصت ہی فرم ہوتی۔ پڑھی لکھی خاک نہ تھیں۔ جی کاہے سے بہلاتیں۔ بیچ و خرید نماز اور تلاوت کلام پاک کے ڈھیروں وقت بیچ رہتا۔ سیکے کی طرف سے بڑے دیدار اور پکے مذہبی خیالات کے حامل گھرانے سے رکھتی تھیں۔ چنانچہ اپنے بیچے ہوئے وقت کا انھوں نے یہ مصرف نکالا کہ حفظ کلام پاک کی طرف دینے لگیں۔ نیت پاک اور ارادہ سچا ہو تو ہر کام میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ قدرت کی طرف ذہانت اور متانت وافر مقدار میں عطا ہوئی تھی چنانچہ میاں صاحب کو کالوں کان خبر بھی نہ ہو سکی۔

عصمت بی چند برسوں میں پورے قرآن حکیم کی حافظہ ہو گئیں۔
بہاؤ وقت تمامیاں حد سے سوا ہو جاتیں تو سر سے پاؤں تک سفید ٹٹھے کا برقعہ بن کر پھیلت کر بھائی کے ہاں چلی جاتیں اور گھنٹوں جھنجھٹے بھتیجیوں سے جی بہلایا کرتیں یا بھاوج کے گھلو گلو کام کاج میں بنا دیتیں۔ طبیعت میں انتہائی علم، نرم گفتاری، خوش خلقی اور مہربانی وہی کی وجہ سے بھاون اپنی اکلوتی نندہ سے بہت خوش اور مطمئن رہتی تھی اور بیٹھ پیچھے بھی غریب ذکر کرتی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب میاں صاحب کے مزاج میں بھی تنگ اور اکڑ نہ تھی اگر انھوں نے کبھی کبھی سلسلے میں عصمت بی کی تعریف نہیں کی تھی تو کبھی کوئی خامی یا کسی کی نشاندہی بھی نہ کرتے تھے۔ زبان میں تلخی اور لہجے میں کات نام کو بھی نہ تھی۔ ان دنوں میاں بیوی کے درمیان کبھی بھی جھگڑا نہیں ہوتی تھی۔ میاں صاحب ایک کم کم اور اپنے کاروبار میں گم رہنے والے شخص سے زیادہ تھے۔ وقت پر گھر کی ضرورت میاں کرنا پانا بلا فرض سمجھتے تھے اور بیوی کو پیر کی جوتی سمجھنے کے ہمارا کی انچارج سمجھتے تھے۔ جیسی تو ان کا رویہ کبھی عصمت بی کو کھانا نہ تھا بے شک ان کی زندگی میں اولاد کا خلا بری طرح کھٹکتا تھا مگر شوہر کی طرف سے انھیں بید سکون اور طمانیت حاصل تھی اور یہ ذہنی ان کے لیے بہت بڑی نعمت تھی وہ ہزار بار خدا کا شکر ادا کرتی تھیں۔

تب شادی کے گیارہویں برس قدرت نے انھیں ایک من مہو بی بی بیچی سے نواز دیا۔ خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا کہ وہ میاں صاحب کو بیچی کی پیدائش ایک آنکھ نہ بھائی تھی اور وہ بی بی میں جنم کر رہ گئے تھے تاہم منہ سے برا یا بھلا ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ عصمت بی کے لیے یہی بہت شہر کی کیفیت کو کچھ کچھ جانتے ہوئے انھوں نے عام بیویوں کی طرح ان سے نام تجویز کرنے کی

یاد اور بہت سوچ بچار کے بعد اپنے نام سے میل کھاتا ہوا نام خود ہی رکھ لیا اور اس اپنی منجھی سی قدرت کی پیدائش کے بعد پھر پلٹ کر بھی قدرت کی فیاضی نے ان کی طرف نہیں دیکھا لیکن عصمت اور اسی قلق نہ ہوا وہ تو قدرت میں ہی گم ہو کر رہ گئی تھیں۔ اب انھیں اور کیا چاہیے تھا۔ میاں صاحب کوئی ان کے لیے مزید غبرائہم ہو کر رہ گئی۔ وہ دن رات قدرت کی ضروریات کام اور دیکھ بھال مصروف رہنے لگیں۔ آپ ہی آپ ان کی زندگی ایک نئے خوبصورت اور خوش رنگ راستے پر

کے حالات پر کڑھنے کے بجائے اپنے متعلق سوچنے کی راہ تلاش کر لی تھی۔ نفسیاتی طور پر وہ شقی باپ اور ابھی ابھی ماں سے بیزار ہو گئی تھی لیکن ایک دن ایسا بھی آیا جب اس کی بے بسی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔

لاہور کی کڑا کے کی سردی اور اوپر سے دھواں دھار پرستے بادل! تین دن ہو چکے تھے مگر بادل کھلے آتے تھے نہ ٹھنڈک میں کی ہوتی تھی۔ نہ بستی ہو اؤں کے جھکڑ اور وہ سردی کے لالماں!

ایسے میں عصمت بی بی بے چاری ایک رات تہجد کے لیے بیدار ہوئیں تو ٹھنڈکھا گئیں۔ ہوا اور اعصاب تو ویسے ہی جواب دے گئے تھے۔ نمونے کا ایک ہی حملہ انھیں لپ گور کر گیا۔ ڈاکٹر نے ان میں داخل ہونے کا مشورہ دیا تھا مگر عصمت بی بی صاف انکار کر گئیں۔ ان کی بیماری میں ندرت کی اور پتھر لے احساسات ایک ہی جھٹکے میں بیدار ہو گئے تھے۔ وہ رات رات بھر ان کی پچھے لگی کہ ان کی صورت نکلا کرتی۔ میاں صاحب بھی اپنے روزمرہ کے حساب کتاب اور کھاتے بھل کر صورت لیے پھرتے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ انھیں محسوس ہوا کہ وہ بھی ایک عدد ہے زبان اور آپ میں کئی رہنے والی بیوی کے شوہر ہیں۔

ہوئی ششٹی کس کے روکے رکی ہے! ایک بے حد تائیک سرد اور دھواں دھار پرستی رات عصمت بی بی اس دار فانی سے کوچ کر گئیں مگر جاتے جاتے میاں صاحب سے ایک ایسا شکوہ کر کے جواب میں وہ دھاڑیں کھینچنے، نہ غرائے نہ چلائے نہ انھوں نے لالحوں بھیجی۔

اس وقت جبکہ عصمت بی بی پر نزع کا عالم طاری تھا اور کوئی دم چاڑھا تھا کہ دھونچکی کی طرح چلتی دھاگا ٹوٹنے کو تھا۔ انھوں نے اپنے ٹھنڈے ہاتھوں میں 'میاں صاحب کا زندگی کی حرارت سے ہاتھ بھر لیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔

”میاں صاحب! آپ نے ساری عمر اپنی سی کی۔ حتیٰ کہ اپنی ایک ہی اولاد تک سے نگاہیں بند کر اب میں جاتے سے آپ کو صرف ایک بات کہنا۔ نہیں بلکہ ایک چیز کو کھانا چاہتی ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے پٹی سے لگی آنسو بہاتی ندرت کے سر سے چادر نوج ڈالی تھی۔ سیاہ بالوں پر کہیں کہیں چمکتے اندھیری رات میں جگنوؤں کی طرح جل بھجھ رہے تھے۔ میاں صاحب کو پیچھے سے دیکھا۔

دوسری دھند اپنی بیٹی کا روپ! انھوں نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ ماں کی میت پر چل کر پڑوس کی عورتوں کے ہاتھوں سے لٹکی جا رہی تھی۔ ہائے! وہ ندرت تھی! سوکھی سوکھی بچی بانوں اور رخساروں، دھلے پتلے سے وجود اور بھیجی بھیجی آنکھوں والی ندرت! انھوں نے باپ نہ کہ اپنے

ادب و نعت

کارمین کرشٹ ہائے ”دوشیزا“ شمارہ اگست کے صفحہ نمبر 246 پر بنی آوازیں کے عنوان سے نئے لکھنے والوں کی کاوش چھاپی جاتی ہے۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ امجد اسلام امجد کی نظم ”اس وقت اگر تم آجائو“ خالد مجسم کے نام سے چھپ گئی ہے۔ خالد مجسم سے بھی گزارش ہے کہ آئندہ ہمارے ادارے کو اپنی کوئی تحریر (اگر ایسا کیونکہ انھوں نے اس نظم کو اپنی تخلیق کے طور پر سمجھا تھا۔

(ادارہ)

ادارہ چاؤن کے سینے پر ایک گھونسا سا لگا۔

عصمت بی بی موت نے میاں صاحب کے دل پر بہت اثر کیا تھا۔ نہ چاہنے کے باوجود کبھی کبھی انھیں یاد آتیوں کا خیال آ جاتا تو وہ دل میں ندامت سی محسوس کرتے اور اپنی بے چینی رفع کرنے کے لیے دوسری باتیں سوچنے لگتے۔ عصمت بی بی ان کے ظلم و ستم اتنی خوشی سے لگتی تھیں کہ بعض اوقات صاحب کو ان کی موت کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ وہ جانتے جاتے ان کے دل پر ایسا زخم لگائی تھیں جو ان کے دل میں نہ آتا تھا۔ اس لیے وہ دل ہی دل میں مہم ارادہ کر چکے تھے کہ بیوی کے چالیسویں وغیرہ سال ہو کر وہ سب سے پہلے ندرت کی طرف توجہ دیں گے اور اسے دھتک کے گھرانے میں بیاہ دیں

عصمت بی بی کے چالیسویں میں خلاف توقع انھوں نے خاصی رقم اٹھائی مگر بیٹھانی پر بل تک نہ لائے۔ ان سے فراغت پا کر اپنے خیالات ندرت کے لیے کسی موزوں اور مناسب لڑکے کے حصول کی سہولت کر دیے یوں بھی اب وہ گھر میں تیار ہو گئی تھی۔ یہ دکانوں پر پکر لگانے چلے جاتے تب بھی ان کی عمر ہی نگارتا۔

یہ روز مسلسل غور کرنے کے باوجود میاں صاحب اس مسئلے کا مناسب حل نہ ڈھونڈ سکے جس کی واحد حل یہ کہہ دینا کہ کسی ہم پلہ تاثر برادر میں ذکر چلائے تو ان کی ساری دولت خطرے میں نظر آتی ظاہر ہے کوئی ان کی بیٹی کے رشتے کے لیے تیار ہو جانا مگر ان کے مطالبے میاں صاحب کس دل کے ساتھ پورے کرتے وہ وقتی طور پر بیوی کے مرنے سے متاثر ضرور ہو گئے تھے مگر ان کی فطرت ایسی تھی!

اب تدبیر ان کے ذہن نے ڈھونڈ نکالی۔ ایک شام انھوں نے اپنے محلے کی مسجد کے پیش امام مولانا

برادری

خمیر ہمیشہ چمکتا رہتا ہے مگر کبھی کبھار انسان کے چہرے دھڑک دے جاتے ہیں
اُس معصوم لڑکے کی کھانسی جس نے ہمیشہ چہروں کی تصویر پر پڑھی تھی!
ایک کفانی اُس پر ہنسنے لگا کہ جس کا خمیر بد رنگن تھا



شیریں خان



اُس مرگ پھر سامنے بیٹھا ہے۔ غنڈہ کس کا۔ ارے اس نے تو گلی میں آنا جانا دو بھر کر دیا ہے۔۔۔
مٹے سے کہہ کر چن کر گرا دی جس کو اٹھائے وہ سامنے کا نظارہ کر رہی تھیں۔ ”کیا کریں بیٹی۔
ااری کو اپنی عزت کا بھی بڑا خیال ہوتا ہے۔“ اماں اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں وہ جو جلدی جلدی

چراغ دین کو اپنی بیٹھک میں مدھو کیا اور ان کے سامنے اپنا مدعا بیان کر ڈالا۔ میاں صاحب کا خیال
مولانا چراغ دین ایسا ہی رشتہ جاتیں گے جو نہ ادنیٰ فیملی سے ہو گا نہ اونچے حلالے منوائے گا۔
سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

مولانا چراغ دین اب خاصی عمر کے ہو چکے تھے۔ تاہم خدمت خلق کے جذبے کے تحت اب تک
والوں کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے کیونکہ مدتوں سے اسی محلے میں رہتے تھے اس لیے ہر مسئلے
لڑکوں کے جملہ کو آف حتیٰ کہ ان کی صحیح عمروں سے بھی آگاہ تھے۔

میاں صاحب نے انتہائی نرم لیے اور لاجت بھرے انداز میں کہا۔ ”مولانا صاحب! میری عمر
تو آپ نے دیکھی ہوگی۔ اس کی ماں کے انتقال کے بعد سے میں بہت پریشان ہوں۔ لڑکی کو اب
بار کا ہو جاتا چاہیے اگر اس سلسلے میں آپ.....“ اپنا بیان کرتے کرتے میاں صاحب کی زبان لاٹھی
گلی اور وہ رک گئے۔

مولانا نے مسکراتے ہوئے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا پھر انکسار سے بولے۔ ”میاں جی میں
مطلب سمجھ گیا۔ مجھے خود گھر میں عورت کے نہ ہونے سے خاصی تکلیف ہے۔ بچے اپنے گھر
ہو چکے ہیں۔ ان کی والدہ عرصہ ہوا جیسا کہ آپ جانتے ہیں تقضائے الہی کا شکار ہو چکی ہیں۔ بندہ
اب برداشت نہیں ہوتی۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ ندرت میرے گھر آئے۔ میں اس کا ہاتھ
کوتا رہوں۔“

میاں جی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اچھل پڑے۔
”مولانا صاحب آپ میرا مطلب ہی یعنی آپ.....؟“ لفظوں کے گولے میاں جی کے
چسنے لگے۔ انھیں دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔
مولانا صاحب زبیر لب مسکراتے ہوئے بولے۔

”میاں صاحب میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ مجھی بڑے کجوس آدمی ہو تم بھی بہتر
نہیں لوں گا مگر تمہیں میرا تجربے طرز سے قیور کرانا ہو گا۔ آخر ندرت کی رہائش کے قابل ہوتا تھا
تمہیں چالیس ہزار سے زیادہ خرچ نہیں ہو گا۔ میرا خیال ہے اس سے بھی دو چار ہزار روپے کم.....
مولانا اپنی بات مکمل بھی نہ کر پائے تھے کہ میاں کے منہ سے بمشکل لاحقول ولا قوۃ نکلا اور وہ
دھڑام سے گرے اور فرش پر ڈھیر ہو گئے۔

اپنے سینڈل کے نیچے کسی رسی تھی، اٹھتی ہوئی ہوئی۔

گھڑنے کا راستہ بھی تو یہی ہے۔۔۔۔۔ وہ آہستگی سے کہنے لگی۔۔۔۔۔ مجھے تو خود اس کی شکل ہے۔۔۔۔۔

”یہ بھی تو پورا بھوت۔ یہ سائڈ کا سائڈ“ اسے دیکھ کر ہونچھے ہول آتا ہے۔۔۔۔۔

”یہ دکائیں بھی بس بالکل گھر کے سامنے جو ہیں۔ پھر جب سے تو اسکول جانے لگی ہے روز آوے ہے۔ ایسے غنڈوں کی نظر میں شرم کیا کیا! میں تو بڑے وقت سے ڈرتی ہوں۔ زمانہ خراب ہے اور اس موسم کے لکھنؤ کی وجہ سے اور جان انکی رہتی ہے، جب تیری شکل دکھائی سکون آتا ہے، نہ ہم پر برا وقت آتا نہ ہی دن دیکھتے۔۔۔۔۔“ اماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو رات آہستگی سے ان کے شافوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”چھاپا ہنس دو تو میں چلوں“ وہ سر پر دوپٹا اوڑھنے لگی۔ سادے سے کائٹن کے سوٹ میں پرکشش لگ رہی تھی۔ اماں اسے دروازے تک دعائیں پڑھتی ہوئی چھوڑے آئیں۔ اس نے پرس اور بوری سی فائل اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ گلی میں قدم رکھتے ہی خوف کی منہنی پورے جسم میں دوڑ جاتی تھی اور اس کی وجہ سامنے کی دکان پر بیٹھا نیم خیم وجود دلاور تھا۔ بوری مومچھوں اور لال لال آنکھوں والا۔ اسے دیکھتے ہی زبان آجڑوں کا ورد کرنا شروع کر دیتی اور آگے قدم بڑھاتی تو گلی کے خاتے پر ہی اس کی جان میں جان آتی تھی ورنہ تو یوں لگتا جیسے دو آدمی کے وجود میں بھی جاری ہوں۔ ویسے بھی گلی بڑی تنگ تھی جس میں بس داخل نہیں ہو سکتی تھی عبور کر کے ہی بس میں سوار ہوا جاتا تھا۔ اس لیے باجرتھنے ہی اس کا سامرا دلاور سے ہو جاتا تھا۔ میں دیانے بیڑی سلگاتا ہوا الماتا۔ گوکہ وہ خاموش ہی رہتا تب بھی ڈر کے مارے راحت کا یہ حال تھا کہ کھمکھم دیتا تو راحت کہاں اس کی زبان بکڑ سکتی تھی۔ وہ بھی تو گھر سے نکلنے پر مجبور تھی کوئی دوسرا والا ہوتا تو مجھ کی ایسی ویسی نظروں کے سامنے نہ آتی مگر حالات ہی ایسے تھے۔ چھوٹے ہنس بھائیوں کی فے داری اکیلے اس کی جان پر تھی۔ باپ نے کچھ عرصے پہلے ہی آنکھیں بند کی تھیں۔ وہ تو رات بے کمر رہی تھی اس لیے اپنے پرانے اسکول ہی میں اسے نوکری مل گئی ورنہ اتنی جلدی نوکری کا ممکن ہے۔ سارا دن بچوں سے سرکھا کر آتی گھر کے کام کاج کے علاوہ شام کو بچوں کو ٹیوشن دیتی یوں گزارا ہو جاتا۔ متوسط طبقے کے تو یوں بھی بہت سے مسائل ہوتے ہیں لیکن آج کل ان کی ذات حاوی تھی۔

”ہائے خدا کسی کو یتیم اور بے سارا نہ کرے“ اماں نے مشین چلاتے چلاتے دہائی دی۔ وہ

گھڑنے کی کچھ آمدنی بنا لیا کرتی تھیں۔ ”ہماری زندگی اس محلے میں گزری پر اس جیسا ڈھٹ آدمی نہ تھا۔۔۔۔۔“

”اماں باپ تو شریف ہیں پر نجائے اس کا خیر کس پر پڑا ہے۔ بری صحبت اور کالے دھندوں میں لگا رہتا اس محلے میں تو لوگ اس کے نام سے کانپتے ہیں۔۔۔۔۔“ عین بوائے چھوٹی سی کپڑے کی تھیلی کو کھول

مہالہ چھانکتے ہوئے معلومات فراہم کیں۔

”تو تو دل چاہتا ہے جدم جدم اٹھے چلی جاؤں۔ تاکہ اس منحوس سے تو جان چھوٹے۔ کوئی ایک دن آجکل جو اس لیے کی صورت نہ نظر آتی ہو۔ جو ان جہان لڑکی کا مسئلہ نہ ہوتا تو کچھ حکا کر سوراہتی۔۔۔۔۔“

اماں کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔

اسے فائدہ نہ کرے۔ کیوں برا کلمہ منہ سے نکالتی ہو۔ بچوں کے سر پر تمہارا سایہ سلامت رہے، ان کا دل کون۔ کڑے وقت میں عزیزوں تک نے تو ساتھ نہ دیا پھر مٹکا کی زمانے میں سر چھپانے کا کوئی توبہ اگر برا یا بھلا جیسا بھی لپٹا کر بھی نہ ہوتا تو کہاں بیٹیا کے ساتھ بھٹکتی رہتیں۔ عین بوائے

نیم سرے منہ میں خاک جانے کا کفر بھی رہتی ہوں خدا نے عزت کی زندگی دی اس کا احسان اماں نے کئے پیٹ لیے تو راحت کو بھئی آگئی۔ یہ تو روزی ہوتا تھا، عین بوائے کے ساتھ بیٹھ کر ساری

کھانے اور بیٹھنے والے آخر میں توبہ کی جاتی۔

مکان دو کمروں اور چھوٹے کچے سے صحن پر مشتمل تھا۔ اپنا اپنی زندگی ہی میں بناتے تھے۔ اس کے

وقت گزارنا پسند کرتی تھی اور یہی اس کی زندگی کا محور تھا۔

محلے میں نوری کی شادی تھی جو راحت کی بڑی اچھی سہیلی تھی اس لیے راحت بڑے زور و شور سے ہنگامے میں حصہ لے رہی تھی اس وقت بھی دھولک پر گیت گاتے جارہے تھے جس کی آواز سے محلہ گونج رہا تھا۔ مندی کو کھال میں سجاتے سجاتے راحت گہمی سمی ہو گئی۔

تیرے ابا کی اونچی حوٹلی
بٹو میں ڈھونڈتا چلا آیا

کیا کبھی اس گھر کے چھوٹے سے انگن میں بھی شہنائی بجے گی؟ اس نے دل میں سوچا۔ شاید نہیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی کچی کلیوں کے سے تروتازہ خواب تھے جو عمر کے اس حصے میں ہر لڑکے کے لیے تھے۔ تبصرے چاہے طے نہ لے، اپنے آنکھوں میں بچے رہتے ہیں، پھر زندگی کے تلخ و ترش تجربے کھا کر خواب بے رنگ نہیں ہوتے۔ وہ سوچ کر مفرادی۔ یہ خواب بھی زندگی کا کتا بڑا اٹھ ہوتے ہیں اور انسان سے انھیں چھین لے تو زندگی میں کیا رہ جائے گا۔ یہی قیدی گرفتار آرزوؤں کا عکس۔

”راحت۔! اور راحت“ شادو نے اسے پکارا۔ ”کہاں کھوجاتی ہو، جلدی آؤ۔ اب لڑکے والوں طرف جانا ہے“

”اچھا۔ اچھا آتی ہوں“ راحت نے بلند آواز میں جواب دیا اور مندی پر گلاب کی پتیوں اور انار سے اپنی سہیلی کا نام جانے لگی۔

مندی کے تھال اٹھائے ساری لڑکیاں گاتی ہنسی مذاق کرتی دھما دھما دھما کی طرف چل دیں۔ آگے موم پتیوں سے جگمگا تھا۔ لیے راحت تھی جسے سب دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ حسد کی اماں تو اس سرپا سے نظر نہ اٹھا سکیں، بیشک یہ سیدھی سادی راحت ذرا سے سنگھار سے بدل کر رہ گئی۔ حیدر آباد، کدو، دھنیا، گالوں پر ہلکی لائی، ہونٹوں پر لپ اسٹک اور آنکھوں میں ہلکی کانپل کی کیرے غصہ دھار رہی تھی۔ ہر کوئی تعریف کر رہا تھا پر اماں کے دل پر تو جیسے کسی نے گھونسا مار دیا تھا۔ کیا راحت کو دلہن بننے کا حق نہیں؟ اس کے دل میں بھی تو کتنی ارمان ہوں گے۔ یا خدا..... میں گناہ کی سزا دے رہا ہے۔ جب ہمارے حالات سدھریں گے تو میری بیٹی کی عمر وصال جانے کی اسے پوچھتے گا؟ بیشک کی طرح اماں کے دماغ میں کالے ناگ جیسا یہ سوال چھن پھیلنے بیٹھ گیا۔ کرتیں۔ یہ لڑکی ہی ان کا واحد سہارا تھی۔ پورے کنبے کی کفیل۔ سوائے جلنے اور کڑھنے کے وہ کبھی اس کا راحت کو کبھی احساس تھا اور وہ تو بڑی صابر و شاکر تھی۔ تقدیر کے آگے سرنگوں۔

”اللہ کا شکر ہے آج تو کبھی اس منحوس کے وجود سے پاک ہے۔۔۔ چل راحت خدا تمہارا

دعا دینا پہلے ہی تجھے دیر ہو گئی ہے۔۔۔“ اماں نے چن کر گرا راحت کو خبر دی تو اس نے طہانیت کی ایک کاپی سانس لی اور گلے میں اٹھی۔ بڑی خوش خوش اسکول گئی۔ ذہن پر کوئی بوجھ نہ تھا۔

”خدا کرے اب وہ مشکل دوبارہ نہ دیکھوں۔“ اس نے غلو ص دل سے دعا مانگی۔

پھر کئی دن گزر گئے دلاور وہاں نظر نہ آیا۔ لگتا تھا کہ دعاؤں نے اثر کر دیا ہے۔ راحت کو بڑا سکون تھا ایک دن خالہ نصین نے اسے خبر دی کہ منشیات کے کاروبار کے الزام میں دلاور اندر ہو گیا اماں

”اے کروت کے برے نتیجے۔۔۔“

راحت نے سوچا۔۔۔ شمس کہ جہاں پاک“ اور کیا یوں پر جھک گئی۔

”راحت چندا..... آج ذرا گرا گئی طرح چکا دیکھو۔“

”نیل خیریت ہے اماں“ بستر تہہ کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ آج چھٹی کا دن تھا اس لیے وہ دیر سے

راستی تھی۔

”اے میری پھوپھی طاہرہ کا بیٹا جو آ رہا ہے۔۔۔“

”اے!۔۔۔“ اب وہ تل پر بیٹھی منہ دھو رہی تھی۔

”اے! اپنا نوید۔۔۔ پر تجھے کہاں یاد ہو گا۔۔۔ نہ دیکھنا نہ ملی۔۔۔ بے چارہ پردیس میں اکیلا رہتا ہے ماں

اس کی چشما پٹ ہو گئے تھے۔ برسوں بعد زمین کی محبت کھینچ لائی ہے۔ بے چارہ بچہ۔۔۔“ اماں کی محبت

دل میں تھی۔

مندی کی ماں۔۔۔ سیدھی سادی، پھوپھی نے کب پوری زندگی انھیں پوچھا۔ ایک یہ ہیں کہ انسانیت کا

کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں اس نے سوچا۔۔۔ اور جلدی سے بولی۔۔۔ ”اچھا اماں ابھی

آ رہا ہے۔۔۔“ شاید اسی ہمانے کچھ دن بچوں کے اچھے گزر جائیں۔۔۔ ان کا بھی کون عزیز رشتہ دار بیٹا

ہو۔۔۔ خیال سعودی عرب سے آنے والے نوید کو دیکھ کر مزید پشیم ہو گیا۔ وہ بھی آتی ہے سب میں

میں مل گیا جیسے برسوں سے اس گھر میں رہتا چلا آیا ہو۔ ”یہ لڑکا تو پھوپھی اماں پر بالکل نہیں بڑا

”راحت حیران ہو گئی۔۔۔“ ”توبہ یا خدا مجھے معاف کر۔۔۔ مرے ہوؤں کا بیشک اچھے انداز میں ذکر

”راحت نے خود پر نظر نہ بھیجی اور بائیں میں بیچ چلائے لگی۔۔۔ نوید کی شخصیت میں نچانے

راحت کو اس کے کام کرنے میں مڑا آنے لگا۔ سارے بچے اور اماں تو ویسے ہی اس کے گرویدہ

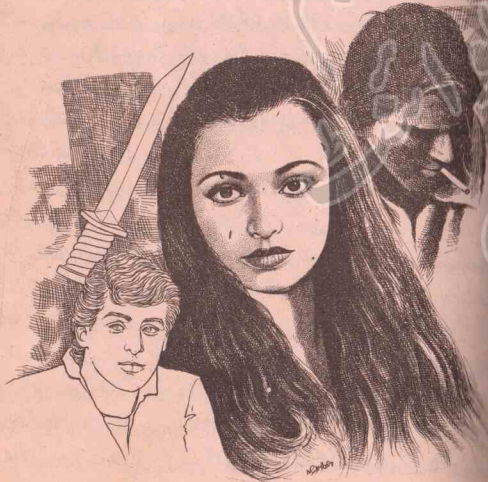
ہیں ان کے گھر میں اس کی وجہ سے ہمار اٹھی تھی۔ باتوں کے فن میں تو ایسا ہمار تھا کہ کہاں کہاں کے

کونانا۔۔۔ چٹکے چھوڑتا۔۔۔ سب خوش تھے۔

انصاف

ماں انصاف کے لیے چیختی رہی، اور وقت ہو گنگر اڑتا رہا
ایک ۱۱ سالہ معصوم بچہ کے دریاغ تھلکا، استان
آدم نے خدا سے انصاف مانگا تھا اور انصاف ہر ایک کے لیے ہے...

نسرین خواجہ



گلی میں انھوں نے راحت کو چایا اور اس کے قریب سے گاڑی لے جاتے ہوئے آوازے کر دیے

”سرکار نازک پیروں میں موج نہ آجائے۔“

”دھوپ اس چاند سے چرے کو کالا نہ کر دے سوچو.....“

”اوسے ہم تو آپ کے خادم ہیں حضور“ راحت بری طرح گھبرا گئی۔ عجیب طبع کے بد معاش تھے۔ وہ تو ویسے بھی بہت جلد ہمت ہارنے اور ہاتھ پیر چھوڑنے والوں میں سے تھی۔

”مال اچھا ہے..... پھر کیا خیال ہے.....“ ایک نے کار سے اتر کر اس کا پاؤں پکڑ لیا۔

”اوسے ڈالو اسے کار میں.....“ دوسرے نے اسے کھینچنے کی کوشش کی تو راحت نے بے

ماری۔ اس کے ہاتھ سے فائلیں گر چکی تھیں۔ اسی اثنا میں گلی میں ایک اسکوٹر تیزی سے داخل

ایکا ایک وہ ان کے سروں پر پہنچ گیا۔ راحت کے تو ہوش و حواس ہی زائل ہو چکے تھے۔

”اوسے پھیل پھیلوان۔ یہ کیا حرکت تھی؟“ ایک لڑکے کی بھاری مردانہ آواز گونجی مگر

ایک زوردار مکا اس کے چہرے پر پڑا۔

”سالو ٹھہر جاؤ..... آج تمہاری خیر نہیں.....“ دو لڑکوں کو اٹھا کر اس اسکوٹر سوار نے بیک

دی تو وہ گھبرا گئے اس کے ہاتھ مشینی انداز میں چل رہے تھے اور ساتھ ہی زبان بھی۔

”بد معاشو! اب بیچ کر کہاں جاؤ گے۔۔۔“ اس نجم خیم وجود کے آگے وہ ہڈی سے لڑکے بالکل

بس تھے۔ جیسا مار مار کر اس نے ان کا بھر کس نکال دیا تھا پھر گاڑی میں ٹھونس دیا اور گاڑی لڑا

ست روی سے آگے بڑھ گئی۔

”بھاگ گئے ذلیل۔۔۔ ایسا سبق دیا کہ دس پشتوں تک یاد رکھیں گے.....“ وہ اس کے قریب

ہوا اور زمین سے دوڑا اٹھاتے ہوئے سہمی سہمی راحت سے بولا۔

”آج تمہیں دیر ہوئی تھی اس لیے اسکوٹریے تمہاری تلاش میں نکلا تھا آخر مکے کی عزت بھی

عزت ہوتی ہے..... چل بن..... تجھے گھر چھوڑ دوں.....“

راحت نے ددبٹا اوڑھتے ہوئے اس کی طرف نظر اٹھائی تو آج نہ اسے دلاور کی لال آنکھوں

لگا نہ اس کی لمبی لمبی مونچھیں بری لگیں۔ وہ اسکوٹر تھامے اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ راحت کے

اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ اس نے نیا جنم لیا تھا۔ ننکین آنسوؤں سے چرا بیگ رہا تھا۔

اس کے لیے دعائیں تھیں اور یہ خراج ایک برے آدمی کے لیے تھا جو عظمت کا مینار بن گیا تھا۔

"اللہ کرے تو مرجانے... ذلیل... کتیا... تو نے میرا دل ہی جلادیا ہے... ہائے... ہائے... کیا کروں؟ نواب زادی پاؤ بھر دودھ گرا دیا تو نے۔ اب میں اس سور کے بچے کو کیا پاؤں کی طرح تراخ... تراخ... اس کے پیکے زرد گالوں پر اماں کے بے رحم اور سخت چھڑے بھاد پڑے تھے۔ وار کو بے بسی سے ہاتھوں کی دھال بنا کر رونے کی کوشش کرتی مگر اماں کا ہاتھ اس کی دھال کو ہٹا کر کسی نہ کسی جھے تک پہنچ ہی جاتا تھا پھر اماں اس کے بکھرے بالوں کو پکڑ کر جھٹکا دیتیں تو وہ آپ کا ہچکتے ہوئی دھال توڑ کر ہاتھوں کو بالوں تک لے جاتی۔ ساتھ ساتھ اماں کی زبان بھی کچلی چلی رہی تھی۔

"بس اونٹنی بن گئی ہے کوئی دھنک نہیں... ارے تو مرکبوں نہیں جاتی؟ میرے لیے کیوں دعا ہوئی ہے۔ ویسے ہی خون پینے والے کم ہیں جو تو بھی جو تک کی طرح چٹنی ہوئی ہے۔" اماں اپنے کان پھوڑنے پر تلی ہوئی تھیں۔

گھٹے گھٹے ماحول... بھوکے پیڑوں اور سوکے مارے چروں کی بھئی تو سستی تفرق ہے۔ گالیاں مارا جھگڑے... دل پر بوجھ ہو تو بچوں کی کھال اوڑھ کر ہی بوجھ پکا کر لو۔ کیونکہ سب سے آسان اور سہل ہے۔ جوں جوں فونز بڑی ہوتی جا رہی تھی اسے اس ماحول سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ جس میں پیار محبت، مفلسی کی چادر اوڑھ کر نہ جانے کب کے دفن ہو چکے تھے اس گھر میں تو اس کے لیے کوئی پلنگ بھی خالی نہ تھا۔ ایک پالتی پر ہے تو ایک سرہانے، اور ایک لنگن چادر کے بھروسہ سکتا رہتا تھا۔

پاؤدھ کی خاطر اماں نے اس کا سیروں خون خشک کر دیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کانپ رہی تھی مگر ذرا بھی رحم نہ آیا۔

"ہائے اماں! اب ایسی غلطی نہیں ہوگی۔ میری توبہ... اماں توبہ... ہائے اماں معاف کر دے۔" اللہ... وہ مسلسل پرنے والی چوڑوں کی شدت سے تڑپ اٹھی۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ لڑا رہے تھے۔

"او آں... او آں..." ٹوٹے جھوٹے میں لکھتے نے نے پھر پورا احتجاج کیا تو اماں چونک کر ادھر متوجہ ہو کر لپکتی ہوئی سننے کی طرف گئی تو فونز کو جیسے خدا کی مدد مل گئی۔ اس نے جو اماں کی توجہ پھینک دی اور لمبی چھلانگ لگائی اور دروازے سے باہر اس طرح بھاگی جیسے کوئی چھانی کا مجرم کال کوٹھری سے ہانا کر کر بھاگا ہو۔ وہ بھاگتے بھاگتے گلی کے آخر میں پہنچ کر رک گئی اور لمبی لمبی کمری سانس لینے لگی۔

اس سے بہتے ہوئے آنسوؤں سے چہرے پر بھی گرد اور میل کو صاف کر دیا تھا اور اس کے چہرے پر کچھ لڑکے کے نقش و نگار سے بن گئے تھے۔ خفا دل بے چینی سے تڑپ رہا تھا۔ "کس طرف جائے؟" اس نے طرف دیکھا۔ گھر واپس جانے کا تصور بھی روح فرسا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر اپنی گلی سے اگل کر برابر والی گلی میں داخل ہو گئی۔ گرمیوں کی کڑکٹی دھوپ تھی، دور دور تک سناٹا پھیلا تھا۔ چھوٹے گھر کی بری طرح مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ ٹخنوں سے اوپر پکلی سی میلی شلوار پر جامبیا ملے اور پکناٹی سے بڑے تھے۔ چیونٹ کی پرند قلیں کا تو اس سے بھی برا حال تھا۔ نیلے کچیلے بال درجیوں میں دوڑنے کا بوجھ دوپورے چہرے پر بکھرے پڑے تھے۔

دوسری گلی کے ابتدا میں ایک جھپسی چھوٹے گھروں کی لمبی قطار تھی جو رحیم چاچا کی ملکیت تھیں، جن میں کرائے دار رہتے تھے اور سارے کے سارے چھڑے تھے، خود چاچا بھی چھڑا تھا۔ ایک کوٹھری میں کام چاچا کا دوست جو نیا نیا آیا تھا اور چاچا اس سے کرایہ نہیں لیتا تھا۔ دونوں مل جل کر دھندا کرتے تھے۔ کالو چکیدار بھی رحیم کا کرائے دار تھا۔ فونز کی رحیم سے بڑی پرانی دوستی تھی۔ وہی تو اسے ساری باتیں سب سے زیادہ اچھا انسان لگتا تھا۔ ایک اچھا بھائی سارا دن اپنے ٹھیلے سے فرصت نہ تھی۔ آلو پھولے، آلو پھولے، وہ سب سارا دن آلو پھولے اور رات کو گھر آکر روٹی کھا کر اماں کی الٹی سیدھی باتیں سب بچوں کو روٹی کی طرح دھنک کر اپنے بستریں گھس کے سو جاتا۔

"ایسے باپ ہوتے ہیں؟" وہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھی۔ کوٹھریوں کے سامنے ایک بند مکان اور برسوں سے بند پڑا تھا اس کا بغیر دروازے والی گلی کی بچوں کے لیے کھیل کا میدان تھی۔ اندر گلی میں بکھل خاموشی تھی۔ وہ بھرے دل کے ساتھ گلی کی آکر زمین پر بیٹھی۔ اپنی عمر کے بارہ سال کا ہر لڑکھو اس نے احساسات کی دہلیز پر دکھ چھیلے "اوتیتیں ستے اور عرومیاں سیتے ہوئے گزارا تھا مگر اماں کا دل بری طرح رو رہا تھا۔

"میں مرکبوں نہیں جاتی؟" اس نے دکھ سے سوچا۔

"اماں بھی تو مجھ سے تنگ ہیں اور ایا کو مجھ سے کوئی مطلب ہی نہیں، کوئی پروا نہیں۔" اس کی آنکھیں سے جاری تھیں۔

"سارا دن گھر کا کام کرو۔ مناسبا لو، کپڑے دھو، برتن مانگو اور رات کو پاؤں دباؤ۔" بھر بھی...! وہ کی بری۔ اور اماں کو تو میں اتنا سارا پیار کرتی ہوں مگر بھیجے ہی مارے جاتی ہیں۔ کیوں؟ میں شاید اسے اچھی نہیں لگتی۔ تب ہی تو ہر وقت مجھے مرنے کی بددعا دیتی رہتی ہیں۔ اللہ کرے میں واقعی

کو شش کرتی ہوئی گھبرا کر بولی۔

”اچھا... اچھا...“ جو نے ہنستے ہوئے اسے اپنی واحد چارپائی پر پھینکا۔ وہ ڈر کر پھر اٹھ بیٹھی۔

”یہ بٹک پہ آیا۔“

”اللہ!“ وہ انجانے میں دہل گئی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی مگر جو کے مضبوط ہاتھ اس چیخ کا راستہ روک لیا۔

”کی جراتی میں پریشانی بھی شامل ہوگئی۔“

”کیا ہو گیا؟“ اور ٹوٹتی الجھتی نظروں کے ساتھ جو کو دیکھنے لگا۔

”اسے قتل ہو گیا ہے رخصت۔“ جو نے لرزے کا ہتھ بھلا دیا کیا۔

”کہہ رہا ہے تو مجھ۔؟“ رحیم ایک دم بدحواس سا ہو کر جو کی طرف بڑھا۔

”دوست... بٹک پہ دیکھ!“

”میں...؟“ وہ بدحواس سا ہو گیا۔ وہ فوئیر تھی... عریاں... زخمی اور ساکت۔ اس کے

پانچوں ہاتھوں میں کئی بم ایک ساتھ چپے جو دماغ کی دھجیاں اڑا گئے۔ وہ چٹائی چٹائی آنکھوں سے اس

کو دیکھنے لگا جو خاموش رہ کر بھی ظلم کی ساری داستان حرف بہ حرف دیکھنے والوں کو سناتا تھا۔

”آکھیں... زخمی ہوئی ہر طرح خراشوں سے اتنی ہوئی تو خیز کچلی چھاتی... آکھ... جو... یہ تو نے

کیا کیا؟“ رحیم سبک کر رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی دھوئیں کے بادل میں پھنس گیا ہو دم گھٹنے

لگوں میں دھندلی چھاتی... دھواں... دھواں... دل میں اٹھتے کڑوے درد کی شدت سے

پانی پانی ہو گئیں۔ وہ ہاتھوں میں سر ڈال کر سبک پڑا۔

”رحیم! میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں اور کیسے یہ مر گئی؟“ وہ ہولے ہولے

بولا۔ رحیم نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

”اب جان سے مارتا ہی جرم نہیں ہوگا۔ تو جو کچھ اور کرتا چاہتا تھا یا کر چکا کیا وہ جرم نہیں تھا...؟ جو

تھا...؟ اگر اتنی تلک تھی تو رتہ یوں کے پاس چلا جاتا... انھیں کیا اپنی بن مانگ کھا ہے کینے؟ اور

میں اس معصوم کو کیوں بھلا کر خاک کر دیا... جتنا بھلا انسان ہے یا شیطان... ایسی حرکت کرنے

میں کیوں نہیں کیا جو... مر کیوں نہیں گیا...؟“ رحیم نے سچو کو گردن کے پلڑے کی طرح

مٹا دیا۔

”معاف کر دے رخصت... معاف کر دے۔“ جو رخصت سے لپٹ کر گر گزرائے لگا۔ رخصت کے دل

کا ایک گولہ اٹھا اور آنکھوں کی چمک پہ چھایا۔ وہ نفرت برساتی نظروں سے جو کو گھورتے لگا۔

”معاف کرنے والا میں کون ہوتا ہوں... تو نے میرا جرم نہیں کیا جو! جن کا جرم کیا ہے ان سے معافی

میں... معافی مانگ۔“ رخصت نے کرب سے ہونٹ کاٹے ہوئے کہا رخصت کا دل چاہا کہ اس

ان کو مار مار کر اوروں سے بھلا کر دے۔ وہ ایسا غارخ زوہ کرتا تھا جو وہاں میں بھی بٹھانے کے قابل نہیں

تھا۔ نہ کر سکا۔ جو اس کا دوست جو تھا اور دوستی لیوں پر مالا ڈال گئی۔

”اے فوزیہ کے ابا۔ ذرا باہر جا کر دیکھنا تو سہی... شام ہو گئی ہے مگر میری بچی گھر نہیں لوٹی۔ جا کہوں۔؟“ رحمت کا دل ہولے ہولے کسما رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی بے چینی سے پریشان تھی۔

”ارے آجائے گی، یہیں کیسں کھیل رہی ہوگی، مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ اب باہر جا کر کھاؤں۔“ بشیر نے ٹھٹھا دلوار کے ساتھ لگتے ہوئے ہزاری سے کہا۔

”ارے زرا دیکھ لے تیرا کیا بگڑ جائے گا۔“ رحمت نے التجا کی۔
 ”دیکھ میرا سر نہ کھلا..... جاوٹ لے کر آئے ہوں نہ.... سر کھاتے جا رہی ہے۔“ بشر نے منہ

”ہر کسی کو انی لگی ہوئی ہے سارا دن دھکے کھاؤ ان کے لیے کماؤ پھر گھر لوٹو تو آرام نہیں، سالی

جھک شروع ہو جاتی ہے، ہونہ میں انسان ہوں مٹین نہیں.... چل روٹی لے کر آ میرا منہ کیا تک ہے۔" رحمت نے غصے سے شوہر کو دیکھا اور کچھ بولے بغیر چوٹھ کے پاس چلی گئی۔ بوڑھے نے اسے

”مردوں کے ہوتے ہوئے بھی عورتیں دھکے کھائیں.... بے غیرتی کی حد ہوگئی ہے۔“ رحمت بیگم نے کھانا گرم کیا اور شوہر کے سامنے رکھ دیا۔

ہوئی رقعہ سنبھال کر باہر نکل گئی، تو میسرے کے لبوں پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی۔ پھر وہ بڑے نوالے توڑنے لگا۔

شام ڈھل چکی تھی۔۔۔ فوئیبہ کا دور دور تک پتا نہیں تھا، رمت گھر گھر دھوی۔ فوئیبہ نے کہیں لی، ہی کہیں کوئی خبر لی۔ حتیٰ کہ محلے میں کسی نے اسے دیکھا بھی نہ تھا۔ رمت پریشان ہوئی جا رہی تھی۔

اسی تیزی سے خود کو کو سے جا رہی تھی۔ ”نہ مارتی نہ روٹھ کر بھاگتی....“

”ارے بیٹے رستم! تو نے میری فوزیہ کو کسیں دیکھا ہے؟ دوپہر سے غائب ہے!“

”اری پو تو نے دیکھا ہے فوزیہ کو؟“

رہے تھے اور سانس اوپر نیچے ہوئی جاری تھی۔

”ل...لاش...“ لالو کی جھنجھل گئی۔ پھر سب اپنی چارپائیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ الہ لاش تھی جو اپنے اوپر بیٹے ہوئے سنگدل لحوں کی داستان سناری تھی۔ چنانچہ یہ نظروں نے فوری طور پر لیا کہ وہ کسی نوخیز عمر کی معصوم بچی کی لاش ہے اور انسان کی شیطانیت کے اظہار کا بھرپور نمونہ۔ الہ سب کے سب یہی طرح خوفزدہ ہو کر کانپ رہے تھے مگر سبھی کو جیسے سناٹے میں سانپ سو گھٹ گیا تھا۔ ”ارے وہ پرانی گلی سے جو لڑکی ہم گونگی تھی کہیں یہ وہی تو نہیں ہے۔“ سناٹے کے سینے میں ایک اڑا۔

”ہاں ہاں واقعی! کوئی جاکر معلوم تو کرے۔“

”ارے نہیں یا رکون خواخواہ جھنجھٹ میں پڑے۔“

”ارے چلا جا یا رثواب ملے گا۔“

”تو خود کیوں نہیں چلا جاتا، ثواب بھی مل جائے گا۔“

”تو یہ! کیسی ہے جی سہی؟“

”اوئے... بھاگو بھاگو... پولس پولس؟“

”دھڑ... دھڑ... دھڑ... ارے پکڑو۔ جانے نہ پائیں... ارے کہاں جاتے ہو رو۔“ پھر ہمارے قدموں میں جیسے پڑ گئیں۔

”سب سے پہلے یہ لاش کس نے دیکھی تھی؟“ انسپکٹر تاج نے آنکھوں میں زندگی کا تجربہ اور مندی سمیٹ کر پوچھا۔

”ہاں ہاں یو... کس نے دیکھا تھا؟“

”جی وہ... ہمیں تو نہیں پتا، البتہ وہ جمال دودھ والا... جمال کا دل! اپنا نام سن کر میری دھڑکنے لگی۔ وہ ادھر ادھر دیکھ کر بھاگنے کی سوچنے لگی۔

”ارے جانا کہاں ہے؟“ سپاہی نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ ”ہاں تاکب دیکھا... کدھر دیکھا؟“

”جی وہ... جمال نے ڈرتے ڈرتے مارا جاڑا سنا دیا۔

”ٹھیک ہے، بشرِ جھولے والے کو بلاؤ۔ شاید یہ اس کی بیٹی ہے؟“ سپاہی بھاگے چلے گئے اور تاج جبکہ کر لاش کا بغور معائنہ کرنے لگا۔ لاش پر انسانی صورتِ سوزِ حالت تھی۔ انسپکٹر نے لاش کے سرے دھک دیا۔ انسپکٹر کا دل لرز سا گیا تھا۔ اچانک وہ کچھ دیکھ کر چونک سا پڑا۔ لاش کی ایک

ہوئی تھی۔ انسپکٹر نے ذرا سا دباؤ ڈال کر مٹھی کھول دی۔ وہ چند بال تھے، سرخ بال۔ انسپکٹر نے ہاں اور پھر ان چھوٹے چھوٹے بالوں کو ردال میں محفوظ کر لیا۔

”آٹکھوں میں جلتے بجتے دھب جلائے... مگر ہم جھوم کے قریب آگئی۔ پل صراط سے گزرتے ہاں کی شاید یہی تو حالت ہوگی... صرف ایک لمحہ... ایک ہی لمحے میں سارا فیصلہ... جنم یا جنت؟“

”ہاں... دیکھ یہ کون ہے؟“ انسپکٹر نے رحمت کو سہارا دیا۔ رحمت کی آنکھوں میں امید کے کتنے

”اللہ! اللہ! اللہ! اتنی تیز روشنی کہ... ہوئی کتنی نظر آجائے... پھر اب وہاں گھٹا پڑا اندھروں کے سوا

”اللہ... کیا ہو گیا؟“ وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ دل و دماغ سن ہوئے چلے گئے اور اندر

”نہیں... میری فوہ... نہیں...“ ہاں کی اماتا اتنے کرناک انداز میں چلائی کہ سارا عقدہ سم

”میرے اللہ... ہائے میرے مولا... ارے نہیں نہیں... میری فوہ... میری بچی... ظالموں یہ

”نہ... میری چاند...“ ایک دم وہ بھوکی شینی کی طرح پھر پڑی۔

”میرا دل یہ کیا کر دیا... ہائے اللہ... کوگو... بتاؤ میری بچی نے تمہارا کیا لگا ڈا تھا۔ کیا کیا تھا میری

”م نے میرے دل کے ٹکڑے کو کیوں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا خدا غارت کرے تمہیں۔ ہائے اللہ

”کس نے مارا ہے میرے چاند کو؟“ بتاؤ! بتاؤ! میں اس کا خون پی جاؤں گی اسے کچا چا

”ارے وہ کون حرامی ہے... وہ درندہ کون ہے؟ ارے مجھے کچھ بتاؤ! رحمت کی وحشت زدہ

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے لوگوں کے دل کی دھڑکنوں کو ساکت کر دیا تھا۔ ”آہ۔۔۔ اتنی رحمت کی آہوں نے سارے محلے کو لرزا رکھا تھا۔ وہ تو بالکل ہی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔ پولس اپنا فرض پوری دیا نہ تاروی اور فرض شناسی سے ادا کیا۔ سارے محلے کو تفتیش میں کھینٹ لیا۔ اس سے پوچھ تاچھ ہوئی۔ ہر فرد کو شک کی ترازو میں تولایا اور ذرا سے بھی شک پر کھال اور جھڑی کی ایک خوف دہراں سا چھایا ہوا تھا اخبار والوں کو تو جیسے قارون کے خزانے کی چابی مل گئی تھی۔ کمائیاں اور خبریں بنانی جاری تھیں۔

پھر ایک دن پولس نے بجوی کو غری کو ناکا اور صبح صبح چھاپہ مار دیا۔ اندر میلے کپیلے بسٹ میڈیک کی طرح چلی چلی آنکھیں یا ہر نگارے سفید اور زرد ہو جا رہا تھا۔ پولس کو آنا دیکھ کر بجوی دوڑتا خون جیم جیم کرے میں پھیلی ہوئی ٹھن اور گرمی نے انیسٹر کا دل خراب کر دیا۔ اس نے ہلکا ہلکا کھینچ کر بند کھڑکی کھول دی۔ باہر سے ٹھنڈی ہوا کا جھوکا اندر آیا تو سب نے اطمینان کی سانس لے لی۔ ٹھنڈی ہوا اور گرمی نظروں سے پورے کرے کا جائزہ لیا۔ کھونٹیوں پر میلے مہرے ہوتے تھے۔ ایک کونے میں ٹوٹے چھوٹے ٹین کے دو صندوق بھی دھرے تھے۔ جن پر کئی ادا پڑے تھے۔ دیواروں پر فلمی اداکاروں کی نقش تصویریں اور پرانے کنڈر چسپاں تھے۔ ایک کونے میں مٹی کے تیل کا اسٹور رکھا تھا اس کے ساتھ زین پر چند کندے برتن بھی پڑے تھے۔ انیسٹر چونکا۔ اسٹور کے قریب سرخ چوڑیوں کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پڑے تھے۔ اس سے جبکہ کر انھیں سیٹھ لیا۔

”یہ۔۔۔ میری من کی چوڑیاں ہیں۔۔۔ میں اس کے لیے لایا تھا۔ مگر میں رکھے رکھے وہ ٹوٹنے کے خوف زدہ آواز میں صفائی پیش کی۔

”ہومت!“ انیسٹر نے چوڑیاں سپاہی کے حوالے کر کے سختی سے کہا اور پھر غور سے ہر چہرے کو اپنے تجربات کی روشنی میں جانچنے لگا۔ کیا ایک اس کے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا یہ کان زدہ چہرے پر۔۔۔ سرخ ہال۔۔۔ بجو کے سرخ ہال۔۔۔ پھر اس پر کئی سربست راز خود بخود دیاں۔ ”ماہد!“ اس نے ماتحت کو مخاطب کیا اور گھر کے انداز میں بجوی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اسے بھڑکی لگا لو۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں بے قصور ہوں۔۔۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔“ لیکن اس جملے کے ٹکڑے قتل ہی لوہے کی سرکڑیوں نے اس کی کلائیوں کا احاطہ کر لیا تھا۔ اخبار والوں کو ایک اور تازہ

”معلوم فوزیہ کا وحشی درندہ صفت قاتل پکڑا گیا۔“ اور محلے والوں نے دانستوں سے انگلیاں دبا دیں۔ ”تو یہ کیسے کیسے درندہ لوگ ہیں اس دنیا میں۔“

”خدا غارت کرے گا۔۔۔“ ”تو یہ کیسے کیسے درندہ لوگ ہیں اس دنیا میں۔“

”خدا غارت کرے گا۔۔۔“ ”تو یہ کیسے کیسے درندہ لوگ ہیں اس دنیا میں۔“

”خدا غارت کرے گا۔۔۔“ ”تو یہ کیسے کیسے درندہ لوگ ہیں اس دنیا میں۔“

”خدا غارت کرے گا۔۔۔“ ”تو یہ کیسے کیسے درندہ لوگ ہیں اس دنیا میں۔“

”خدا غارت کرے گا۔۔۔“ ”تو یہ کیسے کیسے درندہ لوگ ہیں اس دنیا میں۔“

”خدا غارت کرے گا۔۔۔“ ”تو یہ کیسے کیسے درندہ لوگ ہیں اس دنیا میں۔“

”خدا غارت کرے گا۔۔۔“ ”تو یہ کیسے کیسے درندہ لوگ ہیں اس دنیا میں۔“

جانا بند ہے۔۔۔ لوگ خواہ خواہ باتیں بتائیں گے۔۔۔

بڑی سوسائٹی کے لوگ ہم غریبوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔۔۔

اماں نے آنسو پونچھتے ہوئے درد بھری آواز میں کہا۔ رحیم پر یہ انکشاف ہم بن کر بھڑا اور دھواں مچا گیا۔

”پیارے بیٹا! خدا کے واسطے مجھ غریب پر رحم کر۔۔۔ بھوکے خاطر نہ سہی ایک ماں کی خاطر چھوڑے، لے میرے پاس ان کا پتا بھی ہے“ اماں نے گڑبڑا کر ہاتھ جوڑے تو اس کا دل بھی چھل۔

”بلہ لوں گی۔۔۔“ رحمت باگلوں کی طرح کبھی چھتی اور کبھی رونے لگتی۔۔۔ رحیم دل ہی دل میں ”باگل عورت تو کس طرح بدلہ لے سکتی ہے تیرے پاس ہے ہی کیا۔ نہ دولت نہ سفارش، بس اپنی جان کو ہلکان کرتی رہ اس کے سوا کچھ اور نہ ہوگا۔“

اماں تو نے رنچے۔۔۔ مجو رہا ہو گیا ہے۔ بول کیا وہ بے گناہ ہے! بول رنچے۔۔۔ اسے سزا کیوں نہیں کیسا اندھیر ہے۔۔۔؟ یہ کیا انصاف ہے؟ بول رنچے! میں کیا کروں۔۔۔؟ وہ رحیم کو جھنجھوڑ کر چھٹی رحیم رنچے سکتے کے عالم میں بیٹھا تھا اور سبھی مدعو عورتیں بیٹگی آنکھوں سے رحمت کو دیکھ رہے تھے کہ ہر کارواڑہ کھلا اور بھوکے اماں اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے سر جھکائے پشیمان سا جو کھڑا رحیم کی طرح چوک پڑے تھے۔

اماں ماں کے قدموں سے لپٹ کر معافی مانگ حرامی۔۔۔ بھوکے اماں نے بھوکے گردن میں ہاتھ دے کر رحمت کے قدموں میں گرے گئے ہوئے زور سے کہا تو رحمت کی زخمی شیرینی کی طرح چوکی۔ اس کی اور رحمت زورہ نظریں پہلے بھوکے اماں کے چہرے پر گئیں اور لوٹ کر اپنے قدموں میں پڑے ہوئے سر رکھیں۔ وہ چند لمحوں تک ویران ویران آنکھوں سے بھوکو گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں سرست دیاں اور انتقام کے شعلے بھی کچھ تھے۔ رحمت کے مختصر ہوتے چہرے کو دیکھ کر بھوکا اور دہاں موجود تمام لوگوں کے بدن میں منفی سی ہونے لگی تھی۔

تو میری بیٹی کا قاتل۔۔۔ میرے گھر میں داخل کیسے ہوا؟ رحمت چچی۔

اماں کرے ماں، مجھے معاف کرے۔۔۔“ جو اس کے قدموں سے لپٹے ہوئے گڑبڑایا۔ ”میں تیرا بھائی ہوں۔“

رحمت۔۔۔ کتے۔۔۔ وحشی دور ہٹ جا۔ مجھے چھو کر ناپاک نہ کر۔ اپنے ناپاک گندے وجود کو میرے ہاتھ زایل کیجئے، درندے، حرام زادے، درندہ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔“

اماں معاف کرے۔۔۔ بچہ ہے۔ بس ایک بار اسے معافی دے دے پھر میں پیشہ کے لیے اسے تیری دور کر دوں گی۔ اس کتے نے تیری کوکھ اجاڑ کر مجھے بھی سارے زمانے میں رسوا کر دیا ہے۔ اس مجھ کر اس کا گناہ معاف کر دے میری مظلوم بہن اسے معاف کر دے۔ میں زندگی بھر تیری امی کی۔“ بھوکے اماں نے دونوں ہاتھ جوڑ لیے۔

اماں کر دوں۔۔۔؟ کیسے معاف کر دوں۔۔۔ ہاتھ اپنی بیٹی کی چیخوں، گریاؤں اور آہوں کو کیسے مٹاؤں اس نے اس ذلیل درندہ سے بچنے کے لیے اپنے منہ سے نکالی ہوں گی۔ اس حرامی نے

”ارے لوگو! دیکھنا۔۔۔ بھوکا حشر۔۔۔ تپ تپ کر جان نہ دے تو کتنا۔۔۔ یہ ایک وحشی ماں کے ہے۔۔۔ اے اللہ! میرے آنسوؤں کی لاج رکھ لیتا۔۔۔“ رحمت ہر لمحہ فریادیں کرتی رہتی آنکھیں مقدمے پر لگی ہوئی تھیں اور فیصلہ تو صاف ظاہر تھا۔۔۔ فوریہ کے خون میں لت پت ہو کر کوٹھڑی کی دشمن سے برآمد ہو گئے تھے۔ اس کی بند مٹھی سے برآمد ہونے والے سرخ بال۔۔۔ چوڑیوں کی تصدیق بستی والوں نے کر دی تھی۔ مقدمہ بھی بھوکے خلاف چارہ تھا۔ اس کا وکیل کمزور تھا۔ یا شاید بھوکے کمزور فیس ادا کی تھی۔ ساری بات تو روٹیوں کی ہے۔ ایک بند بھوکے کے پاس آئی اور سوڈی میں بھوکے کے رحم و کرم تک کر لے گئی۔ رنچے نے بھی فوراً سوڈی دے دیا۔ پھر اچانک۔۔۔ نیکاب بازی پلٹنے لگی۔ مقدمہ نہ ہوا گویا شطرنج کی بازی ہو گئی۔ بھوکے کی جگہ شہر کا بے سے منہ اور مضبوط وکیل آگیا۔ سرکاری وکیل پوتا اور ٹالا جاتا۔ بھوکا کا سنا جاتا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ لوگوں میں کھسک پھر شروع ہو گئی۔ آنکھوں میں حیرانی پھیل گئی۔ روٹی بے ادالت کے چکر لگتی رہی۔ اس نے اپنا۔۔۔ سوتا، برتن۔۔۔ گھر باسب کچھ بیچ دیا۔ جان بچانے بھی حسب حیثیت مدد کی۔

رحیم اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ اور بن رہا تھا۔ مقدمے کا جج بھوکا بنوئی تھا مگر رشتوں کا پابند ہے۔ رحیم کو اس کا یقین نہ تھا پھر ایک دھماکا ہوا اور رحمت کی روح تک کاٹ ایک بھاری رقم کے عوض بھوکے ضمانت منظور ہو گئی اور وہ آزاد ہو گیا۔

”جو رہا نہیں ہو سکا۔۔۔ وہ قاتل ہے۔ اسے سزا ملنی چاہیے میرے مولا۔۔۔ وہ میری بیٹی کا قاتل ہے۔ اسے چھوڑ دیا۔ یا اللہ مجھے میری معصوم بیٹی کے خون کا بدلہ چاہیے۔ میں اس

میری معصوم بھول ایسی بچی کو مستحوذ تھا یہ اس کا قاتل ہے اور تو بہن کا واسطہ دے کر چاہتی ہے کہ میں اسے معاف کر دوں اور تیری کوکھ ٹھنڈی رہے۔ میں اس کتے کو کیسے معاف کر دوں.... میرا انتقام زندہ اور ہمیشہ زندہ رہے گا لیکن میرا انتقام اللہ تجھ سے لے گا۔ دینا والے بھلے اسے معاف کر دیں لیکن قدر اسے نہیں بخشے گی۔ میری بچی کا خون ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔ میں اس کو معاف نہیں کر سکتی.... قیامت کے دن بھی جیچ کچھ کر خدا سے التجا کروں گی.... یا اللہ اس کتے کو بھی اسی طرح تیرا تیرا سکا سکا کر مار جس طرح میری فوئیدہ کو اس نے مارا ہے۔ ارے کیا کوئی ماں اپنے بچہ گروہوں کے لیے اسے کو بھی معاف کر سکتی ہے؟ نہیں میں بھی اسے معاف نہیں کر سکتی۔ تم اپنے منجھن بیٹے کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔ میری نظروں سے اسے دور کرو ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گی۔ نکل جاؤ! فوری نکل میرے گھر سے، دیکھو سنو اس کے کندے وجود کے یہاں آجائے تو فوئیدہ کی روح بھی رو رہی ہے۔ ہاں وہ رو رہی ہے میری فوئیدہ! یہ کہہ کر وہ دھاڑیں مارتی ہوئی شیر سے لپٹ گئی۔

بھو کی اماں.... بیٹے کو بازو سے پکڑ کر تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گئی۔ اسی لمحے رحیم... نفرت جو کے وجود کو دیکھتا رہا۔

وقت کا پسیا اپنے پیچھے ماہ و سال کا ڈھیروں گرد غبار اڑاتا تیزی سے گھوم رہا تھا۔ وقت جو قاتل مسیحا بھی ہے۔ وقت جو دوست ہی نہیں دشمن بھی ہے۔ لمحے دلوں میں، دن، بھٹوں میں اور ہنسنے مینوں سالوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ فوئیدہ کی المناک موت دھیرے دھیرے ایک پرانی کہانی بنی۔ لوگ اسے بھولتے گئے لیکن رمت کی کوکھ کا زخم تازہ کا تازہ ہی رہا۔ تجوری ہو کر فیصل آباد چلا رحیم نے بازار میں ایک چھوٹی سے دکان کھولی۔ وقت کی تیز رفتار پیچھی کی طرح اڑتا رہا اور طویل سال بیت گئے۔ رمت اب بھی کبھی راتوں کو سسکتی فوئیدہ کی یاد کو کیجیے سے لگے اندر ہی اندر رہتی اور اس کے لبوں سے یہ آواز نکلتی رہتی۔ "یا اللہ بدلہ ضرور لینا ورنہ میرا تجھ سے ایمان اٹھ گا۔"

مجھ کے فیصل آباد چلے جانے کے بعد رحیم کی اس سے ملاقات بھی نہیں رہی لیکن وہ ہمیشہ سوچا کہ قدرت کے کارخانے میں دیر تو ہو سکتی ہے اندھیر نہیں ہوتا چاہیے اور بھوکو اس کے گناہوں کی سزا ملنی چاہیے کیونکہ خدا انصاف ہے اور رمت کے ساتھ یہ یقیناً انصاف ہونا چاہیے۔ وہ غیر متوقع قدرت کی جانب سے کسی انتقام کا شہر تھا۔

ایک یہودی "اسرائیل میں آنے والے نو آباد کار سے ملک کے مستقبل پر گفتگو کر رہا تھا۔ "ہمیں بے شمار کام ملے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "ہمیں اسرائیل کو وہی شکل دینا ہوگی جو حضرت موسیٰ نے ارض موہوہ کی خواب میں دیکھی تھی۔"

"واقعی ہمیں یہ کام کرنا چاہیے۔" نو آباد کار نے جواب دیا۔

"میں اسرائیل کو سو ٹریلینڈ بنا دینا ہوگا۔" پرانے یہودی نے بات جاری رکھی۔ "شرق اور مغرب ہمارے لیے ہیں، لیکن ہمیں ان کی جنگ سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ جیسے سو ٹریلینڈ نے بڑی جتنی سے غیر آبادی کی پالیسی اپنا رکھی ہے۔"

"اں ہاں" نو آباد کار بڑبڑایا۔

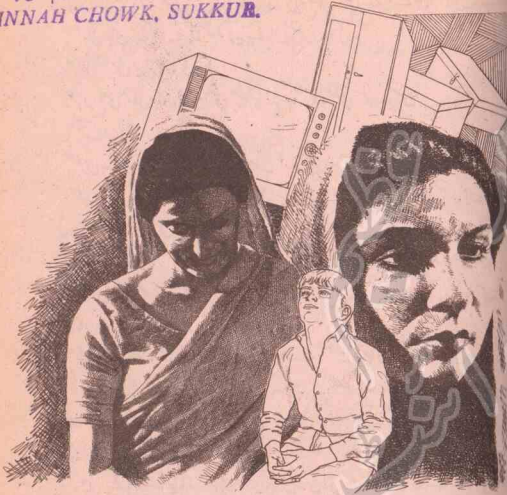
"میں قدرتی وسائل تھوڑی تعداد میں بیچ رہا ہوں، لیکن سو ٹریلینڈ والوں کی طرح مخصوص صنعتوں کو ترقی دینی۔" پرانے یہودی نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور انہی کی طرح ہمیں زمین کی کاشت اور نکلوں کی رکھوالی سے کرنی چاہئے۔ سمجھ گئے نا!"

"اں۔" اسرائیلی نے جواب دیا۔ "سب کچھ سمجھ گیا۔ مگر ایک بات پلے نہ پڑی۔"

"حضرت موسیٰ چلتے چلتے سو ٹریلینڈ میں کیوں نہ پہنچ گئے؟"

(مرسلہ: شبینہ رفت۔ والتین لاہور)

ادن وہ تھا مائدہ دکان بند کر کے جب گھر لوٹا تو اسے مجھ کا خط ملا۔ جس میں مجھ نے اسے فیصل آباد کو روت دی تھی اور لکھا تھا کہ اب وہ مجھ سے مجید مستری بن گیا ہے۔ اپنا ذاتی ورکشاپ بھی کھول اس میں دوچار لڑکے اور بھی کام پر رکھے ہیں۔ ایک اچھا سا گھر بھی خرید لیا ہے اور اب اس کی دکان تاریخ بھی ملے ہوئے والی ہے اس لیے وہ چلی نہیں اسے آجائے خط پڑھ کر نیم پر تک گھروں نکلاں رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیوں کر اور کس طرح اتنی جلدی مجھ نے ہزاروں روپے اور اب اس کی شادی بھی ہونے والی ہے جبکہ وہ ذہنی طور پر مجھ کو تباہ حال اور پر یاد پریشان دیکھنے کا تھا۔ بہر حال اس کے لیے تو یہ خط ایک دھماکا ثابت ہوا اور اسے شاک سا لگا۔ دو تین دن وہ اس سوچا رہا کہ یہ کیا انصاف ہے کہ ایک قاتل آرام سے گھوم پھر رہا اور روپیا کما رہا ہے جبکہ مقتول ہرگز زرنے والے دن کے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ مفلس و قلاش ہوتا جا رہا ہے۔ کیا خدا انتقام لے سکتا؟ کیا وہ اپنے بندوں کے جذبات و احساسات کا بھی خیال نہیں رکھتا؟ کیا قدرت کے پاس



گوج

مسلمی عربی پاکیزہ گھر اور تقدس سے گزار دینے والی ماں کا (الیہ حیرتیں کشا ہوں
کا دیو جنہ، سپاہ کی مگر بی بی کے گناہ کی گوج پہننے کے کہہ کر کیا دیکھ کر

ایک بدھ مت سنگھ اشتر کمال

روایت اخلاق



بدلیا انتقام لینے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ کیا خدا اس قدر مجبور ولاچار ہے.....؟

پھر ایک آنجنائے جذبے کے تحت وہ ایک بیگ میں اپنا سامان رکھ کر ریلوے اسٹیشن چلا گیا۔
تاگے والے نے مجید مستری کی ورکشاپ تک پہنچا دیا۔ وہ جگہ سے اچانک مل کر اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا
اس لیے اس نے اپنے پروگرام سے مجھ کو لاعلم رکھا تھا جب اس نے مجھ کو دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں
یقین نہیں آیا..... مجھ کو سر تپا بدل گیا تھا۔ رنگت قدرے صاف ہو گئی تھی، وزن پہلے سے بھی بڑھ گیا
مذوق چہرے کی جگہ بھرے بھرے گالوں نے لی تھی، وہ صاف سحرے کپڑے پہنے پہنتے سیاتے
بنائے سلیر پہنے ہوئے اپنے ماتحت لڑکوں کو کوئی حکم دے رہا تھا اس کی باتیں کلائی میں قیمتی سنری
ہاتھ کی ہر جنبش سے آب و تاب دکھا رہی تھی۔

رحیم کو جیسے ساپ سوگھ گیا۔ اس کے دماغ میں بگولے سے اٹھے جنھوں نے اس کے سارے
اپنے گھیرے میں لے لیا۔ کانوں میں سائیں سائیں ہوائیں چلنے لگیں اور منہ میں جیسے سمندر کی
بھرنی تھی جس کی کراہٹ اسے اپنی روح میں اترتی محسوس ہوئی اور ہمیشہ اس کے دماغ میں رہ
ناگ کی طرح پھینکارتا ہوا سوال، ”کیا قدرت کے پاس انصاف نہیں ہے؟ کیا قدرت کے ہاں انتقام
ذریعہ نہیں ہے.....؟“ دوبارہ ڈنسنے لگا اور وہ ورکشاپ کے گیٹ پر ہی کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اچانک
پر نظر پڑی تو وہ تیز تیز قدموں سے۔ ”میرے یار، میرے دوست“ کہتا ہوا باغ میں پھیلنے آکر
پہنچ گیا مگر وہ اپنے ہوش و حواس میں کہاں تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اے کاش! اگر
ہی رہتا اور مجید مستری نہ بنتا۔ ایک لمحے کے بڑا زور محسوس میں اس کے دماغ میں کئی دھماکے
فورا لہروں پر ایک زہریلا تبسم پھیلا گیا۔ رحیم کا ہاتھ انتہائی تیزی سے باتیں ہاتھ میں لئے ہوئے
ریگ گیا اور دوسرے ہی لمحے اس کا گرا ری والا چاقو تھک تک مجید مستری کے سینے میں بھونکا
تھا۔ مجید مستری کے منہ سے ایک کمرہ جھنجھل نکلی اور اس کی آنکھیں وحشت و حیرانی سے پٹی کی
گئیں۔ وہ ایک چکر کھاکر زمین پر گر گیا اور چند لمحوں میں ساکت ہو گیا۔

حوالات میں جھکلی پہنے دیوار سے ٹیک لگا کر بھڑا ہوا رحیم مسلسل سوچ رہا تھا کہ خدا کے
انصاف ہے اور انتقام کا ذریعہ بھی اور یہ ذریعہ تو وہ خود تھا۔

اور جب میں نے پچھلے پرن الماری بند کی تو صوفیہ آپنی نے بڑے ہی اطمینان سے کہا۔
”ممائی جان نے کہا ہے کہ تم فزویہ کے ہاں نہیں جاؤ گی۔“

”کیا؟“ میں حیران رہ گئی۔

”ہاں بھی ممائی جان نے واقعی منع کیا ہے۔“ آپنی قطعی سنجیدہ تھیں
”تو کیوں؟“

”اس لیے کہ ماموں کے دوست کی بیوی آرہی ہیں۔“ آپنی نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔

”ابا جان کے دوست کی بیوی؟ تو کیا ابا جان کی بیوی ان کے لیے کافی نہیں ہیں؟“ میں نے
آپنی بے اختیار ہنس دیں۔

”جناب ماموں جان کے دوست کی بیوی کے ساتھ ان کی بیوی کی بیٹی کا ہونا ضروری ہے۔“
”تو آپ اپنی چٹانک بھری زبان کو اس وقت زحمت نہیں دے سکتی تھیں جب میں کپڑوں
میں پٹکان ہو رہی تھی۔“ میں ہنسنے لگی۔

”پھر تمہیں تنگ کیسے کرتی۔“ آپنی شرارت سے آنکھیں پچائی ہوئی اٹھ گئیں۔
فزویہ میری کلاس فیلو تھی۔ اپنی زندگی کے میں خوب صورت سال پورے کر لینے پر آج اس
کیا ہوا تھا۔ دو گھنٹے کی جان لیوا مشقت کے بعد کوئی جو اس مناسب لگا تھا تو گھر کی بھی مرضی
بروقت تیار ہوئی تھی اور اب آپنی ابا کی حکم سن کر سارا پروگرام دہم برہم کر گئیں۔ تب ان
سن کر میں نے ہار پرکھنا چاہا کہ کارڈ روم میں کھڑی ہوئی امی جان نے بے حد غصے سے گھورا۔

”صوفیہ کے ساتھ آنا۔“ وہ ممان کے استقبال کے لیے بڑھ گئیں اور اپنے کمرے
کھڑی آپنی نے بدقت تمام اپنی ہنسی روکی۔

”یہ چکر کیا ہے آپنی آج آپ اس قدر ہراساں کر رہیں کیوں کر رہی ہیں؟“ میں بے حد
”بس ویسے ہی ممائی جان کی بات پر ہنسی آگئی تھی۔“ آپنی سنجیدہ ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد
بلایا پر مجھے آپنی کے ساتھ ذرا تنگ روم میں جانا پڑا۔ مسز جن ایک شفیق اور
تھیں۔ انھوں نے میرے آداب کا جواب بہت ساری دعاؤں سے دیا اور ایک نازک دھماکا
لوکی نئے دیکھ کر بے ساختہ شہنم میں بیٹگی ہوئی گلاب کی ادھ کھلی کلی یاد آجاتی تھی۔ اس
میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بیٹھ گئی جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ دھیمے دھیمے شرارت
کرتی ہوئی وہ لوکی مجھے بے حد اچھی لگی۔ اگر میرا سے آپنی کی مشکلی نہ ہوئی ہوتی تو میں
بنا لیتی تب ہی شر توڑالی لے کر آگیا۔ امی جان نے چاہے پر بے حد اہتمام کیا ہوا تھا۔

لہر کر وہ دونوں لوٹ گئیں۔

”الہیہ آخر آج اس قدر سپنس کیوں ہے گھر میں؟“ میں نے حیرانی سے آپنی سے پوچھا۔

”اس لیے کہ ماموں جان ایک عدد جوان جہان بیٹی کے والد بزرگوار بھی ہیں۔“ آپنی نے ڈریسنگ ٹیبل

اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اس قدر اطمینان سے جواب دیا کہ میں بس چڑی تو گئی۔

”دوست کی بیوی.....؟“

”ایک عدد جوان جہان بیٹی کی والدہ محترمہ ہیں۔“ آپنی انتہائی رसान سے بولیں۔

”کے پہلے سے کیوں نہیں بتایا گیا۔“

”ابا جان نے تو کہا تھا گھر میں لے جان تو مجھ کو نہیں بتایا، تم خواہ مخواہ نروس ہوتیں۔“ آپنی نے بے
”اس کے کما بات ٹھیک ہی تھی پھر بجائے کیوں مجھے ڈھیر ساری شرم آگئی۔“

رات دیر تک گریہ قدموں سے بے چین قطعی کی طرح سارے گھر میں چکر لگاتی پھریں کہ کسی
میں معلوم ہو جائے۔ میرا کلیجہ ہر بار آپنی کو اپنے کمرے میں دیکھ کر مند کو آنے لگا مگر آپنی ہر بار
لانا کرتی تھی میں سر ہلاتی واپس ہو جاتیں۔ آخر کفر تو خدا خدا کر کے رات بہت دیر گئے آپنی

میں آئیں۔
”بھلا ہو گیا عدنان صاحب کے حق میں۔“

”کون عدنان؟“ میں نے سراپکی سے پوچھا۔

”جی عدنان۔ ابا جان کے دوست کی بیوی کے بیٹے۔“ آپنی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
”ان کے دوست کی بیوی کے بیٹے ابا جان کے دوست کے بچے لگتے ہیں کیا۔ یا پھر یہ کہ دوست کی

”امادیاں کر رہی ہیں۔“ میں نے چڑکھاتو آپنی ہنس پڑیں۔
”اتنے گھما پھرا کر غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ صاف کہہ دو آپنی صاحب اب یہاں سے
”ہاں میں نے دنیا کے ہنڈولے میں جھولنے ہوئے ٹھٹھے اور سندر سپنے دیکھ سکوں۔“ آپنی
اور وہی تھیں۔ پھر خود ہی اٹھ کر چلی گئیں اور جاتے جاتے میرے کمرے کا دروازہ بھی بند

”میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر زیر لب دہرایا۔“ بجائے کون صاحب ہیں نہ جان نہ پچان انجینی
”اتنے شناسا ہو جائیں گے کہ..... میں جینپ سی گئی۔“

”صرف ڈیڑھ سال بڑی تھیں۔ میری اکوٹی پچوٹی کی اکوٹی اولاد۔ پچوہا اس جہان کو اس
”گئے تھے جب صوفیہ آپنی ابھی صرف ڈیڑھ برس ہی کی تھیں اور میری نازک سی گریے

ہے ارے کیا نام ہے ان کا؟ ہاں عدنان صاحب۔

”ان؟“ میں بری طرح چونک پڑی اور آپنی نے شرارت سے آنکھیں میچ کر کہا۔

”ہاں بھی کل صبح کی فلاٹ سے وہ اچانک ہی آگئے تھے اور آج کمانی جان وغیرہ سے ملنے آگئے۔“

”اے اے حد افسوس ہوا۔“ ہونے والا باد پیلے پھل گھر آیا اور ان سے کوئی بھی نہ ملا اب جان فاروقی

صاحب کے گھر گئے ہوئے تھے پھر آپنی نے دیے دیے لپٹے میں کہا۔

”کمانی جان کا تو صرف بمانہ تھا وہ گردن۔۔۔ یہ سن کر امی جان مسکراہٹ ہونٹوں میں دہائی اپنے

میں چل گئیں اور پھوٹی جان کو سامان کھول کھول کر دکھانے لگیں۔

اس رات مجھے بہت افسوس رہا تھا۔ کس قدر اشتیاق تھا۔ اس انجان لیکن اپنی سی شخصیت کو دیکھنے کا

میں اب اس کے موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اگلے دن سوائے میرے سب ہی رخصت صاحب کے گھر چلے گئے

میں اکیلی گھر میں پڑی پور ہوتی رہی۔ آپنی واپس آئیں تو دھکا کیا کہ شادی کی تاریخ نے ۲ گھر مقرر ہوئی

کر لی تھی ۳ ماہ باقی تھے اور مزید یہ کہ وہ لوگ مفتی پر اصرار کر رہے تھے۔

انہیں روز بعد فاروقی صاحب کے ہاں ان کے نواسے کی سالگرہ تھی اور ہم سب بھی مدعو تھے۔ شرفِ روز

کی پہنچی پر تھا۔ آپنی کی دوست شام کو ملے آ رہی تھیں اس لیے آپنی کا موڈ ہونے کے باوجود نہ

کس۔ بے حد خوشگوار احوال میں سالگرہ کی رسم ادا ہوئی۔ فاروقی صاحب کی بیٹیاں مجھے چپکے چپکے چھیڑتی

میں سن سناتے تھے خوشیوں کے بادلوں کو دھیمی دھیمی مسکراہٹ سے برساتی رہی۔

شام ڈھلے ہم لوگ واپس آئے تو آپنی پر آمد کے کی میزبوں پر گلے سے اندھیرے میں بھیدیں پر چہر

ہے بہت بوری بیٹھی تھی۔

”ایا بات ہے آپنی؟“ صائے نہیں آئی کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ آپنی نے انتہائی دھیمے میں جواب دیا۔

میں اپنے کمرے میں ڈیرنگ ٹیبل کے سامنے ہار اکر رہی تھی کہ آپنی آئیں۔ میں نے بے اختیار

دک کر دیکھا۔ وہ سیاہ امریکن جارنٹ کی فنگنگ والی قیض بغیر قمیص پہنے ہوئے تھیں جو اوپر سے بیگ

ہاں سے چپکی جاری تھی جس سے آپنی کا گلابی گلابی بدن پھٹا پڑ رہا تھا۔

”آپنی آپنی تو“ کر دیے جانے والی ہو رہی ہیں۔“ میں نے خوشی دکھائی۔

”ہاں یا رکھ میں کوئی تھا تو نہیں پھر اس قدر گرمی بھی تھی۔ اس لیے کپڑوں میں پانی ڈالتے ڈالتے

اپنے اوپر بھی ڈال لیا۔“

”نہیں صائے کیوں نہیں آئی جس کا اختار تھا وہ نہ آئی ہاں عدنان صاحب البتہ آگئے۔“ آپنی نے

رنگ پسند کرنے والی نفیس سی پھوٹی جان بیوگی کا سفید دوپٹہ اوڑھ کر ہمارے گھر آئیں۔ اپنا بے کراں

پسنے سے لگائے، مہر و ضبط کا مجسمہ بن کر انھوں نے بھی مجھے صوفیہ آپنی کے ساتھ پالا پوسا اور میرا نام

چاؤ سے مدد رکھا۔ ”مددچہ اچھل۔“

میرے بڑے بھائی اشعر آپنی سے پورے چار برس بڑے تھے۔ بہت عرصے تک امی ابونے انھیں

کا پچھولا بنائے رکھا۔ وہ سنجیدہ اور کتابوں میں گم رہنے والی شخصیت تھے۔ آپنی مجھ سے صرف ایک

بڑی تھیں لیکن ان کا نام لینے کی سختی سے ممانعت تھی۔

ایف آر سی ایس کے لیے بیرون ملک جانے سے چھ ماہ قبل آپنی اور اشعر بھائی کی مفتی بڑی دھوم

مچا رہے تھے۔

مفتی کے بعد بیوی کی شخصیت میں ایک بے ساختہ اور نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ آپنی

اے آنا کس کا فاضل اشعر تھا اور میرا پریولس لیکن درمیان میں ایک دم سی ستر جن آچکیں اور

لیے آئے والا یہ سلاشر اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔

صبح ناشتی کی میز پر میں بچانے کیوں نروس سی ہو رہی تھی۔ اب ابا جان سے شرم آرہی تھی۔ میں

چائے کا کپ ختم کر کے یاہری چل آئی۔ تب ہی آپنی بھی کپ تائیں سنبھال آئیں۔

”کیوں ہو بھوک پیاس ہی اڑ گئی۔ ایک ہم ہیں کہ مفتی کے بعد سے ہماری خوراک میں مسلسل

ہو رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ فیکٹر تک میں تبدیلی آئی ہے۔“ آپنی نے انتہائی مبالغے سے کام لیا تھا۔

نظر آپنی کے قناب سر پہ پر ذاتی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں میں دیا ہے گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔

اور پھر شادی کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئیں۔ امی جان اور پھوٹی سارا دن بازاروں

کاٹ کر آئیں تو محکم کے بیڑ حال ہو جائیں مگر اگلے دن صبح سے پھر وہی چلے۔ اکثر ویڈیو

لوگوں کے ساتھ جانا پڑتا۔ امی جان چاہتی تھیں کہ سب سامان میری پسند اور مرضی کا ہو۔

ایک شام ہم لوگ بازار جانے کے لیے تیار تھے اور آپنی ابھی تک سوکری نہ اٹھی تھیں۔

انھیں دنگا کر جانے کے لیے پوچھا تو انھوں نے انکار کر دیا۔

”میرے سر میں سخت درد ہے تم لوگ چلی جاؤ۔“ اور اس شام ہم سب جب بے حد طویل شا

لوئے تو انتہائی تھکے ہوئے تھے۔ شینگ کا سارا سامان شروٹے گاڑی سے نکال کر ڈرائنگ

قالبیں پر ڈھیر کر دیا۔ تب ہی آپنی نمایاں لی آئیں۔

”کیا بات ہے؟ سوئے سے اٹھ کر آئی ہو کیا؟“ پھوٹی جان نے تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔

”جی امی جان۔ اس قدر شدید درد تھا سر میں کہ بیان نہیں کر سکتی اور جیسے ہی اس پر ہمارا

ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

”کب؟“ میں تیزی سے پلٹی کہ ڈرائیونگ ٹیبل پر رکھی ہوئی پرفیوم کی شیشی میرا آنچل لگنے لگا۔
گر کے چکنا چور ہو گئی۔

”کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے آئے تھے، منگنی کی انگوٹھی کے لیے ناپ چاہیے تھا۔“

میں نے بے حد تاسف سے سوچا۔ ”دھت تیرے کی مدد کے لئے یہ دوسرا موقع بھی گیا۔“

اگلی شام آپنی صائمہ کے ہاں سے ہو کر آئیں تو پتا چلا کہ وہ سب اچانک ہی پینڈی چلے گئے ہیں۔ صائمہ کا بڑا بھائی عاصم گھر پر تھا جو بڑے دوستوں کی صحبت میں بگڑا ہوا اداش سالز کا تھا۔

”توبہ ہے رکشا میں سفر کرو تو بال بالکل ہی بے قابو ہو جاتے ہیں۔ آپ نے جھنجھلا کر اپنے بال ہوئے کہا لیکن مجھے آپ کی کچھ نڈھال اور تھکی تھکی سی لگیں۔“

میں دن بعد میری مفتی تھی۔ کشمکش رنگ کا کم خواب کا غرارہ سوٹ میرا مفتی کا جوڑا تھا۔ آبی کرتے ہوئے چھپرتی ہیں مگر یہ چھپر چھاڑا انتہائی خوبصورت لگی تب ہی عدنان کی شکر دہی بس اندر

”اللہ بھابی جان اب آ بھی چکے۔“ اس نے کہا تو میں بری طرح شرما گئی۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ کسی نے پوچھا۔

”کانتار حمان۔“ جواب ملا۔

”کانتا؟“ لمرے میں موجود تمام ہی لڑکیاں حیرت سے چونک پڑیں۔

”ہاں کامتا۔“ اس نے ہولے سے سسکا کر کہا۔ ”یہ نام بھیا کی پسند ہے بھیا کہتے ہیں کہ انسان کے شعور میں بسنے والے مقدس جذبے کا نام ہے اور صرف ناموں سے کوئی ہندو یا مسلمان متکبر شخص کسی کو خدا نہیں کہہ سکتا۔“

پھر میں سب کے ساتھ سر جھکائے کل کل قدموں سے ڈرائنگ روم میں آئی۔ بیگم

دور تلوں والی بیٹی انگوٹھی پہنا کر سکنی کی رسم ادا کی اور میرا منہ میٹھا

جب تمام مہمان رخصت ہوئے تو آپنی دوبارہ میرے کمرے میں آگئیں۔

ان کو دیکھنے کے دو خوبصورت مواقع ہاتھ سے نکل گئے تھے لہذا میں نے جی الامکان گھر سے نکلتا کم اور بات تھی کہ عدنان پھر آئے ہی نہیں اور جب آئے ان کا چہرہ اسرے کی زرتار لڑیوں کے ادا تھا۔

العلیم مکمل ہونے کا بھی خیال نہ کیا گیا۔ آپ کی طبیعت بگڑتی ہی رہی پھوپھی جان نے بار بار کوشش کر کے دیکھا کہ آپ کو کھلائیں مگر ایک تو انھیں کام کی زیادتی تھی اور دوسرے آپ بھی ٹال دیا کرتی تھیں۔

اپنی بے حد کمزور اور نرود سی ہو گئیں۔ میرے شادی والے دن بھی آپ کی طبیعت خاصی خراب تھی۔ انھوں نے اپنے کو بروی حد تک سنبھالا ہوا تھا۔ بڑے چاؤ سے انھوں نے مجھے سبایا سنوارا

میرے شادی پر کسی سبب نہ آسکے تھے آپنی بے حد چپ اور اداس تھیں اور بھیا کے نہ آنے کا
الوس تھا۔

میری رخصتی ہوئی وہ گھر جہاں میں نے آنکھ، کھولی، بچپن بتایا، مستقبل کے سندر سپنے دیکھے، اور اہل قہا دل پر منوں بوجھ آپڑا تھا۔ آنکھوں میں آگ ہی آگ بھر گئی اور میں نے خدا کا نام لے

۱۱۰ ماضی چھوڑ کر ان دیکھے مستقبل میں قدم رکھ دیا۔

اسی ہونی رات میں عدنان نے میرا کھونٹ اٹھایا تو میں نے پٹ پٹا کر ایک دم آنکھیں کھول

”وہ ہنس پڑے“ اتنی بے باکی۔ ”میں نے شرما کر گردن جھکا لی۔ کیسے بتائی، نجانے کتنے برس آپ کے سنے دیکھتے ہوئے اب یہ موقع بھی گنوا دوں۔“

اولیہ تھا۔ شام کو سب آئے تو امی جان کے گلے لگتے ہوئے میری آنکھیں بھر آئیں۔ آپنی پھوپھی جان نے مجھے سینے سے لگاتے ہوئے بتایا کی طبیعت بہت خراب ہے نجانے کیا

ہاں ہندی نہیں ہوتیں کوئی کہتا ہے پتے میں خرابی ہے۔ چھوٹی جان کافی فکر مند تھیں اور میں کم نمٹ کی اوٹ سے ہی مشورہ دے ڈالا کہ آپ کل ہی ڈاکٹر سے ملیں رات زیادہ ہو چکی تھی

ہاتھ نہ جاسکی۔

دن شام کو عدنان نے اپنی بایک پر مجھے اپنے پیچھے بٹھایا اور ہم لوگ صومے کھاتے امی جان آئے۔ میرا گھر پر رک جانے کا پروگرام تھا جبکہ عدنان واپس جانے والے تھے۔ امی نے

ان نے منع کر دیا۔ پھوپھی جان نماز پڑھ رہی تھیں عدنان باہر ہی سے چلے گئے۔

”کیا بات ہے اسی سب کماں میں میرا مطلب ہے آپنی وغیرہ؟“

”سب اپنے اپنے کمرلوں میں ہیں۔“ اسی نے دھتھے لہجے میں کہا۔

”اپنے کمرلوں میں؟“ میں خیران رہ گئی۔

”آج تو ہفتہ ہے ٹی وی پر ڈراما آرہا ہوگا پھر بھی؟“ اسی نے بے ساختہ سانس بھری۔

”افوہ۔“ میں جھٹلا گئی۔ ”کس قدر دشت ہے گھر میں، ایسا لگتا ہے کہ خدا خواستہ دو دن شادی نہیں موت واقع ہوئی ہے۔“

”موت؟ موت ہی تو ہوئی ہے شادی کو تو پھر بھی دو دن گزر گئے ہیں موت تو آج ہی ہوئی ہے۔“

”نہ افسردگی کے۔“ میرا کایہ دھک سے ہو گیا۔

”ہم سب مر گئے بیٹا۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے اسی جان کرے میں چلی گئیں تو میں پھوپھی جان کی ہماگی۔

”کون مر گیا پھوپھی جان؟“

”کوئی نہیں بچا بیٹا۔“ وہ بکھر بکھر گئیں۔ یا میرے خدا کیا پس ہے ۱۹۳۷ کے بعد سے تو رشتہ دار بچا ہی نہیں تھا جس کے مرنے کا اس قدر سوگ منایا جا رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ

پاکل ہو گئی ہوں یا میرے گھروالے میں نے آپنی سے پوچھنا چاہا مگر وہ تکیے میں منہ دے لیتی ہوئی تھی۔ ”کیا کرو گی؟ پوچھ کر؟ ماموں کی طرح لوں میں بوڑھی ہو جاؤ گی یا ممانی جان کی طرح سن

ہو جاؤ گی یا پھر اسی جان کی طرح مجھے مار مار کر اپنی بد نصیبی پر روؤ گی۔“ آپنی کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔

”بھڑا آپنی میں پاگل ہو جاؤ گی۔“ بلیز آپنی تادیب سے کہ قصہ کیا ہے؟“

”سنو گی؟ تو سنو میں لیکن کس صوفیہ متفنن۔“ آپنی نے ایک ایک لفظ پر زور دیا ”ماں“

ہوں کنواری ماں۔“

”کیا۔۔۔؟“ میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور آپنی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

”اسی لیے میں ڈاکٹر کے پاس نہیں جا رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ خرابی معدے میں نہیں ہے۔“

”مگر یہ سب ہوا کیسے؟“ میں نے پریشانی سے پوچھا۔

”ہوا کیسے؟ تم تو اب خود شادی شدہ ہو تمہیں پتا نہیں؟“ آپنی تلخی سے مسکرا دیں تو میں لاوا

”کیا کرو گی نام پوچھ کر؟“

”کیا کریں گے؟ اس ذلیل شخص کو مجبور کریں گے کہ آپ سے وہ شادی کرے۔“

”شادی؟ اشعر سے کی ہوئی متلکی ختم کر دو گی۔“ آپنی کی نظریں اس قدر حسرت کا تھیں کہ میں کانپ

”میں اس شخص سے نفرت تو کر نہیں سکتی۔ شادی کیسے کر لوں گی؟“ آپنی کا فلسفہ بھی عجیب تھا۔

سب کا خیال عاصم کی طرف گیا کیونکہ اس دن سائمر کے ہاں سے آپنی اجڑی اجڑی اور تھکی سی واپس

آئی تھی۔ آپنی کا وہ سریا میری نظروں میں گھوم گیا۔ میں نے آپنی سے اپنے خدشے کا اظہار بھی کیا مگر

”میں آپنی خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہ گئیں۔“

”اے میں اب بعض شادی شدہ جوڑے عمر بھر کو شش کرتے ہیں مگر اللہ پاک انھیں مایوس ہی رکھتا ہے

”ماں بے سلاخ پڑا اور پھل بھی لگ گیا۔“ آپنی کے لہجے میں ان دیکھی اور غیر محسوس سی دھناتی بھی

”التمی“

آپنی کے چپ چاپ اور سو روئے سے مجبور ہو کر پھوپھی جان نے چاہا کہ کسی بھی ممکن طریقے سے

”بات“ پانچا بنیں مگر آپنی نے سختی سے انکار کر دیا۔

”ماں بے سلاخ پڑا اور پھل بھی لگ گیا۔“ اگر میری عزت واپس آسکتی ہے تو پھر ٹھیک ہے تم لوگ اپنی

”شش کرو۔“ آپنی نے سب کو لاجواب کر دیا اور خاندان کے سامنے اپنی عزت بچانے کی کوشش کے

”ماں بے سلاخ پڑا اور پھل بھی لگ گیا۔“

”اس دن گھروالے جانے والے تھے اسی صبح ویرا کے چکر میں عدنان کو بھی اسلام آباد جانا پڑا اور اس

”ماں بے سلاخ پڑا اور پھل بھی لگ گیا۔“

کہ میں عدنان کے بغیر اداس نہ ہو جاؤں مجھے کچھ دنوں کے لیے اسی کے پاس بھیج دیا۔

جب میں پشاور ایئر پورٹ پر اتری تو سب ہی ریسو کرنے کے لیے موجود تھے۔ سوائے آپنی کے۔ کہ آپنی کے ملاقات ہوئی۔ وہ عجیب بے دھمکی سی نظر آ رہی تھیں ان کا اسماٹ جسم بے ڈول ہو کر رہ گیا تھا محض والوں کو شاید یہ بتلا دیا گیا تھا کہ آپنی کے شوہر کا شادی کے چند ماہ بعد ہی انتقال ہو گیا تھا اس سب ہی کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں خیف پڑا اور ویران ویران آنکھوں والی آپنی کو کبھی سر آنکھوں پر ہنساتے تھے مگر چھوٹی جان نے آپنی سے بات کرنی ہی چھوڑ دی تھی اور ایسا جان سے ویسے ہی بات نہ تھی۔ اسی ماحول کو کہاں تک خوشگوار رکھتیں۔ پھر چھوٹی نے اپنی ساری عمر پاکیزگی اور تقدس سے گزار دی تھی اور ان کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ رات دن کی فکروں نے انھیں فریض کر ہی دیا۔

میں ایک ماہ دہاں رہی ایک دن شفق کا خط آیا کہ بھائی جان نے آپ کا ریزا بھیج دیا ہے اور آپ اگلے ماہ کی دس تاریخ تک روانہ ہو جانا ہے۔ میں عدنان کی بے مبری پر ہنس پڑی کہ نہ کہ ہمارے دریا ہاں یہ طے ہوا تھا کہ اگلے چکر پر عدنان کے ساتھ ہی جاؤں گی۔

پھر میں امریکہ چلی گئی ایئر پورٹ پر عدنان اور ان کے ایک قریبی دوست ریسو کرنے آئے ہوئے تھے۔ عدنان نے نہایت خوشدلی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ میں عدنان کے ساتھ ان کے فلیٹ میں آگئی۔ اس وقت دوستوں کو رخصت کر کے عدنان واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ٹرے تھی کافم کے دو گک اور ایک سینڈویچ۔

”ارے یہ کیا کر رہے تھے مجھے بلا لیتے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں بھئی آج تو تم مہمان ہو کل سے اپنا چلو پاچو کی سنبھال لیتا۔“

”تو یوں کہیں کہ اس لیے مجھے جلدی بلوایا۔“

”اب تمہاری مرضی جو دل چاہے سمجھ لو۔“

وہ دن زندگی کے بہترین دن تھے جو ہنسنے مسکراتے بیٹے جارہے تھے۔ کبھی کبھی آپنی کا خیال دل میں آتا کھٹک سی پیدا کر دیتا۔ یاد دود کو شش کے میں عدنان کو آپنی کے متعلق کچھ نہ بتا سکتا وہ نہ جانے ہمارے خاندان کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے اور میں بھی بہر حال اسی خاندان کی لڑی تھی آپنی بھی شادی سے انکار کر چکی تھیں اسی نے بہت چاہا کہ جو کچھ ہوا اسے ایک غلطی سمجھ کر معاف کیا جاسکتا ہے ہم لوگ ہی دامن بچالیں گے تو کیا ہو گا؟ مگر چھوٹی جان نہ مائیں کہ میرے بہرے جیسے بیٹے کے لیے کیا جھوٹا ماثوٹی ہی رہ گیا ہے۔

اسی کے خط آتے رہتے تھے کبھی آپنی بھی لکھ دیتی تھیں پھر اسی کا خط آیا کہ چھوٹی جان نے کاشاں



وائرکٹ نے یہودی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ ”بہترین اداکار ہی ہے تم نے۔ پورے منظر میں جان ڈال دی۔ اصل حقیقت کا گمان ہو رہا تھا۔“

”وہ جانتے ہو؟“ بہرے نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وائرکٹ نے سر ہلادیا۔

”وہ یہ ہے کہ میرے ایک بچے میں دو کلیں ابھر آئی ہیں۔“

”خوب؟“ وائرکٹ چاہا۔ ”اگلے سین میں بھی یہی جوتے پہنے رہنا اور ہاں“ دو کلیں بہرے کی سینڈل

اس کی شگفتہ دو۔“

مرسلہ: مکمل علی گار تھ کر پائی

اس کے ایک بچے کو گود لے لیا ہے اس اشارے کو میں خوب سمجھ سکتی تھی۔ عدنان جھلا گئے گود لیا ہوا ہی تھا نا کوئی اور نام رکھ لیتے یہ تو میں نے سوچا ہوا تھا۔ ”عدنان کی اس جھنجھلاہٹ پر افسردگی کے باوجود اس پر۔“

ایسا کا خط آیا۔ وہ ہمارے لوگوں سے ملنے آ رہے تھے۔ بھیا کو ایر پورٹ سے گھر چھوڑ کر عدنان آفس چلے گئے ہاتھ پر ہنس رہے تھے۔ دل خوشی کے مارے بے قابو ہوا جا رہا تھا مگر بھیا انتہائی عجیبے عجیبے آپنی کے انکار نے بھیا کو اندر سے توڑ چھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ کیا المیہ تھا کہ بھیا نے برسوں اپنے من

اور میں جس صورتی کو پسند کر رکھا اور جس کی پوجا کی تھی اور جب عمر بھر کی تپتیا کا جھلنے والا تھا تو وہ روتی ہی پکنا چور ہو گئی تھی۔ بھیا آپنی کو دل سے پسند کرتے تھے۔ ان کی بچپن کی پر میرا دل کٹ گیا۔

”اس نے شادی سے انکار کیوں کیا؟ کیوں کیا مدو؟“ بھیا نے میرے شانے ہلا ڈالے۔ دنیا بھر کی رازیاں اور وحشیہ ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں اور میں نے دکھ سے اپنے ہونٹ کاٹ کاٹ

انھوں نے ایسا کیوں کیا بھیا یہ کوئی طویل داستان نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارا المیہ یہ ہے

کہ آپنی ایک بچے کی ماں بن چکی ہیں۔“

”کیا؟“ بھیا جیسے گولوں کی زد میں آ گئے۔ انھوں نے شاید کچھ اور بھی کہا تھا مگر مجھے یوں لگا جیسے بھیا کے منہ سے بیٹھکی بیٹھکی سسکیاں نکل رہی ہوں۔ میں بکھر نکھر گئی۔ میرا اکلوتا ڈالا بھیا اپنی زندگی کی سب

سب سے اہم چیز آرزو بھی نہ پاسکا۔ میرا دل دھوئیں سے بھر گیا پھر بھیا کے لبوں پر چپ کے کڑے پہرے لگ گئے۔ عدنان سے بھیا کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ خاموشی کو بھیا کی فطرت سمجھ بیٹھے مگر میں جانتی تھی کہ

بھیا پر کون سا کوہ گراں ٹوٹا ہے۔

عذنان کی غیر موجودگی میں میں نے بھیا کے سامنے شوق کا نام تجویز کیا مگر بھیا نے صاف انکار کر دیا۔
”میں اب کسی کو وہ محبت نہ دے سکوں گا جو میرا فرض ہے اور پھر میری یہ غلطی تمہاری زندگی میں گھول جائے گی۔“

بھیا واپس لوٹ گئے۔ ہوا کے پتکے لگائے چار برس بیت گئے مگر میں ایک بار بھی پاکستان نہ جاسکی۔
عذنان کے دوست جمیل نے بچے کی سالگرہ کی تھی۔ دیارِ غیر میں کچھ اپنوں کے ساتھ خاصا اہتمام کھانے پینے کے بعد کافی کا دورِ چل رہا تھا۔ جمیل نے عذنان کو چھیڑا۔

”کیوں میاں تمہارے کیا ارادے ہیں؟ شادی کو ساڑھے چار برس ہو گئے اور ابھی تک دھاک وہی ”دوپاٹے“۔ یہ کیتھی ہی بچہ ہے یا پھر کو۔“ اس پر عذنان نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ میری روح کے چمڑے گتے تھے۔ عورت ہونے کے ساتھ میری آرزو۔ اڑی آرزو۔ ایک نامعلوم سا جذبہ، ایک احساسِ چٹکیاں لینے لگنے میں نے چونک کر عذنان کو دیکھا۔

”تیار کھینچ بچہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ میں چاہوں تو رنج اور خریف دونوں فصلیں اُتار سکتا ہوں۔ مگر پھر وہی سوال کہ پالے گا کون؟ اس لیے ابھی اپنا پروگرام نہیں بنے ایک زبردست قہقہہ ہوا تھا۔
میرے کان کی لوہیں سرخ ہو گئی تھیں۔ ایک بے نامی غشِ دل میں جاگ پڑی تھی۔ واپس گھر آ کر خاصی رات ہو چکی تھی۔ عذنان کپڑے بدلے چلے گئے۔ میں ان ہی کپڑوں میں آڑی تھجھی اپنے گئی تھی۔ عذنان ہاتھ روم سے باہر آئے تو چونک گئے۔

”کیوں بھئی خیریت؟“ انھوں نے میرے چہرے پر چھائی تنجید کی کو غور سے دیکھا۔
”آپ نے جمیل کی بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا؟“ میں نے پوچھا۔
”جمیل کی بات کا؟ کون سی بات کا؟“ وہ بات ہی بھول چکے تھے۔

”وہی بچوں والی۔“
”ارے۔“ وہ ہنس پڑے۔

”تو کیا ہماری تنگی صاحبہ کی یہی خواہش ہے۔ پلو بھئی سہی ہم تو آپ کی طرف سے اشارہ متنتی تھے اور پھر تنگ کام میں دیر کیوں کی جائے۔“ انھوں نے لمبے بھر کو ہونٹ دانتوں میں دبا کر ایک ہنڈکی۔

”عذنان پلیز سیریس ہو جاؤ۔ کیا آپ نے کبھی سوچا کہ آپ کے جانے کے بعد میں کس قدر غم میں ہوں۔ تمہارا اور اس سی۔“ میری آنکھیں پانی سے بھر بھر گئیں۔

اب سرکاری افسر صدر مشاعرہ تھے اور نوح ناروی مرحوم اپنا کام سارے تھے۔ صدر مشاعرہ حیرت اور غور کا کام سماعت فرماتے رہے۔ جب نوح اپنا کام سناچے تو صدر مشاعرہ نے افسرانِ شان سے اپنی حیرت کا اعلان کیا۔ ”نوح صاحب! مجھے حیرت ہے کہ آپ غیر ملکی ہونے کے باوجود اردو زبان میں اتنی اچھی شاعری کر لیتے

“ ناروی کا حیرت سے منہ مکمل گیا۔ ”جی کیا فرمایا۔ غیر ملکی؟“
”جی ہاں۔“ نے افسرانِ ساری سے جواب دیا۔ ”جی ہاں غیر ملکی۔ ناوے کے رہنے والے ہیں نا آپ؟ ایک اعلیٰ اچھی شاعری کرنا بھی کمال ہے۔“

مرسلہ، فتح علی خاں: اسلام آباد

ناوے کی باہلی بیوی۔“ عذنان نے مجھے ہانپوں میں سمیٹ لیا۔

اس نے سوچا تھا کہ بچوں کے جمیل میں تو ساری عمر چھپے رہتا ہے۔ اس لیے چند سال عیشِ آرام ہی اس لیے مجھے پڑھے لکھے، پھر عذنان ایک دم جاہل لگے۔ ان کی دلیل بھی بہت ملکی تھی۔ شاید پیدائش کے وقت ہی عورت کے غیر میں امانت کا عنصر بھرتا ہے پھر جلد ہی بچہ پر آشفتہ ہوا کہ امانت رسیدہ چن میں کو پھیل پھوٹ رہی ہے اور ایک زندگی مکمل رہی ہے۔ عذنان کو جاتا جاتا امانت پائی۔ انھوں نے مجھے بہت چھیڑا۔

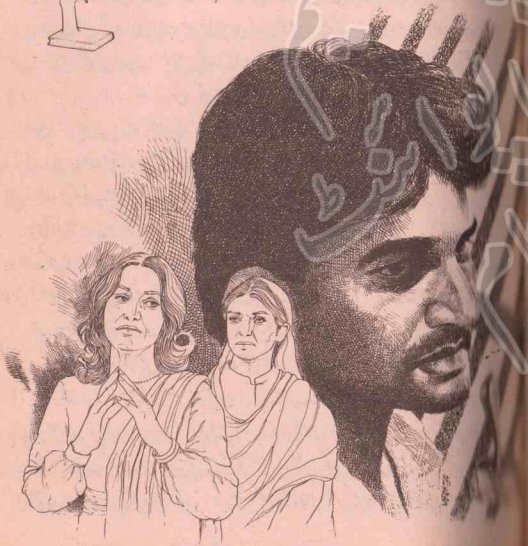
”ایسی جانتی تھیں نا؟ اب تو خوش ہو۔“ زندگی ایک دم ہی سندر ہو گئی۔ دو خیال اور تنہیال کا پہلا لکھ میں پرورش پراہ تھا۔ میں نے انتہائی فخر سے سوچا مگر نہیں کاشان بھی تو ہے۔ میرے دل میں ایک سے انھی۔ پیچھا ا معصوم بچہ۔ باب کے ہوتے ہوئے بھی یتیم اور کوئی خزانہ نہ کرتے ہوئے بھی اب تو خاصا بڑا ہو گیا ہوگا۔ میں نے بہت جتن کر کے کاشان کا ایک فوٹو منگوا لیا۔ بھولے بھالے اور ہٹکرا لے ہالوں والا معصوم بچہ جسے دیکھ کر بے اختیار چوم لینے کو جاتا تھا۔ میں نے اس کا

اگر اسے اپنے بستر کے سامنے والی دیوار پر لگا لیا۔
”میں انھوں کا خیال تھا کہ اس موقع پر میں پاکستان چلی جاؤں۔ تخلیق کا مرحلہ کچھ بزرگوں کے رائے اور نصیحتوں سے طے کروں پھر ایک جگہ شوق کے رشتے کی بات بھی چل رہی تھی۔ خالد جان کا حال کہ ہم لوگ انہیں تو شادی کی تاریخ مقرر کر کی جائے۔ عذنان کی بھی چٹکیاں قریب آ رہی تھیں لہذا ہم لوگ کراچی پہنچ گئے۔ سب ہی انتہائی خوش ہوئے۔ خالد جان تو بس نہال ہو گئیں۔ دہری لکھ لکھ سے۔ ایک تو اچانک ہمارے خینچے کی اور دوسری... اپنے بیٹے کے ارادوں سے بے خبر انھوں والی بن جانے کی لائق اور دعا میں مانگیں تھیں۔ خالد جان نے بھی انتہائی خوشی کا اظہار کیا اور شوق نے

اُداس ننھیں

آدم وحواء سے شروع ہو کر زنا بد تک چلنے والی عورت و مرد کے ازل و اشقوت
کے تانے بانے سے بنی ایک اٹھ کھڑی اور سبقت آور دیکھائی
اجسامات و جذبات کا تلاطم جس پر سنبھات نہ سکا نامک جگیا

سید علی ارسلان



چیز چمڑ کر میرا تک میں دم کر دیا۔

”رے ہاں بھابی آپ کو تو پتا ہو گا کہ آپ کی پھوپھی جان نے ایک بچہ گود لیا تھا۔“ کھانے کی
کو ایک دم کچھ یاد آیا۔

”ہاں میں جانتی ہوں۔“ دل کا چور زبان پر آگیا تھا لہذا آواز دھیمی تھی۔ ”کیسا بچہ ہے دیکھا
میں یا پی پیٹے پیتے رک گئی۔“

”دیکھا تو نہیں سنا ہے کہ بہت خوبصورت بچہ تھا مگر افسوس ہے بھابی کہ اس بچے کا انتقال ہو گیا
”کل فون آیا تھا آئی کا۔“ بچا راجا پچہ! پسوں اسکول سے واپس لوٹنے ہوئے ایک گاڑی سے
کاٹان کا معصوم چہرہ خون میں لت پت ہو کر میری آنکھوں کے سامنے آگیا اور میری حالت غیر
شفیق مجھے سہارا دے کر بستر تک لے آئی۔

”ج بھابی۔“ صوفیہ بائی نے تو اس بچے کے پیچھے اپنی جان لٹا دی۔ اس قدر خیال رکھا کرتی
کوئی ماں اپنی اولاد کا کرے گی ان بیچارے کا تو مارے غم کے برا حال ہے۔“ آئی نے بتایا تھا کہ
کے دورے بھی پڑ رہے ہیں۔“ ماضی کے تمام واقعات میرے ذہن میں تیزی سے گھوم گئے
ہی اسے ضائع کروانے پر تیار نہ تھیں اور اب تو پال پوس کر اتنا بڑا بچہ بن چکی تھیں۔

میرے اصرار پر عدنان نے اسی وقت ایرپورٹ فون کیا۔ اگلے دن سہ پہر کی فلائٹ پر
گئیں۔

ابھی تک امی وغیرہ کو ہمارے پاکستان آنے کی اطلاع نہ تھی۔ شام ہوتے ہوئے ہم لوگ
جائی گرمیوں کے دن تھے۔ اس لیے شام کو خنتی سی ہو جاتی تھی۔

جیسے ہی ہم لوگ گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئے تو اچانک آئی پر نظر پڑی جو سامنے
بیڑھیوں پر پتیلیوں میں چرو اور لہرز آنکھیں لیے ہوئے تھیں۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ چونک کر
ایک لمحے کو بے یقین نظروں سے دیکھا اور پھر محوش سے ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”عدنان! عدنان ہمارا بچہ۔“ وہ ایک دم عدنان کا بازو پکڑ کر چیخ اٹھیں۔

”ہمارا بچہ۔“ میں نے زیر لب دہرایا پھر تو میرا ذہن ایسا گنبد بن گیا جس میں ”ہمارا بچہ“
بدن کی طرح گر پڑا تھا اور گونج سے گنبد کی دیواریں تک لرز رہی تھیں۔

گرمیں۔ اپنی ذہنی حالت سے بے نیاز پھوپھی جان کی طرف دیکھ رہی تھی جو کھلے دروازے میں
قد سے ہمیشہ کے لیے گر پڑی تھیں۔

کہا، یہی شاہ میر کے اس سلوک سے دلچسپی سی ہوئی جاری تھی۔ میں اکثر اس سے چھپ چھپا کر مڑا ہوا اور جواب میں وہ مجھے قہر آلود نظروں سے گھورتا رہتا۔

شاہ میر جاوید، بیگم صاحبہ سے کو میر کے لیے ایک پیک اپ لے جانے بنا دیں۔ میں نے بزم لہجہ میں شاہ میر کے گزارش کی۔ جواب میں اس نے حسب عادت مجھے نفرت بھری کن انکھوں سے دیکھا اور اپنی زبان میں ایک بھر کے پولا نہیں۔

”کیا نہیں؟“ مجھے اس کے بدلے میں مڑا آنے لگا۔

”کیا مرضی۔“ اس کے لہجے میں تیش بڑھ گئی۔

میں نے آخر قہر میرا کوئی کام نہیں کر رہی۔ ”میری آواز بدستور نرم تھی اور اس کے جواب میں اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے کہ رہا ہو۔ ”لعلت ہو تم پر“ اور پھر بغیر کچھ کے سنے کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں نے اس کے مشاہدے کے بعد یہ بات میری سمجھ میں اچھی طرح آگئی کہ اسے ہر مرد سے شدید نفرت ہے۔ دن مجھ تک اس کی شکایتیں پہنچتی رہتی تھیں۔ کبھی وہ میرے ملازم سے جھگڑا یا کبھی جیل سے نکل کر گھر آتا۔

ایک دن میرے ممبر کا بیان لبریز ہو کر چھلک اٹھا۔ شاہ میر نے میرے بڑے بیٹے کا سر پھاڑ دیا تھا۔ ان دنوں میری آنکھوں کے آگے گھوم گیا، میرا داغ بن ہو گیا اور پھر... میں نے شاہ میر کو بید سے اتار دیا۔ وہ میری باپ باپا کی زبانوں سے خاموش کڑی شاہ میر کو بٹھنے پہنچتی رہی۔ اس سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ تھک کر میں نے بیدار شاہ میر کے سارے جسم پر سرخ سرخ لکیریں ابرائی تھیں، میرا دل اس حالت دیکھ کر ذرا سا دکھا۔ میری گھر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ پھر پور سکون دیکھ کر میری حیرت ہو گئی۔

”اب میں جاؤں؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”یا ابھی اور مارنا ہے۔“ مجھے اس کی جرات پر پھر آگیا لیکن میں نے خود پر قابو پایا۔

”اب ہو جاؤ کبعت۔“ اور وہ چپ چاپ چلا گیا۔

اس کے بارے میں کرید لگ تھی۔ کئی بار میں نے اس کے خیال کو ذہن سے جھٹکنا چاہا مگر اس نے اسرار وجود نے چگاڑ کر طرح میرے ذہن پر بچنے کا ڈوبے تھے کہ میں اس کے تصور سے نجات نہ پا سکتا تھا۔

میں اب جیل میں بیٹھے تھے، دنیا سے نالے۔ پھر میں نے تیرہ کر لیا کہ میں شاہ میر کی نفیات کے بارے

اس کی آنکھوں کو میں نے ہمیشہ روشن دیکھا، ہر وقت چمکتی رہنے والی آنکھیں اور جب بھی مرحوم باپ کا ذکر ہوتا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی روشنائی چمک اُٹھتی، چنگاریاں سی ان آنکھوں میں خون تیرنے لگتا، چہرے کے عضلات تن جاتے اور مٹھیاں ایسے پہنچ جاتیں جیسے اس میں اس کے باپ کی گردن ہو۔ یہ شاہ میر تھا مجھے اس کے اس رویے پر کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی۔ عمل تھا اور نیوٹن کے قانون کے مطابق ہر عمل کا رد عمل ضرور ہوتا ہے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں عورتوں کی جیل کا سپرٹنڈنٹ تھا۔ آئے دن بھانٹا ہوا عورتیں نظر سے گزرتی رہتی تھیں۔ نت نئے جھگڑوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ عورتوں کی جہاں سے ہو وہاں پھوٹے مونے جھگڑے اور روز کی تو تو میں کوئی غیر فطری بات نہیں ہوتی لہذا میں قصوں کو فطرت کے عین مطابق سمجھ کر رد کر دیتا تھا لیکن ان لاتعداد فطری جھگڑاؤں عورتوں میں فطری عورت بھی تھی۔ میں اسے غیر فطری ہی کہوں گا اس لیے کہ اس کی خاموشی اور حد سے سنجیدگی میری نظر میں خلاف معمول تھی۔ جیل کے ماحول میں اور خصوصاً عورتوں کی جیل میں خلاف معمول اور خلاف فطرت ہی سمجھی جاتی ہیں شاید ان سب باتوں کی وجہ یہ بھی ہو کہ نازی سزا ہونے لگی تھی اس پر اپنے آئینے کے قتل کا الزام تھا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اس کا بیٹا شاہ میر کے اندر ہی پیدا ہوا تھا اور ہمیں پرورش پارہا تھا۔ نازی کو شاہ میر سے بے انتہا محبت تھی اور اس نفرت شاہ میر کو اپنے مرحوم باپ سے تھی۔

نازی اکثر میرے گھر کا کام کاج کرنے آجایا کرتی تھی، اس کا بیٹا بھی اس کے ساتھ خوبصورت ڈھپن اور پیارا لڑکا تھا اس کی تمام شخصیت میں قابل غور اس کی آنکھیں تھیں۔ والی آنکھیں جیسے کسی دشمن کی تلاش میں ہوں۔ عجیب سی پیاس ان آنکھوں میں بھی رہتی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں سے نہ جانے کیوں خوف آتا تھا شاید اس کی وجہ اس کا درشت رویہ میرے ساتھ روا رکھتا تھا میں اسے نرمی سے بھی کوئی بات کہتا تو وہ مجھے اس طرح کھورتا جیسے اس کا ارادہ رکھتا ہو۔ اس کے برعکس میری بیوی کے اشارے کا منتظر رہتا تھا اور اس کا کہا ہوا ہر چاہک دیتی اور فرمانبرداری سے کرنا کہ میں اس کے دو شاخہ سلوک پر حیران اور شرمندہ سا ہوتا۔ سلسلے میں، میں نے کئی بار اپنا تجربہ کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے اپنے میں کوئی خامی نظر نہ آئی۔ بھی ایک عام آدمی ہوں اور ہم لوگوں کو خوش کبھی کوئی خامی نظر نہیں آتی، فرشتہ جو ہوئے۔

میں مکمل چھان بین کروں گا۔ آخر ہر مرد اس کے نزدیک گردن دہنی کیوں تھا اور عورتوں کے ساتھ روہیہ اس کے برعکس کیا معنی رکھتا تھا۔ میں نے ایک روز نازی کی فائل نکلائی اور شروع سے آخر تک اسے پڑھا۔ بڑا دلچسپ کہیں تھا مگر شاہ میر کا اس میں بظاہر کوئی دخل نظر نہیں آتا تھا۔ میں ایک الجھن کا شکار ہو گیا۔

”نازی! مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”کیا شاہ میر نے پھر کسی سے جھگڑا کیا ہے؟“ اس کی آنکھوں میں تشویش کے ساتھ ساتھ ابھرنے لگی۔

”نہیں۔“ میں نے دھجے سے کہا۔

”پھر صاحب؟“ وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

”میں تمہاری کہانی سننا چاہتا ہوں۔“

”کون سی کہانی؟“

”وہ ساری داستان جس کا اختتام تمہاری سزائے عمر قید پر ہوا ہے میں اسے شروع سے سنا چکا ہوں۔“ میں نے ذرا سنبھل کر کہا۔

”سزا مجھے مل چکی اور میں اسے کٹ بھی رہی ہوں پھر آپ کو میرے ذمہ کیدنے سے کہا ہے؟“ نازی کی تکرار پر مجھے غصہ آنے لگا۔

”لوچپی ہے تبھی تو پوچھ رہا ہوں“ میں نے اکر اکر افسرانہ شان سے پوچھا۔

”تو پھر صاحب آپ میری فائل پڑھ لیجیے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ شاید وہ میرے غصے سے متاثر ہو چکی تھی۔

”تمہاری فائل کہیں کھو گئی ہے؟“ اس کی تلاش جاری ہے اسی لیے میں نے تم سے کہا ہے۔“ میں نے نوکری سے نیچے بڑی صفائی سے جھوٹ بولنا سکھا دیا تھا۔

”ٹھیک ہے صاحب جیسے آپ کا حکم۔“ وہ ہار گئی اور زمین پر پھسکوا مار کر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی۔

”یہ کنی برس پرانی بات ہے صاحب۔ میری جوانی کا آغاز تھا۔“ اس نے سر جھکا کر بولنا شروع کیا۔

”میں اس وقت کالج میں پڑھتی تھی۔ نئی نئی جوان ہونے والی ہر لڑکی کے خوابوں میں ایک شہزادہ ہوتا ہے میرا کالج مگر سے خاصا دور تھا۔ میں بس سے کالج جاتی تھی اور جب پیسے نہ ہوتے تو پہلے

میں بہت غریب لوگ ہیں صاحب اور غریبوں کو خواب کچھ زیادہ ہی آتے ہیں اور ٹھیک بھی ہے حال ہو تو دماغ پر کیس چڑھنے لگتی ہے اور خواب خود بخود آنکھوں میں اترنے لگتے ہیں۔“ اس نے سر جھکا کر کہا اور رک کر ایک انگلی سے زمین کھرپنے لگی جیسے غوث سے چھٹکارا پانے کے لیے کوئی امر مژدہ دے رہا ہو۔ پھر غریب، خزانے کی تلاش میں ساری عمر زمین کھودتے رہتے ہیں اور آخر میں ان کا شاف ہوتا ہے کہ اب تک انھوں نے صرف اپنی قبر تیار کی ہے پھر وہ ساری حسرتیں، ساری غمگینی، ساری دلتاؤں میں دے دیتی ہے اپنی ہی کھودی ہوئی قبر میں جاسوتے ہیں اور اس کے بعد..... ان کے دل میں ہلچل مچا کر ان کے اوپر کوئی پلازا، کوئی شاپنگ سینٹر یا کوئی اسکوائر تعمیر کروا جاتا ہے۔ سرمایہ داروں کو اس کے بعد بھی نہیں بچتے قبر میں بھی چین نہیں لینے دیتے۔“

”میں خاموش رہنے کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔“ پھر ایک دن مجھے اپنے خوابوں کا شہزادہ مل گیا لیکن وہ شہزادہ نہیں تھا ایک موٹر سیکیکل تھا پھر مجھے وہ شہزادہ ہی مل گیا۔ غریب لوگوں کو یہ بڑا فائدہ ہے کہ وہ ذرا بہتر ہو وہ شہزادہ نظر آنے لگتا ہے۔ وہ ہو ہو میرے آئیڈیل جیسا نہیں تھا لیکن میں نے اس کی اپنا آئیڈیل سمجھ کر قبول کر لیا کیونکہ میں نے جوانی کے آنگن میں قدم رکھا تھا اور اپنی زندگی میں سرخو ہونے کے لیے مجھے بھی ایک عدد مردانہ نام درکار تھا جسے میں اپنے نام کے ساتھ لے کر چنانچہ میں نے شری علی کا نام اپنے ساتھ لے کر شروع کر دیا۔ نہایت فخر کے ساتھ۔ وہ ایسا بھی تھا اچھا خاصا قبول صورت تھا۔ اساتذہ تھا اور ہماری طرح غریب بھی نہیں تھا۔ ”نازی! ایک بار شری علی کو یقیناً“ اسے شری علی یاد آ رہا تھا۔ میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا آخر مہر نہ کر سکا میں نے بے چارے کا۔

”بعد کیا ہوا؟“ وہ چونک گئی اور ماضی کی دلدل سے نکلنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

”بعد کیا ہوتا تھا صاحب۔ نادان لڑکیاں جو کچھ بھی کر سکتی ہیں وہ میں نے بھی کیا شری علی میرے ساتھ چھٹا چلا گیا۔ میں اس کی قربت میں مدھوش ہو جاتی۔ جب بھی وہ مجھ سے ملنے کالج کے چھانک

میں سیلاب مارے حد کے جل کر اکھ ہو جاتیں، وہ ایسا ہی دلکش تھا۔“

”اب وہ ارادہ ہے شاہ میر جیسے خوبصورت لڑکے کا باپ یقیناً“ ایسا ہی ہو گا اور پھر تم بھی کم نہیں ہو۔“

”جلدی سے کہا۔ وراصل مجھے اس منتظرانے سے انجھن ہو رہی تھی مجھے تو اصل کہانی معلوم کرنا

”پھر ہم آگے ہی آگے بڑھ گئے بلا یہ سوچے کہ کبھی واپس بھی آنا ہے اور اگر آگے کا سفر طے لے لیا جائے تو پیچھے اتنا گرد و غبار ہو جاتا ہے کہ واپس آنے کا ارادہ ترک کر دو راستے ناممکن ہو جاتی ہے مگر شیر علی میری محبت کے لائق نہیں تھا اور یہ بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی میرے چپکے سے میرے پیٹ میں اگیا تب مجھے ہوش آیا اور کاش ہوش آنے کی بجائے مجھے موت ملنے لگے اس نے اتنے آرزو لیے میں دعا مانگی کہ میرا دل بھی موم ہوئے لگا میں نے شیر علی کو بہت محبت کے ”اپنے ہونے والے بچے کے واسطے دیے لیکن وہ کینہ... حرابی اپنے ماں باپ سے نہ دلو اس کا اور ایسے مرد جو زمانے سے نہ لڑ سکیں مرد کلمانے کے ہرگز مستحق نہیں انھیں اس دنیا رہنے کا بھی کوئی حق نہیں جو مرد اپنے مقدر سے نہیں کھیل سکتا اسے کیا حق ہے کہ وہ ایک لاش کی تباہ کرے اس کی زندگی جہنم بنادے۔“ وہ غصے سے لڑ رہی تھی۔ ”شیر علی نے میری زندگی برباد کر دی اور میں نے اس سے زندگی چھین لی“ ایسے بزدل مرد محبت کے لیے کتے سے بھی بدتر ہوتے عورت کو یہ خوف ہالینا کہاں کی ببادری ہے“ جرات تو یہ ہے کہ دنیا سے لڑ بھڑ کر اپنا حق و مال چھوڑ دینا کیونکہ تھی۔

”اس کے بعد؟“ میں ابھی تک مطمئن نہ ہوا تھا۔

”شیر علی کو قتل کرنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا“ مجھے پتہ نہ تھا کہ میں نے عدالت سے رد و کر موت کی ٹھیک مانگی مگر صاحب ”قانون بھی تو مردوں کے لیے ہے اور تم مرد لوگ کبھی انصاف نہیں کر سکتے۔“ مجھے عرق کی سزا ہوئی اور قانون کے نگہبانوں نے مجھے میرے خاندان کی رہی سہی عزت کا جنازہ دلایا۔ باقی کر شاہ میری پیدائش کے لیے اس میں کسی کو منہ نہ کھانے کے قابل نہیں ہوں صاحب۔ ماں باپ کے لیے تو میں پہلے ہی مر گئی تھی اس وقت مر گئی جب شاہ میرے میرے پیٹ سے باہر آکر اپنی زندگی سے بھرپور بیچ رہا تھا صاحب! شاہ میر کو اس دنیا میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کئی بار میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اسے دنیا سے رخصت کر دوں مگر نہ جانے کیوں اس کی گردن تک پہنچ کر میرے ہاتھ خود بخود تھمتے تھے شاید اس لیے کہ اس کے وجود میں میرا لوبو بھی دوڑ رہا ہے لیکن اب مجھے کسی بات کا سہارا نہ رہا۔ ساری دنیا مجھ پر غصہ سمجھتی ہے مگر میرا بیٹا مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اس کی محبت نے مجھے گے ہوئے ساز و کار و حدود دیے ہیں۔“ اور اچانک ناٹکی کی آنکھوں میں سادوں بھادوں کی

ہمارے میں ہندی اور اردو کی بحث دونوں پر چل رہی تھی۔ انھی دنوں سرسید نے ہمارے سے ڈیڑھ سال پہلے سے ملاقات کی اور مسلمانوں کی تعلیم کا ذکر کرنے لگے۔ ”کچھ سے ملاقات کی اور مسلمانوں کی بات کرنے لگے۔“ کچھ سے حیرت سے سرسید کو دیکھا اور کہا۔ ”جنتاب! میں پہلی بار آپ کی زبان سے مسلمانوں کی ترقی کی باتیں سن رہا ہوں ورنہ آپ ٹیٹ ہی تمام ہندوستانوں کی فلاح و بہبود کی باتیں کرتے۔“

”میں متاقدانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”ہاں۔ لیکن اب مجھے یہ یقین ہو چکا ہے کہ یہ دونوں قومیں دلی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گی اور اس وقت دونوں قوموں میں مکمل عداوت نہیں ہے۔ لیکن تمام تعلیم یافتہ لوگوں کی مکمل میں عداوت بڑھ جائے گی۔ جو لوگ زندہ ہیں کہ وہ یہ حالت ضرور دیکھیں گے۔“



مسلمانوں کی وحدت کا آئینہ دار ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہیے۔ سچے مسلمانوں کی حیثیت سے ہمارا دل و جان ہے اس کی پاسپانی و حفاظت کریں۔ اگر ہم خود کو کچھ بنگالی، سندھی وغیرہ خیال کرنا چاہیں اور ضمناً پاکستانی سمجھیں تو پاکستان کا شیرازہ بھر جائے گا۔“

(قائد اعظم ۱۲۸ مارچ ۱۹۳۸ء)



”میری عمر تو جیسے تیسے چل کی چار دہائی میں کٹ گئی مگر میرے بیٹے کی تو عمر ابھی ہے وہ اسے کیسے گزارے گا۔ جب لوگ اس سے باپ کا نام پوچھیں گے تو وہ کیا جواب دے گا۔“

”اس کے مزاج میں آگ بھری رہتی ہے خصوصاً ”مردوں کے لیے۔“ میں بڑبڑایا۔

”صاحب! اسے نفرت ہے تمام مردوں سے اور سب سے زیادہ نفرت اپنے باپ سے ہے اور اس کی ساری تو میری زندگی کا سہارا بنی ہوئی ہے گئی تو ہے جو میرا ہے مجھ پر بھروسہ کرتا ہے وہ ایک بار سے روئے گئی۔ میں نے مزید کچھ پوچھا مناسب نہ سمجھا۔ یوں بھی عقدہ تو کھل ہی چکا تھا۔ شاہ نے اس سے ساری کتھان لینے کے بعد مجھے اب اختیار شاہ میر سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ اپنی تمام باتوں کے باوجود میری نظریں وہ فرشتوں کی طرح معصوم تھا۔ میری نظریں وہ شخص فرشتہ ہوتا ہے جو کسی کی غلطی کی پاداش میں سزا سنبھالتے پر مجبور ہوتا ہے۔“

”اب اس کے بعد شاہ میر پر میری مہمانیاں بڑھ گئیں میں نے اس سے دوستی بڑھانے کی پوری کوشش کی اور اب وہ خود خدا جانے کس دھڑ میں کب اپنا ہوا تھا کہ میرے بات کرتے ہی منہ زور گھوڑے کی طرح اٹھتا تھا میں نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ اس کو نرمی سے سمجھا کر اس کے دماغ کو نارمل و فکر پر لے

آؤں اس کے ذہن سے یہ تصور نکال دوں کہ دنیا کے تمام مرد قابلِ تعزیر صرف اس وجہ سے ہیں کہ اگر کاہل بھی ایک مرد تھا اور اس نے اس کی ماں کے ساتھ دھوکا کیا تھا لیکن میں نے اپنی کوششوں میں کی کھائی۔ نازی نے شاہ میر کے داغ میں مردوں سے نفرت کا جو بیج بچپن میں بویا تھا۔ وہ اب تادور بن چکا تھا اور اس درخت کی جڑیں شاہ میر کے تمام بدن میں کسی سرطان کی طرح پھیل چکی تھیں اور میں شاہ میر سے مسلسل ہار رہا تھا مگر میں نے ابھی ہمت نہ ہاری تھی غالباً "میری ہمدردیاں اور شاہ میر کے ساتھ تھیں کہ وہ میرے نزدیک معصوم اور بے گناہ تھا اس کے علاوہ یہ کہ وہ دنیا میں نہیں لایا گیا تھا اور اس کے بعد اس کو وہ اہمیت اور حیثیت نہیں ملی جو کسی بھی صہان کو میزبان کی طرف سے متوقع ہوتی ہے لیکن میں مستقل اسی تک وود میں لگا ہوا تھا۔

"تم کیا ایسے لڑکے ہو شاہ میر۔ اپنے اور چڑھا ہوا بد مزاجی کا یہ خول اتار چھینکو۔ آخر تمہیں بھی سے کھجور کرنا ہے اپنی عمر گزارنی ہے۔" جواب میں اس نے اپنے مخصوص انداز میں گھورا اور اس کے باہر جانے لگا۔ میں نے پھر نصیحتوں کا پٹارا کھولنے کی کوشش کی۔ "اپنے باپ کے جرم کی سزا آپ کو کیوں دے رہے ہو؟" اور اس سوال کے جواب میں وہ ایسا تڑپ کر پٹا گیا اس کی پیشینہ پر رکھ دیے ہوں۔

"اس کا نام موت کو میرے سامنے۔" وہ اتنی زور سے گرجا کہ میں ایک لمحے کو سہم کر رہ گیا۔ "بس میں ہوتا تو میں شیر علی کو روز زندہ کرتا اور روز اسے ایسی اذیت ناک موت مارا کہ کوئی بھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔" اس کے بچنے ہوئے ہونے کا پ رہے تھے اور وہ بار بار اپنی مضیوں کو اس سے بچھینتا تھا کہ ہاتھوں کی رگیں ابھر کر نمایاں ہو جاتی تھیں۔

"اتنی نفرت ہے تمہیں اپنے باپ سے؟" میں بھی چھپچھپوڑنے والوں میں سے نہیں تھا۔ "ہاں ہاں۔" وہ چیخا "اس سے بھی زیادہ مجھے اس سے اتنی شدید نفرت ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔" لیکن وہ اتنا تصور وار بھی نہیں۔ "میں چاہتا تھا کہ شاہ میر ابھی طرح اپنے دل کی بھڑاس نکال ہو سکتا ہے اسی طرح اس کے خون میں کمی آجائے لیکن ایسا نہ ہوا۔

"کیا وہ تصور وار نہیں؟" دو زندگیوں کی تباہی کا ذمہ دار۔ میری پوری زندگی کو جنم بنا دینے والا اور ختم کتنے ہو کہ اس کا کوئی تصور نہیں ہے۔ میری پیدائش کا ذمہ دار کون ہے، کیا میں اس سے اس دنیا میں آگیا ہوں کسی ششپن میں سے نکلا گیا ہوں۔" وہ اتنی زور سے چلایا کہ میرے کان اٹھے "جب لوگ مجھ سے میرے باپ کا نام اور میری ماں سے اس کے شوہر کا نام پوچھیں گے تو تیار

کیا جواب دوں گا کیسے مطمئن کروں گا جب لوگ مجھ سے میرے وجود کی بنیاد دریافت کرنا چاہیں تو میں کیا کہوں گا؟ اپنی ولایت کے خانے میں کس کا نام لکھوں گا۔ شیر علی کا جس نے میری ماں کو قتل کیا۔ لیکن قتل تو تمہاری ماں نے کیا ہے؟" میں نے جرح کی۔

"اس کا کیا ہے اور بالکل ٹھیک کیا ہے اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا بلکہ شیر علی کے جسم کے کٹ کے تلوں کو کھلا دیتا۔" وہ اچانک رک گیا اور افسردگی سے کہنے لگا۔ "لیکن میری ماں کو ایک اور کرنا چاہیے تھا۔ میرا قتل کا شہید ہوتے ہی وہ میرا گلا گھونٹ دیتی۔" اس کا لہجہ مدہم پڑ چلا گیا۔ "میں تیرے کر لیا تھا کہ آج شاہ میر کے سارے جذبات اور دیوانگی باہر نکال کر ہی دم لوں گا لہذا میں

اب بھی ہوشیر علی تمہارا باپ تھا، تمہیں کبھی تو اس کے لیے فاتحہ پڑھنی چاہیے قبر پھول چڑھانے۔" اس پر اس نے مجھ کو دیکھا جیسے میرا داغ چل گیا ہوں۔

"تمہاری عمر کا لحاظ نہ ہوتا تو میں اس وقت تمہاری قبر تیار کر اس پر پھول ضرور چڑھا دیتا سپرنٹنڈنٹ۔" انہوں نے نون آلود نظریں مجھ پر خفگیر آمیز انداز سے ڈالیں اور گردن جھٹکتا ہوا چلا گیا۔ میری تمام کاوشیں اہل جاری تھیں شاہ میر کبھی میری بات دھیان سے نہیں سنتا بلکہ الٹا میرا مذاق اڑاتا۔ میں تنہا کر خاموش ہو گیا اور میں نے شاہ میر کی حالت پر صبر کر لیا ظاہر ہے جو شخص خود نہ سدھرا چاہے اسے تو اسی میں سدھار سکتا۔

اس بیت گئے۔ نازی کی سزا ختم ہو گئی اور وہ شاہ میر کے ساتھ کہیں چلی گئی وقت گزرتا رہا میرے دل سے بھورے ہوئے پھر ان میں سفیدی جھلکنے لگی دیکھ ہی بالوں کی تعداد سر پر برائے نام یہ وہ آدمی چند یا بڑی تیزی سے صاف ہو چکا تھی اور مجھے وضو کرنے میں کافی وقت ہونے لگی تھی منہ اب وقت یہ اندازا لگانا بہت مشکل ہو جاتا تھا کہ میرا چہرہ کہاں ختم ہوا اور کھوپڑی کہاں سے شروع ہو کر ٹائٹلٹ نزدیک آگیا تھا مگر مسلسل تادلے ہو رہے تھے "نوٹ یہ بچہ کی میں پورے پاکستان کا چکر لگا رہا کچی میں تینینات ہو گیا تھا ایک بار پھر کراچی کا سامنا ہوا تو مد توں کے بھولے ہوئے شاہ میر اور میرا دل آگئے، میری کار کا سائینس پھٹ گیا اور میں جس قریبی ویڈر کے پاس پہنچا وہ شاہ میر تھا اس کی طرف میں اب بھی وہی وحشتناک چمک تھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ چھوٹے عمر تیز بلب اس کی آنکھوں میں

اٹکے ہوئے۔

اس نے مجھے پہچان لیا اور حسب عادت میرا دستخراڑا تے ہوئے پوچھا۔ ”کیا حال ہے سر پرنٹ؟“
 کہاں ہو؟“ میں نے اس کا لہجہ نظر انداز کر دیا یوں بھی میں اس عمر میں داخل ہو چکا تھا جس میں مجھ پر
 بڑی سے بڑی بد تمیزی بھی مسکرا کر نظر انداز کر دی جاتی ہے کیونکہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہو سکتا۔
 ”ہمیں آگیا ہوں پھر۔“ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ”تم سناؤ کسی گزر رہی ہے“ تمہاری ماں کی
 ہے؟“

”ماں میرے ساتھ ہی ہے بھلا میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں“ ویسے ٹھیک شاک گزر رہی ہے
 کالینا ہوں“ میں نے چاہا کہ اس کے باپ کا تذکرہ کروں مگر چپ رہا نہ جانے کیوں۔ شاید اس کی
 ہوئی آنکھوں سے خوف کھا گیا۔ اس نے اپنی مزدوری لینے میں مجھ سے قطعی کوئی رعایت نہ کی
 دوسرے ویڈیوز سے زیادہ قیمت وصول کی۔ میں خاموشی سے واپس آگیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔
 کئی دن گزر گئے میں نے رطازمنٹ سے پہلے لمبی چمٹی لینے کی درخواست بھیج دی تھی اور
 منظوری کے انتظار میں تھا۔

”صاحب! کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔“ ملازم نے آکر کہا تو میں حیران رہ گیا۔ اتنے سویرے
 کون آ سکتا ہے۔
 اور جب ملاقاتی کرے میں داخل ہوا تو میں حیرت زدہ ہو کر کھڑا کھڑا رہ گیا کہ والا شاید
 مجھے حیرت اس کے آنے پر نہیں ہوئی تھی، اس کے منہ پر ہوئی تھی وہ شفاف لباس میں لباس
 ہاتھ میں قرآن شریف تھا اور دوسرے میں ڈھیر سارے پھولوں کے بارہا اور سب سے زیادہ
 آنکھیں تھیں جن کے قمقمے مجھ سے گئے تھے، او اس اور بھی بھیجی آنکھیں دیکھ کر مجھے تپ ہوا
 بہت بڑھرمہ سالگ رہا تھا۔

”مکشوہ میرے کیا آنا ہو؟“ میں ابھی تک حیرتوں کے سمندر میں دیکھا کھا رہا تھا۔
 ”سر پرنٹ، مجھے میرے باپ کی قبر کا پتہ بتا دو۔“ اس نے بے حد دھیمے لہجے میں کہا تھا لیکن
 آسان ٹوٹ پڑا۔
 ”کیا کہہ رہے ہو“ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔
 ”ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ مجھے قبر بتا دو یہ سب میں اسی کے لیے لایا ہوں۔“ اس نے قرآن شریف
 پھولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”مگر تمہاری ماں.....“ میں جملہ بھی مکمل نہ کر سکا۔

اس سر پرنٹ وہ ہاتھ اٹھا کر یوں کہ ”تمہیں میری بڑی ٹوہ لگی رہتی تھی نا تو سنو کل مجھ سے وہی
 کہہ رہے باپ سے ہوئی تھی۔“ وہ رک گیا۔ لیکن میں شاید بے شادی نہ کر کے اپنے باپ کی
 ساری غلطی ہرگز نہیں کروں گا۔ اس نے فیصلہ کر لیے میں کہا اور اس کے الفاظ نے جیسے میری
 دل ہلادی۔

”وہ دل..... تمہاری ماں.....“ عجیب وغریب جوش میں میری زبان بھی میرا ساتھ چھوڑنے لگی۔
 ”موصوم نہیں ہے سر پرنٹ جتنا خود کو ظاہر کرتی ہے اس عمل میں عورت اور مرد دونوں برابر
 ہوتے ہیں اور اگر عورت کی مرضی نہ ہو تو مرد اس کی طرف کبھی ہاتھ نہیں بڑھاتا۔ کل کے
 میری آنکھوں پر بندھی ہوئی بہت ساری پٹیاں کھولی دی ہیں۔ آج تک میں اپنے باپ سے
 کہا ہوں لیکن میری ماں بھی اس جرم میں برابر کی حصے دار ہے آج کے بعد میں اس سے کوئی
 بات نہیں کر سکتا۔“ میں ہکا بکا کھڑا کھڑا رہ گیا۔ وہ کہتا رہا۔

”دل میں یہی آتی تھی کہ ماں کو بھی اپنے باپ کے پاس پہنچا دو مگر پھر میرا اس دنیا میں ہے ہی
 اور ملاوہ اور اس کا بھی تو کوئی نہیں اس کے لیے اتنی سزا ہی کافی ہے کہ میں اس سے دور
 رہوں مگر جہاں کچھ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا آج سے پہلے میں نے کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں
 دیکھا۔“ میں نے اسے رونے سے نہیں روکا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا سارا غبار دھل جائے کافی دیر بعد
 اٹھایا۔

”پرنٹ! مجھے میرے باپ کی قبر دکھا دو۔ تم کہتے تھے نا کہ باپ کی قبر پھول چڑھاؤ۔ آج میں
 چڑھاؤں گا اور قرآن خوانی بھی کروں گا۔“ اس کی بھیجی بھیجی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب
 بہا ہوا۔ اگر بتیاں لے آؤں۔“ میں نے منہ پھیر کر کہا اور آستین سے اپنی آنکھیں خشک



ایک آبلہ پاکہ طویلے تر مسافت جس کے لیے میرے رشتہ دار
کا مدد و جن میرا تھا، ایک جہد مسلسل کے ساتھ تھا۔

مجھے خدا دیکھ کر وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی تو اس نے میری مدد کا وعدہ کیا۔ میں
اس کے گھر میں رہی وہاں عجیب پر اسرار واقعات ہونے لگے۔ ظاہر کا باپ پڑا پڑا بین تھا اور ملک سے باہر رہتا
تھا۔ جیسا کہ رکھا کر میں نے اس کی خبر موجودگی میں کو بھی کا جائزہ لیا تو مجھے وہاں چکے ایک لوگ نظر آئے جن کی
بے چارہ تھا۔ پھر اس نے مجھے ایک فلیٹ میں منتقل کر دیا۔ وہاں ایک لڑکی زینت کو میری ملازمت کی حیثیت سے
رہنے مانی کے گھر میں ایک سوئے گا لاکھ دیکھا تھا جو بعد میں ظاہر کے گھر سے بچھلا۔ میں نے اسے چھپایا۔ بعد
از اہمیت اہم تھا اور اس کے لیے ظاہر نے وادی بھاڑ کو کئی روز قید میں رکھا اور ان پر تشدد بھی کیا۔ یہ دیکھ کر میں
حالت اپنی جان سے بڑھ کر شتا شروع کر دی۔ ظاہر نے مجھے اپنے باپ سے ملایا اور انہوں نے مجھے اپنے فخر میں نوکری
اس کا کرنا چاہا کہ وہ لوگ بہت بڑے انجنیئر ہیں اور مجھے بھی پوری طرح چھپا سکتے ہیں۔ میں چاہی ہوں تو ان کے
میں لے سکتی۔ ظاہر نے پند کرنا تھا اسی لیے وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا اور اس نے بتایا کہ وہ بھی دنیا میں خراب ہے اور
اس نے وہ باپ کتا ہے دراصل اس کا باپ نہیں ہے بلکہ اس نے بستی میں اسے فتنہ سے اٹھا کر بالا پڑھایا تھا
میں اپنے ناجائز کاروبار میں شریک کر لیا تھا۔ وہ بھی ان لوگوں سے الگ ہونا چاہتا تھا میرے ممکن تھا۔ اس لاکھ
اس نے بتایا کہ اس میں اہم قسم ہے جو اشراف علی خاں کے تمام مذہب کا دیوار کو جس قسم کر سکتی ہے۔ تب میں نے
اس لاکھ میرے پاس ہے۔ اشراف علی خاں کا دیوار کی حریف بیٹھ لیلیان میرے پیچھے پڑ گیا۔ میری ملازمت اس کے
اس میں بھی جب یہ بات سنی تو ظاہر نے اسے ہمارے لیے کام کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس رات بیٹھ لیلیان کے

میرا نام تھا۔ میری ماں جس کی کسی حادثے میں فوت گواہی غم ہو گئی تھی مجھ سے اپنے پناہ دیا کرتی تھی اور
سے دھکا دیتی تھی۔ کبھی اس کا ذہنی توازن بگڑا تھا۔ ابا کا وہ مجھ سے کئے باپ میرا۔ تھا بھائی ماں باپ کی
سے بگڑ چکا تھا۔ بڑی بہن کی شادی ہو گئی تھی ایک بہن مجھ سے چھوٹی تھی۔ بہن بھائی مجھ سے باہر کرتے تھے گھر میں
مردم تھی۔ جوان ہوئی تو بھی ابا کے دویسے میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایک روز وہ ایک حادثے میں زخمی ہو گئے۔
تہہ داری کرنا چاہی تو انہوں نے اپنی نعت کا اظہار بر ملا کر دیا اور مجھے چھپانے کے لئے زہری شیشی دی تھے میں نے
یہ دیکھ کر کچھ انھیں ان کی گواہی واپس آگئی انھوں نے زہر مجھ سے چھین لیا اور بتایا کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں اور
اپنی معافی چاہتی رہی۔ انھوں نے بتایا کہ مسلم کش فسادات میں جب انھیں سکھ لگا کر لے گئے تھے تو اس
اور عورت بھی تھی جس کا نام تھا اور میں اس کی بیٹی ہوں۔ میرے باپ کا نام سکندر تھا وہ انڈیا میں سکھ
زاد ہونے کے علاوہ منجھتے بھی تھا مگر خاندانی دشمنی کی بنا پر شادی نہ ہو سکی۔ میں اس سکندر کی بیٹی تھی۔ میری اصل
اور میرے باپ سے ملتی تھی اس لیے ابا میرے سلسلے میں اباں پر شک کرنے لگے تھے کیونکہ اباں سال میرے
تھیں اور میں ان کی گود میں تھی۔ اباں کی قوت گواہی غم ہو گئی تھی اس لیے وہ کسی کو نہ بتا سکتا کہ میں کون
کہانی سن کر خوش ہو گئے تھے گھر میں بے تحاشہ خود کو ختم ہوس گیا یہ چھپاں میرے دل میں ایسی جگہ کو
تلاش میں بغیر سوچے سمجھے گھر سے نکل پڑی۔ گھر سے نکلے ہی میری ملاقات ظاہر سے ہوئی۔ ظاہر ہمارے گھر کے



آدمیوں نے اسے قتل کر دیا۔ اشرف علی خان بھجہ راجا کا لاکٹ سینٹہ سلیمان کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اس کا سہارا
 کھتا تھا۔ میں بھی کیوں کر سلیمان کی نظروں میں آتی تھی اس لیے اشرف علی خان نے مجھے بتایا کہ مجھے فوراً
 چاہیے۔ یہ سنتے ہی میرا سر کھوٹے لگا۔ میرا وجود کسی ایسے چتر سے بچ کر زیادہ تپ تھا جو لوگوں کی ٹھوکروں میں پڑا ہو۔

مجھے بنگلہ بھینچ کا فیصلہ ہو گیا۔ ہاں نے بتایا کہ وہاں مس احمدی سڑی ٹینک کریں گی۔ میں ظاہر کے لیے پریشان
 سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہی صاحب نے کہا کہ مجھے اگلے ہفتے بنگلہ کے لیے روانہ ہو جانا ہے۔ میں آٹھ سے گھر
 لفٹ میں اترنے لگا۔ یہ میرا چڑا ہی رہا تھا اس کی حالت بھی خراب تھی۔ پھر اس کا بھائی تیار تھا اور
 لیے پیسے تو دے دیتے مگر گھر جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ آدھی دقت گھر جا رہا تھا میں بھی اس کے ساتھ
 گئی۔ جہاں پہ چلا کہ اس کی ماں اور بھائی دونوں سر پہ گئے۔ اور میں باغی ہو رہا تھا کہ میں نے اسے قابو کیا اور
 اور ظاہر کا ساتھ دے تو ہم ان لوگوں کے خلاف بچ کر کھڑے ہیں۔ وہ فوراً تیار ہو گیا بعد میں پتہ چلا کہ اسے کسی
 ہے۔ خبر میرے لیے اچھی تھی۔ اس طرح میں خود کو مٹا کر نہیں کر دیتی۔ اسے بتایا کہ ظاہر کو اشرف علی
 خاص آدمیوں کے ساتھ نہیں بھیج دیا ہے۔ بعد میں یہ بھی پتہ چلا کہ وہ ان لوگوں کی حراست میں ہے۔ جس روز
 اس روز ظاہر نے ڈانڈا کر کے ہاتھ میں خلیہ بھیجا کہ میں پریشان نہ ہوں اور وہ مجھے جانے دے گا۔ میں نے
 سے پہلے لاکٹ کو اس کا رکھ لیا۔ اس فائنٹ سے اور میں بھی جا رہا تھا گویا اس نے مجھ کی ایڈیوٹ پر دوسرا
 سفیر رنگ کا پکٹ میرے خوالہ کیا کہ میں اسے اسٹیل پکٹ پٹا دوں۔ فائنٹ میں میری ملاقات پر کاش سے ہوئی اور
 اور میراں سے بنگلہ جا رہا تھا۔ وہ کھتا تھا اور اس نے بتایا کہ اس کا پکٹ بنگلہ میں کاروبار کر رہے تھے۔ وہ مجھ سے بھی
 پکٹ میری گود میں رکھا تھا۔ اسے میں نے منبھو جی سے چاہ لیا۔

بنگلہ ایڈیوٹ پر اسے مجھ لینے آئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں ایک بچے کا ڈھکڑا تھا جس پر میرا نام لکھا تھا۔ یہ
 ڈھکڑا میں آئے ہوئے تھے۔ میں پر کاش کے ساتھ ایڈیوٹ کی حالت سے باہر آئی تو اس کے ڈھکڑے دیکھ کر
 گئے۔ پر کاش نے میرا ان سے تعارف کرایا تو وہ لپٹ اٹھے۔ "یہ... یہ ڈھکڑا کی بیٹی ہے۔" اس کا جملہ نہ کر میں اچھل کر
 میری ماں کا نام لے رہے تھے۔ میں ان سے بہت کچھ پوچھتا تھا حتیٰ حرکت نہیں تھا۔ اسے میری بھتیجی تھی اس
 میں نہیں اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پہلی فرصت میں پر کاش کے ڈھکڑے کی طوں کی اسے مجھ سے لے کر ایک
 میں داخل ہو گئی۔ بچہ ہماری رہائش تھی اس کے ساتھ ایک تھائی لڑکی توک بھی تھی جب وہ سفید پکٹ
 آ رہی تھی اس وقت کسی نے میری تصویر کھینچ لی۔ وہ کاش کے کھمبے کے نیچے احساس ہوا۔ پر جب میں نے کہہ
 مس اسٹیل گواڈیو توک نے ہماری تصویر کھینچ لی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس پکٹ میں بیوی تھی۔ گویا میں
 ان لوگوں کے قابو میں تھی۔ اسٹیل نے مجھے بتایا کہ اب مجھے ان کی ہدایت پر مکمل طور پر عمل کرنا پڑے گا اور
 ٹھنکے کی ہر کوشش میرے لیے بے کار ہوگی۔

میں پر کاش کو بھی سمجھ بکھ جانگی تھی کہ میں انہی لوگوں میں ہوں اس لیے اس نے میرا تعاقب کر کے میری
 کا چلا گیا تھا کہ میں اس سے دوبارہ نہ مل سکی۔ اسٹیل نے مجھے بتایا کہ ہماری ٹینک ہے جہاں پاکستان سے آئے
 لوگ اور وہی ہوں گے۔ میں یہ سن کر خوش ہو گئی تھی کہ شاید ان میں ظاہر بھی ہو یا شاید میری ملاقات وہاں
 ہو جس اور اسٹیل وہاں پہنچے تو ایک بڑی عمارت تھی۔ ہم ایک کمرے کے دروازے تک پہنچ گئے۔ اسٹیل نے دروازہ
 دھک دیا۔ دوسرے ہی کے دروازہ کھلا اور دروازوں میں سے کمرے ٹھنکے ٹھنکے کمرے میں ہو گیا کہ وہ



اب آپ آگے پڑھیے

اور بعض تھا جو میرا ایکسٹنٹ ہونے پر ڈانڈا کر
 میرے گھر آیا تھا جس کو طارق کے نام سے وہ
 مل گیا۔ ایک مرتبہ جب ظاہر اپنیل میں تھا تو اس
 نے فون کر کے اپنیل میں بلوایا تھا کہ ظاہر مجھ
 کا ہانا ہے اور ہاں نے مجھے روک دیا تھا۔ میرے علم
 اس کا تعلق سینٹہ سلطان سے تھا۔ اس کے
 کہ اس کی گویاں میں ہدی تھیں جنہیں کھار کھانے
 والی اور مجھے افرار کیا جا رہا ہے۔ یہ کہہ کر ایک فلم
 میں پہلے گئی تھی اور میں چلا کر رہ گئی تھی۔
 "ہے..." آدمیوں کے درمیان یا کہیں عجیب
 اس پر رفتار تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر سٹنڈ پڑا تھا۔
 میں مس آرا! اپنا ایک اسٹیل۔ مجھ نے چوٹا

اور "ہی..." میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا اور اندر
 آ کر وہاں مجھے حیرت آئی اور مجھ کا لگا۔ میں بھی
 اور کئی دہائیوں میں سے پہلی مرتبہ ظاہر کی
 کی ملازمہ کی حیثیت سے پایا اور پھر نفس کی
 میں سے بات بھی کی تھی۔ وہ کوشی میں تھی اور
 اس میں مجھے پہچانے سے انکار کر دیا تھا۔ یہاں
 پہلی اس کی نظروں میں میرے لیے کوئی ششاسنی
 نے پورے کمرے میں نگاہ دوڑائی اور مایوس
 اور اسے بچانے چوں کے روک کر چوہ میرا ششاسنی
 اس کی کمرے میں قتل اور طارق کے سامنے بیٹھے
 ان میں دو مقامی اور باقی پاکستانی تھے۔ یہ سب
 پہلی اس کی شکل کے گروہ تھے۔ سائے کے
 ایک بڑی کالی خالی تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے
 یہاں بیٹھ گئے۔ مس اسٹیل نے میرا سب سے
 اور اس نے کل کو اس نے عصمت اور طارق کو ریاض
 تعارف کرایا تھا۔ میں نے اس پر کوئی تبصرہ
 نہیں کیا۔ ان لوگوں نے کوئی بات کی۔ پھر بعد
 اور اس کے ساتھ چھ لوانزات کے ایک تھائی لڑکی
 اس کی چند ہی گھنٹوں بعد کمرے کے اندر ہی کا
 اور ملا جو بڑی کرسی کی پشت پر تھا اور غالباً کسی
 اس کے کارواڑہ تھا۔ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز
 اس کا ہاں روکھی بہت کم تھی اس لیے آئے والا
 اس کی طرح نظر آ رہا تھا جیسی اسے دیکھ کر کھڑے

ہو گئے۔ میں اور اسٹیل بھی کھڑے ہو گئے۔
 "بھئیے آپ لوگ!" ایک بھاری اور خوب صورت
 آواز کمرے میں گونجی، انہی اندر آنے والا کرسی پر بیٹھ گیا۔
 اب اس کے چہرے پر روکھی بڑی تھی مگر روکھی اتنی تیز
 نہیں تھی کہ میں اس شخص سے غصہ خال دیکھ سکی۔ بہر حال
 وہ میرے لیے قطعی اچھی تھا۔

"میں یہاں بٹھ کر بنے چہرے پر دیکھ رہا ہوں۔ مس اسٹیل
 آپ تعارف کرنا پسند کریں گی؟" اس نے مجھ سے ہونے
 لیے میں کہا۔ پھر بھاری ہونے کے باوجود اس میں بڑا لوج
 اور بڑی اسٹیل اور نہ معلوم کیوں مجھے بہت اچھا لگا۔ وہ
 قطعی باس چپ کی طرح تھی اور مجھے اس سے ذرا بھی
 خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"جی مسزوقار!" اسٹیل مسکراتی ہوئی پھر اس نے
 فردا کو سب کا تعارف کرایا۔ میں لگتا جیسے وہاں موجود
 ہر شخص "سوائے" اسٹیل کے اس کے لیے اچھی ہو۔
 "ٹھیک۔" وہ سوتلا یہ میری آپ لوگوں سے پہلی ملاقات
 ہے اس لیے آپ کے ذہن پر کوئی بوچھ نہیں ڈالنا
 چاہتا البتہ مس اسٹیل آپ کو میرے بارے میں مختصراً
 بتائیں گی۔" ان کا کہہ کر وہ اسٹیل سے مخاطب ہوا۔ "مس
 اسٹیل آپ زحمت کریں۔"

"میں ریاض پٹیل / مسزوقار تھا اشرف علی خان کے
 دست راستہ اور طارق میں سیم کے سربراہ ہیں۔ یہ اب
 کچھ ناگزیر حالات کی وجہ سے یہاں شفٹ ہو گئے ہیں اور
 یہاں ہماری سرپرستی کریں گے۔ طارق میں بی افال سیم
 کو انڈر گراؤنڈ کر دیا گیا ہے انہیں ہمارا سرپرست بنانے
 کا مقصد ہمارا اتنا کہ کہہ رہا ہے کہ سیم زیادہ خطر
 کیونکہ یہاں کام کرنے کے زیادہ مواقع ہیں اس کے علاوہ
 مسزوقار کی موت کے بعد میں خود بخود پیدا ہو گیا تھا اسے
 کرنا بھی ناگزیر تھا۔ آج کے بعد ہم سب مسزوقار کے
 سامنے جواب دہ ہیں اور اسھی سے ہدایت لینے کے مجاز
 بھی۔ آپ کی باڈی کیونکہ کچھ تعاقب پائی ہے اس لیے
 آپ لوگ آج کسی بات یا کسی شخص کے پابند نہیں ملکہ
 دوستوں کی طرح آزاد ہیں۔ یہ پائی مسزوقار کی طرف سے
 ہے اس لیے آپ سب کی طرف سے مسزوقار کو یہاں
 خوش آمدید کہی ہوئی اور اس پائی کا شکر یہ ادا کرتی
 ہوں۔"

فائلز مس! ”خجلا آپ ایک اچھی مقررہ ہیں۔“ مسٹر وقار نے تائی بجائے ہوئے مسٹر کرکما۔

”تھینک یو مس!“ اس خجلا نے سر کو جھکا کر کہا۔

”ایڈیٹرز جنٹلمین! آئیے جلیں میں پہلے ہیں جہاں خوشیاں ملیں گے۔“ مسٹر کرکما نے کہنے سے پہلے ہی چلنے لگے۔

”ہوئے کام اور بھی افراد کہنے ہو گئے چند لمبے پتھر کی روٹی کی طرح سناٹ بیٹھے لوگوں کے سپاٹ چلوں پر اچانک زندہ لوگوں کا گمان ہوئے کہ اور ان کے چہرے پر زندگی کے رنگ کھل اٹھے۔

ہم بس مسٹر وقار کے سٹوڈنٹس تھے ہوتے ہوئے نیچے ایک بڑے ہال میں داخل ہو گئے جہاں شراب کی رنگین بوتلیں اور خوب صورت کالج کے نازک گلاس رکھے تھے۔ چند ہی محوین بعد پورے ہال میں گلاس ٹکرانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ نیچے اس ماحول میں کراہیت ہی ہونے لگی۔ میرا پی پیٹ بھی بڑا بھانگ جاؤں کرشم مجبور تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے شدید ہرجت ہوئی کہ کل اور! خجلا بھی شراب نوشی کر رہی تھیں۔ میں چپ چاپ ایک میز پر گرو بڑی کرسی پر بیٹھی۔ ایک طرف میں شراب اندازنے میں تھے اسکاٹھ مجھے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں اس کا رخ کر دیکھا تو حلاق کو دیکھنے خجلا نے ریاض کے نام سے متعارف کر گیا تھا! اپنے قریب دیکھ کر سنانے میں رہ گئی۔

”میں بیٹھ سکا ہوں؟“ اس نے چہرے پر مسکراہٹ بچائے ہوئے ذرا سا جھک کر کہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اپنی غمازی اور اچھی نیتی محسوس کی۔ پہلی کرسی بھٹتی لہر دو ٹوٹی۔ وہ میرے جواب دینے سے پہلے ہی کرسی سرکار سے پیچ گیا۔

”جنس طرح میں آپ کو یہاں نظر آیا ہوں اس سے آپ کو آزاد ہو گیا ہو کہ میں کیا ہوں۔“ میں نے صرف اعتراض کرنا تھا کہ میرے سلسلے میں یہ حد متجاوز ہونے لگا۔ میں بھی آپ کا خیال رکھوں گا لیکن آپ کو محتاط نہ رہیں تو پھر۔“ اس نے جملہ اور حوا پر چھوڑ دیا مگر اس کے انداز میں۔ جیسے تینا دلدادہ کہ اب میری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں۔ پھر پھر اپنی کنٹینڈن سے نکل کر کانوں کے قریب رینگ رہا تھا۔ ناٹکس ہی طرح ناپی رہی تھیں اور ہاتھ پاؤں بالکل خنڈے ہو چکے تھے۔

وہ اب بھی میرے سامنے بیٹھا مسکرا رہا تھا تو میرا مسکراہٹ آج سے پہلے بھی نہیں چمکا۔ اچھا میرے قریب آئی۔
 ”بس تارا آپ کچھ نہیں لیں؟“
 ”جی۔ جی۔ جی۔ میں۔۔۔ وہاں۔۔۔“
 طور پر پکپکا رہا تھا۔
 اچھا نے دور بھر کو انھیں پکارا کہ
 ”بڑے اور بڑے لانے کو کہا اس اور
 جی ریاض اٹھ کر دوسری جانب چلا گیا اور
 جی جن نگاہوں سے بچھے دیکھا تھا ان میں
 غور کا پورا پورا کی کو شش کرنے لگی۔ اچھا
 اور دورے کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بھی
 مجھے دیکھ رہی تھی۔ ”بس تارا!“ اس نے
 غائب کیا۔
 ”ہوں!“
 ”کیا بات ہے۔ آپ غور فرمیں؟“
 ”نہیں۔ میں تو سنا اچھا اور اصل
 میں کسی ایک بات میں شریک ہوئی
 مفید تو ہوں۔“
 ”وہ کم از کم اس تارا! یہاں کوئی بھی
 جس سے غور فرمے ہوا جائے۔“ اسی لئے وہ اس
 آیا تو یہ جیہ۔“ اچھا نے جیسے اس کا
 سر کاٹا۔ میں نے جلدی سے اسے دو ٹوٹ
 یک ہی سانس میں اڑھا لیا۔ شریک ہوئی
 میں نے گنگریں طاق پر تکی ہوئی
 سنی انھیں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”بس تارا اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔“
 کہا تو دیکھ چکا تھی۔ میں نے اس کی ہاتھ
 طاق کو دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی
 ہاتھوں کا قیاس کیا تھا۔
 ”وہ کچھ بھی نہیں میں۔ اچھا!“
 ڈی۔ عجیب غور فرمیں اور اچھا بھی
 ”یران ہوئی۔“ کنگ۔ کچھ بھی نہیں میں
 ”کہاں کہ اس بات میں۔۔۔“
 ”کسی چیزوں اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔“
 ”میں تمہیں کہ سمجھتا ہوں کہ

”مس آرا! اگر میرے بارے میں کسی کو معلوم ہوا تو میں
میرا مطلب ہے کہ میں سات آدمیوں کو قتل کر چکا ہوں جن
میں دو عمریں بھی شامل تھیں“ ایک کو تو آپ خود جانتی
ہیں۔ زنت آپ کو بھولی تو نہیں ہوگی۔“
”وہ ہونے لگا۔ میں۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔“
میں رو پائی ہوئی۔
”خود کو سنبھالو ورنہ۔“ وہ اتنا کہ کرتیزی سے کھانے
کی ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔
میری آنکھوں میں آنسو گرہنے تھے اور سرری طس
کیرا ایک دروازہ زنت کے کمرے کے کچھ پکان کی گڑھا تھا۔
مجھے اس کی تصویر یاد آگئی جو اخبار میں بھیجی تھی۔ اس
کے بدن پر جگہ جگہ زخم تھے اور خون جن کی سیاہ پچکا تھا۔
ایک تجربی سی میرے بدن میں دوڑتی تھی۔ میں نے اپنے
کھینچے ہوئے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں
پھنسا لیا۔
”مس۔ آپ ٹھیک تو ہیں! میں مسزوقا ر کا اپنے
بالکل قریب بار پشپاٹ تھی۔ وہ جبکہ کہتے غور سے مجھے دیکھ
رہے تھے۔“
”جنگ تھی۔“
”کی جنگ مسزوقا ر میرے سر میں کچھ درد ہے
اوس کی۔“
”وہ سننا درد دہشت شدید ہے“ آپ کا چہرہ قہر بوبا
میں سے دو دن ملکا ہوا۔“ وہ اتنا کہ کہ دوسری جانب
مڑنے لگا۔ میرا وہاں بیٹھنا دوہر بوبہ تھا۔ میں تو میں
خینا کے چوٹا ہونے پر بھی پشیمان تھی اور اب یہ مسز
تار سے میں خت ابھیں میں تھی کہ آخر کیا کہوں میں جانتی
تھی کہ طارق مجھے نوٹ کر رہا ہے وہ ا خینا کے میرے
پاس آکر بات کر رہا ہے۔ میں نے دھمکی دے چکا تھا اب کہ
جانتی تھی کہ وہ خواہ خواہ میرے پیچھے لگ جائے عمریں
بے چرے کا کیا کرنا جو ہر بات کی چٹلی کھانے لگا تھا۔ میں
کوئی بات بھی نہیں چھیپاتی تھی۔ بھلا! اس خینا کے مجھے
بے رنگ کی ضرورت تھی جو ابھی غروب میں تھی۔ میں
دیکھ کر کپھیں نہیں سمجھتی۔ اس خینا اور مسزوقا کو کچھ نہیں
تاؤں گی۔ مسزوقا تو شاید کچھ نہیں سمجھیں گے۔ خینا

کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ نہ صرف جان چکی ہے کہ میں کس سے خوف زدہ ہوں بلکہ وہ اس سلسلے میں طارق کی طرف سے مشکوک بھی ہو چکی ہے۔ اس لمحے مجھے طارق کا خیال آیا میں نے ادھر ادھر تلاش کیا وہ دائیں جانب کی ایک ٹیبل پر ٹکل کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ ٹکل اس سے کافی بے تکلف معلوم ہو رہی تھی اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔

”مس تارا! تم پھر پریشان ہو!“۔ بخلا ہاتھ میں ٹرے اٹھائے قریب آگئی تھی۔ اس نے پلیٹیں ٹیبل پر رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

”نہیں مس! بخلا، آپ خواہ مخواہ پریشان ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں بلکہ میرے سر میں شدید درد ہو گیا ہے اور بس۔“ میں نے بالکل نارمل انداز میں جواب دیا۔ میں خود کو بڑی حد تک سنبھال چکی تھی۔

اس دوران میں مشروقار بھی آگئے۔ ان کے ہاتھ میں ٹیبلٹس تھیں۔ ”لجئے مس تارا! دو گولیاں آپ کو منٹوں میں ٹھیک کر دیں گی۔“ انہوں نے گولیاں میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا، پھر ”بخلا سے مخاطب ہوئے۔ ”بھئی آپ کی ممان کی طبیعت خراب ہے اور آپ سائب تھیں۔“ ”میں کھانا لینے گئی تھی مشروقار!“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”آئیے آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جائیے۔“

”نہیں مس! بخلا مجھے ذرا کسی کا انتظار ہے، ویسے مس تارا کے ساتھ کھانا نہ کھا کر میں کافی افسردہ رہوں گا مگر مجبوری ہے۔ خیر مس تارا یہ ادھار رہا پھر کبھی سہی اور ہالند۔ آپ اگر جلدی جانا چاہیں تو چلی جائیے گا بس اپنا خیال رکھئے گا۔“

”اوہ تھینک یو مشروقار۔ میں خیال رکھوں گی۔“
”اوکے لیڈین۔ بائے۔“

”بائی۔“ میں نے اور ”بخلا نے ایک ساتھ کہا۔ ان کے جانے کے بعد میں اور ”بخلا کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ٹیبل پر رکھی گولیاں اٹھا کر میں نے پرس میں رکھ لی تھیں۔ آدھے گھنٹے بعد ہی میں اور ”بخلا جانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہاں موجود تمام لوگوں سے خدا حافظ کہہ کر ہم عمارت سے باہر آگئے جہاں بیڑھوں کے قریب ہی ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ تھائی ڈرائیور ہمیں دیکھتے ہی آگے بڑھا اور اس نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

گھر پہنچ کر میں سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پھر لے بغیر ہی بستر پر گر گئی۔ ایک اور عذاب طارق کی صورت میں مجھ پر نازل ہو گیا تھا۔ میں اچھی طرح جان لے کہ وہ سیٹھ سلطان کا آدمی ہے اس نے مجھے انگوٹھ کو شش بھیجی کی تھی اور اب معلوم ہوا تھا کہ زینت کرنے والا بھی یہی طارق تھا۔ میں سب کچھ بھول سکتی مگر زینت کی موت کو بھول جانا میرے بس میں نہ تھا۔ حضرت تو طارق کی دیدہ دلیری پر تھی کہ وہ کس جو انہوی اس تنظیم میں شامل ہو گیا تھا۔ اسے یہ خیال بھی نہ تھا کہ اس کوئی اسے پہچان بھی سکتا ہے ممکن ہے اسے میرا حال سے ہو مگر ظاہر بھی تو یہاں ہو سکتا تھا۔ وہ ہوتا تو اسے پہچان لیتا۔

اس لمحے ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں پھینکا وہ جانتا تھا کہ یہاں ظاہر نہیں ہے ورنہ اس کی موجودگی میں وہ اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ نہ ہی سلطان اسے یہاں بھیجتا۔ میں بے چینی کی وجہ سے اٹھ بیٹھ گئی اور تھپی میں اچھل پڑی۔ میرے قریب ہی کر رہا ”بخلا بیٹھی تھی۔ جانے وہ کب کمرے میں داخل ہوئی اور کھب قریب پڑی کر سی پر آ بیٹھی مجھے بالکل بھی احساس نہ ہو سکا۔

”مس تارا!“
”جس جی!“ میں گھبرا گئی تھی۔
”جو بات بھی ہے وہ صاف صاف سننا پسند کروں گی۔ نہ کہنا کہ کوئی بات نہیں ہے یا۔ یا تمہاری طبیعت خراب ہے۔ میں اصل بات سننا چاہتی ہوں پلیز۔“

میں سن رہ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں جو اب دوں۔ نہ بتاتی تو بھی مشکل میں گھری رہتی اور بتا دیتی تو بھی ”اس وقت کوئی ایسی بات بھی نہیں سوچ رہی تھی جو میری جان بچا لیتی۔

”دیکھو مس تارا! اگر تم کسی سے خوفزدہ ہو تو بھی میری بات بتا دینا چاہیے اس لیے کہ نہ بتا کر تم ہماری سب سے محروم رہ جاؤ گی اور کسی بھی لمحے انجانے میں مارا جا سکتی ہو گی اور اگر ہمیں بتا دو گی تو ہم تمہاری حفاظت میں سب انتظام کر سکیں گے اور ہر طرح دیکھ بھال کر حل کرنے کی کوشش کریں گے، تم میری بات سمجھ رہے ہو سنا!“۔ ”بخلا کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا اور صاف طور

”اے کہ بھرتے نکالے کہ اے کہ بھرتے نکالے“

— ۱۱۱ —

[illegible]

میں رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں اور بس!۔۔۔ یہ سب لوگ بہت اچھے
میں! سچا تو میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ تم
تمہاری کیا ذمہ داریاں ہیں۔ مس! سچا
تھیں۔“

”جی ہاں میڈم! آپ کو ڈرائیونگ سکھانا
داری ہے اور میں آپ کے باڈی گاؤز کی دیکھنے
کے ساتھ بھی رہوں گا۔“

”گڈ! یہ بہت اچھا ہوا! اس طرح میں بلا
کچھ سیکھ لوں گی۔ ویسے میں بہت جلدی نروس
اور میرا خیال ہے کہ مجھے اپنی اس غامی پر قابو
ورنہ بہت پریشانی ہو جائے گی۔“

”آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ میں اتنا اعتماد
گا کہ آپ نروس نہیں ہوں گی۔ میڈم! یہ لکھ
ماحول اور یہ حالات آپ کے لیے پریشان کن ہیں
اب اس کا عادی ہو جانا چاہیے۔ زندگی صرف
ہے جسے انجوائے کرنا ہر زندہ آدمی کا حق ہے۔
یعنی دنیا میں کچھ نہ کچھ تو گرتا ہی پڑتا ہے پیٹ کی
تو دن رات محنت کر کے صرف دو وقت کی روٹی
جبکہ آپ کو یا مجھے تو بہت کم محنت کر کے عیش کی
ہے اسے فکرا دینا کفرانِ نعمت ہو گا۔ بس خود کو
کے مطابق ڈھالنا ہی تو ہے ورنہ یہاں کون
کر رہا۔ جو کام ہماری تنظیم کر رہی ہے کیا وہ
نہیں کر رہے؟ کیا اس تنظیم سے نکل کر ہم
ایک محفوظ زندگی گزار سکتے ہیں؟ اس کی کیا ضمانت
پھر ہم پر عذاب نہ آئیں گے یا ہم ایک پرسکون
سکیں۔ کوئی ضمانت نہیں، سکون تو ساری دنیا
ہے میڈم پھر۔۔۔ پھر یہاں رہ کر یہ کام کر کے
زندگی گزار سکتے ہیں۔ نہ کوئی آپ سے قیل
ڈاکا ڈال رہا ہے بس کچھ رسک ہے، مگر اتنا رسک
کے حصے میں، ہر قسم کی زندگی میں آتا ہے۔
آپ زندگی کیسے گزار سکتی ہیں۔ یہ بزنس ہے
بزنس، اور بزنس کرنا کچھ غلط نہیں۔ بات غلط
اتنی ہے کہ یہ بزنس ان اشیاء کا ہے جسے عام
پسند نہیں کرتے مگر۔۔۔“

”مگر یہ نشے کا بزنس ہے۔“ میں نے اور
میں نے اس کا بلب لگا تھا۔ میں نے لاکھ کھوکھلے حصے میں
رکھ دیا اور دوبارہ اس کے نٹ کس دیے۔ یہ محفوظ ترین
جگہ تھی۔ لاکھ وہاں چھپا کر میں بہت زیادہ مطمئن ہو گئی
تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر میں سیدھی کچن کی طرف چلی
آئی۔ اور بس نے آہستہ سن کر پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اس کے
چہرے پر بڑی مطمئن مسکراہٹ تھی مگر ساتھ ہی اس نے
ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر جب
سے ایک کانڈ نکال کر میری طرف بڑھا دیا، شاید اس نے
پہلے ہی کچھ لکھ کر رکھا ہوا تھا۔ میں نے پرچے کو کھول کر
پڑھا، لکھا تھا ”میڈم! آپ کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ خدا
کا شکر ہے کہ آپ ٹھیک ہیں۔ یہاں بات کرنا خطرناک نہیں
ہو سکتا ہے اس لیے محتاط رہیے، ممکن ہے کہ ہماری گفتگو
کبیں سنی جا رہی ہو۔ میں کچھ دیر میں آپ کے کمرے میں
آتا ہوں۔ وہاں وہ سب باتیں کروں گا جس کی مجھے ہدایت
دی گئی ہے۔ اب آپ مطمئن رہیں۔ میرے ہوتے ہوئے
آپ کو ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔
میں یہاں ایک اور شخص کو اپنا حامی بنا چکا ہوں، اس کے
بارے میں آپ کو وقت آنے پر بتاؤں گا۔ آپ کے ساتھ
اب تک جو کچھ پیش آیا وہ لکھ کر رکھیں تاکہ میں بھی مکمل
حالات سے آگاہ ہو سکوں اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے
کر سکوں۔“

میں نے سر ہلایا اور واپس اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وہ
ٹھیک کہتا تھا ہمیں محتاط رہنا چاہیے تھا۔ مجھے حیرت اس
بات پر تھی کہ اشرف علی خان نے مجھ پر یا اور بس پر اتنا
اعتماد کس طرح کیا کہ ہمیں یکجا کر دیا۔ بہر حال اب میں کافی
حد تک خود کو مضبوط محسوس کر رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد
اور بس چائے لے کر کمرے میں داخل ہوا، اس دوران
میں، میں یہاں پہنچنے سے لے کر آج تک کے حالات لکھ چکی
تھی۔ طارق کے بارے میں بھی میں نے تفصیل سے لکھ دیا
تھا۔

”میڈم چائے!“ اس نے بلند آواز میں کہا اور کمرے
میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔

”آؤ اور بس! کیسے ہوا!“ میں نے بھی یوں جواب دیا جیسے
اسخلا کے جانے کے بعد میری اس سے پہلی ملاقات ہو۔
میں نے اپنا لکھا ہوا پرچہ اسے تھما دیا ”بہت بہتر میڈم، آپ
کیسی ہیں؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی!“ اس نے پرچہ جیب

آسانی ہو گئی ہے۔
 "جی جی! میں اس کے منتظر ہے حیران رہ گئی۔
 "ہاں۔ بس تارا! پاش میں طارن کی مہیاں موجود ہیں
 سے ایک بات تو واضح ہو گئی ہے کہ وہ کسی مقصد کے تحت
 مہیاں بھیجا گیا ہے اور وہ مقصد وہاں تک نہیں ہے جس کے
 بارے میں یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ وہ اب تک سیوہ سلطان
 کے ہاتھ لگ چکی ہے مگر نہیں۔ وہ قلم اب تک اس کے
 ہاتھ نہیں لگی ہے اب وہ طارن کو یہاں بھیجے گا مقصد صرف
 اور صرف وہاں تک قلم حاصل کرنا ہے جو شاید پاکستان سے
 بنگال پہنچ چکی ہے۔ وہ چنچا کر افساد ادا کر رہا تھا اس
 کی تیز اور چلی آگئیں، منہ دیکھتی ہوئی سلاخوں کی طرح
 میری آنکھوں میں دھنکی چلی جا رہی تھیں۔ میرا دل بری
 طرح دھڑک رہا تھا۔

"وہ کیا چیز۔ بگیرہ قلم کیا ہے سر؟"
 "وہ قلم بہت اہم ہے میں تارا! اس کی وجہ سے سسر
 طاہرہ۔ نہ معلوم کیوں اس نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔ مجھے
 لگا جیسے پوری دنیا سات ہوئی ہو شاید سب جگہ قسم ہو گیا
 ہو، چیر پا ہو چکی ہو اور مجھے جیسے کوئی دیر سے مرے قبر
 میں آنا رہا ہوں۔ میرا دم لگنے لگے۔ قلم میں گری ہو چکی
 اور آنکھوں کے کنارے پھلے لگے۔

"کیا کیا ہوا طاہرہ کہ؟" میرے لبوں سے نکلنے والی
 آواز تھیں جسے دور سے آتی محسوس ہوئی وہ جیسے بہت سے
 پہاڑوں کے درمیان کسی کی آواز بازداشت بن کر میری
 سماعت سے گرائی ہو۔

"انھیں اڈیشن برداشت کرنا پڑی تھیں۔" وہ پھر
 اور حیرت بات کے خاموش ہو گیا۔
 "مگر وہ۔۔۔" اور جانے کئے مجھے ہوش آگیا۔ میں
 جانے لگا کینے والی تھی کہ اچانک دروازہ کھلا اور درمیان
 جانے کی ٹرے لے کر آ گیا شاید اسے یہ دیکھ کر کہ مجھے
 ہوش آ گیا تھا میرے حواس بیدار ہو گئے تھے۔

"وہ قلم ہے تم جاؤ۔" رے رکھتے ہوئے آگیا۔
 اور میں کو گمراہ۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں قلم تھمے دیتا
 ہوا چلا گیا۔

"وہ قلم ایک سونے کی لاکٹ میں تھی میں تارا اور یہ
 لاکٹ مشرقا پر کی ہے۔ روڈ کی وجہ سے کم ہو گیا۔ وہ اس
 کی حفاظت نہیں کر سکے اور خواب و خیال میں ہونے سے بھی

شکر ہے کہ سیوہ سلطان کے ہاتھ لگ نہ سکے۔
 اندازہ ہو گیا کہ وہ لاکٹ اس کے ہاتھ نہیں
 طاہرہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔
 یہ جملہ نہیں وہ قلم تھا جس سے میرے
 جان بڑی۔ طاہرہ زندہ ہے، یہ سن کر مجھے ہوا
 چین آ گیا۔ جیسے میرے سینے میں کڑا ہوا گولی
 لیا گیا ہو۔

"اب۔۔۔ کیا ہو گا سر! وہ لاکٹ میں طاہرہ
 ہونوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔
 چہن چلی گئی دے رہی تھی مگر پھر میں
 آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
 "مل جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ طاہرہ
 ہو گا۔ ممکن ہے کہ وہ سیوہ کو ڈبل کر اس

کر رہا ہو۔ ہمارے پاس آئے گا مقصد ہم اور
 جو بھی ہو گا سامنے آئے گا۔" اس نے
 کڑا ہو گیا۔ آگیا چاہے تیار رہی تھی۔
 میں تھا۔ وہ کڑی کیس جا کر کھڑا ہو گیا۔
 "میں تارا! اگلے سے تم مجھے جو ان کی
 "جی۔ کیا مطلب؟" میں پوچھا۔
 "میں میرا مطلب ہے کہ تم کل سے

گئے۔ میں تمہاری صلاحیت سے بھر پور
 ہوں۔ ہر مل کر اس شہر پر کام کریں گے۔
 دھڑلے سے عداوت میری سماعت سے کام
 ایک پارٹی کے لوگوں کے بارے میں اس
 ہوں اس سلسلے میں تم میرے دوست رہو۔
 "کیسی پارٹی مشرق کا؟" آگیا پوچھا۔
 چائے کی چٹائی مشرق کی طرف بوساوی۔

"وہ بھی ہمارے حریف ہیں۔ ان کی
 پروگرام، ان ازمائشوں پر ہوسکتی ہے مگر ان کا
 ہرے مختلف ہے مگر پھر بھی کسی قسم کا
 سکھ۔" وقار نے پیالی تھامے ہوئے کہا اور
 دیر سے پیالی میں ہچکچاتے ہوئے لگا۔

"گنگہ پارٹی کی طرف تو اشارہ نہیں ہے اب۔
 "ہاں۔" میں
 "میں مشرقا وقار ان کا کام صرف یہ ہے
 اور میرے خیال میں ان کا ہم سے گراوی

تھیں۔ میں اس پارٹی کو جانتی ہوں بلکہ اس پارٹی
 کے لوگوں سے بھی میری جان بچاؤ ہے۔
 "گنگہ۔" مجھ کے تم ان کے زندہ ہر طریقے سے نظر کر
 کی اور وہاں میں آگیا ایک بات اور اس تارا آن
 لہری تھیں میری بین ان کا ہر طرح خیال رکھنا سب
 افسوس ہے۔

"فرش تو ہم پہلی انجام دے رہے سسر وقار
 طاہرہ خیال میں گئے۔" آگیا نے سسر کا جواب دیا
 خطاب ہوئی۔ "میں تارا آپ کو مبارک ہو گیا
 سب حالت اہم ہو گئی ہیں۔"

"میں بوس آگیا۔
 "میں بوس تارا! اب آپ آرام کریں۔ کل میرا
 تارا آپ کو خوش لے آئے گا۔ اوکے؟"

"ادلت ہے، امین، اتنی اہم وقار تو قیادروانی۔"
 "ادلت ہے، امین، اتنی اہم وقار تو قیادروانی۔"
 "ادلت ہے، امین، اتنی اہم وقار تو قیادروانی۔"

"میں بوس آگیا۔
 "میں بوس تارا! اب آپ آرام کریں۔ کل میرا
 تارا آپ کو خوش لے آئے گا۔ اوکے؟"

"ادلت ہے، امین، اتنی اہم وقار تو قیادروانی۔"
 "ادلت ہے، امین، اتنی اہم وقار تو قیادروانی۔"
 "ادلت ہے، امین، اتنی اہم وقار تو قیادروانی۔"

"میں بوس آگیا۔
 "میں بوس تارا! اب آپ آرام کریں۔ کل میرا
 تارا آپ کو خوش لے آئے گا۔ اوکے؟"

"ادلت ہے، امین، اتنی اہم وقار تو قیادروانی۔"
 "ادلت ہے، امین، اتنی اہم وقار تو قیادروانی۔"
 "ادلت ہے، امین، اتنی اہم وقار تو قیادروانی۔"

"میں بوس آگیا۔
 "میں بوس تارا! اب آپ آرام کریں۔ کل میرا
 تارا آپ کو خوش لے آئے گا۔ اوکے؟"

ادلت ہے، امین، اتنی اہم وقار تو قیادروانی۔



ادلت ہے، امین، اتنی اہم وقار تو قیادروانی۔



"میں تارا آپ ناشتا کریں آپ کو دس بیجے تک آفس
 پہنچنا چاہا ہے۔"

"جی! میں کرسی گھسٹ کر بیٹھ گئی۔ پکا
 سا ناشتا کیا اور کڑی ہوئی۔ اور میں میرے ساتھ تھا۔
 گاڑی کڑی تھی اور ڈرائیور الٹ تھا۔ گاڑی میں بیٹھے
 بیٹھے میری نگاہ سڑک کی دوسری جانب کڑی سفید رنگ کی
 فوٹا پر پڑی جس کی کڑی سے پر کش کا سکرنا اچھو صاف
 نظر آ رہا تھا۔ اس کے جڑے تیزی سے مل رہے تھے۔ غالباً
 وہ عادت کے مطابق جیو مگر چارہ تھا۔ میں اسے دیکھ کر
 حیران رہ گئی اور وہ وہ دونوں سے غیر حاضر تھا اس لیے میں نے
 اس کے بارے میں اندازہ لگایا تھا کہ وہ گنگ آگیا ہو گا اور
 بنگال میں تفریح کر رہا ہو گا۔ طاہرہ نے میں نے اسے
 عجیب سمجھنے سے میں مضامین تھا۔ وہ جانے میرے بارے میں
 کیا سوچ رہا ہو گا۔

میں اس وقت چونکی جب ڈرائیور نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھائی۔ اور بس میری نگاہوں کا تعاقب کر کے پرکاش کو دیکھ چکا تھا اور کافی چوکتا ہو گیا تھا۔ میں پریشان ہو گئی کہ کہیں وہ ڈرائیور کے سامنے پرکاش کا ذکر نہ کر دے۔ ہماری گاڑی کے آگے بڑھتے ہی پرکاش کی گاڑی بھی حرکت میں آگئی اور اسی لمحے اور بس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ وہ اب بھی پرکاش کی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ اس لمحے میں نے اسے اشارہ کیا۔ اشارہ کرتے ہوئے میں نے خیال رکھا تھا کہ ڈرائیور بیک مرر میں مجھے نہ دیکھ رہا ہو۔ اور بس نے مجھے دیکھا بھی میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی خاموش رہا مگر تمام رستے وہ چوکتا تھا۔

گاڑی اجنبی راستوں سے ہوتی ہوئی براؤن کلر کی ایک بڑی عمارت کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ ڈرائیور نے انگریزی میں کچھ کہا جسے اور بس نے نہ صرف سمجھ لیا بلکہ اسے بڑی رواں انگریزی میں جواب بھی دیا۔ میں پھر اور بس کی شخصیت کے اس نئے پہلو میں الجھ گئی۔ ہم گاڑی سے اتر کر عمارت کی میڑھیوں کی جانب بڑھے۔ اسی دوران میں اسے پرکاش کے بارے میں مختصراً بتا چکی تھی۔ پرکاش تمام راستے ہمارے تعاقب میں رہا تھا۔

”آپ کو ایک اجنبی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں تو اسے وہیں دیکھ کر چونک گیا تھا کیونکہ میں اسے فلائیٹ پر دیکھ چکا تھا اور۔ اور اس کی آپ سے بے تکلفی کو بھی نوٹ کر چکا تھا۔“

”مگر میں کیا کرتی اور بس! تم میری اس وقت کی کیفیت کو سمجھ نہیں سکتے اور پھر مجھے ہر حال میں اس سے تعلقات بنانا ہیں اس لیے کہ اس کے ڈیڈی میری امی اور ابو کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ جانتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے مجھے میری ماں کے نام سے پکارا تھا۔ وہ میری ماں کو کس طرح جانتے ہیں یہ وہ سوال ہے جو اسی لمحے سے میرے ذہن میں کنٹنی نارے بیٹھا ہے۔“

”آپ مجھے ان کا ایڈریس دیجئے گا میں ان سے ملوں گا۔ میرے خیال میں پرکاش ابھی باہر ہی ہو گا۔“

”نہیں! میں خود ان سے ملنا چاہتی ہوں اور بس۔“ میں نے اس کی تجویز مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ”اور ہاں یہ بتاؤ طاہر صاحب کا کچھ پتا چلا!“

”نہیں میڈم! مگر میں سلام کو اشرف علی آدمیوں کے پیچھے لگا آیا ہوں۔ اسے ساری بات کہی تھی۔ وہ قابل اعتماد آدمی ہے، ممکن ہے وہ اب تلاش کر چکا ہو۔ میرا کوئی کنٹیکٹ نمبر اس کے پاس ہے خود مجھے ہی اس سے رابطہ کرنا ہو گا۔“

”تو پھر فوراً رابطہ کرو۔ میں ان کے لیے ہوں۔“

”میں کوشش کروں گا۔“ یہ کہتے ہی وہ دو قدم پیچھے ہو گیا۔ میں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ سامنے ہی مشرق وار نظر آگئے جو لفٹ کی جانب تھے۔ لفٹ میں داخل ہوتے ہی ان کی نگاہ پڑی۔ انھوں نے مٹن دیا کہ لفٹ کو بند ہونے سے روک میں مسکراتی ہوئی لفٹ کی جانب بڑھی۔

”میں نیچے ہی آپ کا منتظر ہوں گا میڈم!“ اور دھیرے سے کہا اور وہیں رک گیا۔

”ہیلو مس تارا! ہاؤ آریو؟“

”فائن مشرو قار!“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں داخل ہو گئی۔ انھوں نے ساتویں منزل کا اچھا ہوا آپ مل گئے ورنہ مجھے آپ کا آفس میں شاید دشواری ہوتی۔“

”نہیں مس تارا کچھ ایسی بھی دشواری نہ ہوئی پوری بلڈنگ ہی ہمارا آفس ہے۔ اس بلڈنگ کے حصے میں ہمارا کارخانہ ہے جہاں لیڈر کی بیٹیکس ہیں اور ہم یہ بیٹیکس ایکسپورٹ کرتے ہیں۔“

”اوہ۔ آئی سی۔“ میں نے جواب دیا۔

”یعنی!“ انھوں نے استغایہ لگا ہوں سے

”نہیں کچھ نہیں۔ میرا مطلب تھا کہ میں

کیا کرنا ہو گا!“

”محترمہ! یہ سب باتیں ہم کمرے میں آرام

کریں گے، یہاں لفٹ میں۔“

اتنی ہی دیر میں ہم مطلوبہ منزل پر پہنچ گئے

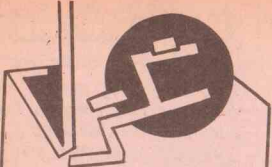
میں داخل ہوتے ہی مجھے اشرف علی خان کا آفس

بھی تقریباً ایسا ہی تھا۔ ہم ایک بڑے خوبصورت

داخل ہو گئے جسے بڑی نفاست اور خوبصورتی

تھا ایک جانب آفس ٹیبل تھی اور دوسری

پڑے تھے۔ وقار نے صوفے کی طرف اشارہ



اپنے آپ بالکل آزادی سے گھومیں پھریں۔
 اور زندگی گزاریں، آپ پر کوئی پابندی نہیں
 ہے، انفرادی کے انھوں نے آخری جملہ معنی خیز
 کی ایک۔
 میں خیال رکھوں گی۔ میں نے جواب دیا۔
 کے بل۔

اور اس وقت سے کراؤن فلور پر پہنچ گئی۔ مجھے مشکل سے
 کے ہوں گے۔ اور اس کراؤن فلور کے رستوران
 کے شجر کے لیے یہی عمارت میں تھا اور یہاں صرف
 کے متعلق لوگ آتے تھے۔ مجھے رکھتے ہی اور اس
 کے لیے ہم عمارت سے باہر آئے تو میں نے چاروں
 اور کھارے کھائے کبھی نہیں تھا شاید وہ چاہتا تھا۔ وہ
 الٹی نہیں تھی جس میں ہم ایک ننگ آئے
 اور اس عمارت سے باہر گر کر کیا اور پلوں میں "میںم
 یہاں انتظار کریں میں باؤنگ لائٹ سے گاڑی لے کر
 اور۔"

میری دیر بعد اور اس براؤن ہڈی کا ایک سوک لے کر
 کے وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے پیچھا دروازہ
 اور میں اندر بیٹھ گئی۔
 یہ گاڑی۔"

"میں نے گاڑی آپ کے لیے ہے، مسز وقار کے آدمی
 کے کل میں آپ کو وہ کبھی بھی دکھانے کا ارادہ نہ کیا
 کچھ بھی نہیں کرنا صرف ہماری پینیل کو دیکھ لیں اس
 مجھے ایک اہم مینگ جوائن کرنا ہے کل میں اس
 تفصیل بتاؤں گا۔ آئیے اب میں آپ کو
 دکھاؤں۔" یہ کہ وہ رومر کرے سے مجھ کو
 کمرے میں لے گئے اس کمرے اور مسز وقار کے
 کے درمیان ایک ڈارک کلاڈیش قائم تھا کہ ہم
 خوب صورت تھا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز
 کے کل سے آپ کو یہاں بیٹھنا ہے۔ آپ اس کی یاد رہے
 آجائے گا بارہ ماہ سے پہلے تک میں فارغ ہو گا اور
 پھر مجھے مصروفیت کی وجہ سے شام کو فرم
 اب اگر آپ جانا چاہیں تو جاسکتی ہیں۔"

"میں خوش ہوا۔" میں خوش ہوئی۔ اس نے کہا
 اور یہی وجہ سے خود کو کھانا ہوا محسوس کرتی تھی مگر
 وہی خوشی دیکھ کر قائم رہ رہی بلکہ اور اس نے فوراً ہی
 اشارہ کر کے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ "کیا مصیبت ہے؟"
 یہ اعتراض میرے منہ سے نکلا۔
 "کمال چٹنا ہے میڈم۔"

"وہاں اور اس کی یہاں ایک فلیج میری جائے والی ہے"
 وہاں جاتا ہے میں مسز وقار سے اجازت لے چکی ہوں۔
 انھوں نے کہا ہے کہ مجھے ہر جگہ آزادانہ کی آزادی
 ہے۔"

"ایڈریس ہے آپ کے پاس؟" اس نے پوچھا تو میں
 لے کر اس میں سے پر کاغذ کی ٹیڈی کا کارڈ نکال کر اسے

ہوگی۔"

"میں اپنی غامض سے واقعہ ہوں مسز وقار اور
 وعدہ کرتی ہوں کہ اب خود ہی جلد ہی کنٹرول حاصل کر لوں
 اور ان غامض بھی کنٹرولوں کی۔"

"گڈ وری گڈ میں جی چاہتا ہوں کہ آپ ہر معاملہ
 میں یہ فیکٹ ہو جائیں۔"

"آپ کی یہ خواہش جلد پوری ہو جائے گی۔"

پھر چند لمبے لمبے اوجھڑا کر ہی میں کرتے رہے۔
 اور پھر مسز وقار مجھے گاؤنگا دکھانے کے لیے لے
 بڑے بڑے ہال سے جہاں جڑواؤں مواد اور کوئی
 کر رہے تھے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی
 بات ٹوٹ کر نہ ہو جاتا کہ یہ لوگ کل کر میرے
 آجائے۔ "میں کوئی ایک اسٹیک کا اسٹیک بھی کر
 مجھے اس میں ٹوٹ کر نہ چکے تھے۔ کچھ بھی
 باتیں سن کر چاہتا کہ وہ اس اسٹیک کے لیے
 طریقہ اختیار کریں۔ یہ نہ ہی کر رہی تھی اس
 چل سکا تھا۔ لیکن یہاں مسز وقار کے ساتھ کام
 کافی کچھ معلوم کر سکتی تھی۔ ہم کچھ دیر کے بعد
 واپس آئے۔"

"میں نے اس کے علاوہ ہماری دواؤں کی اس
 ہے۔ کل میں آپ کو وہ کبھی بھی دکھانے کا ارادہ نہ کیا
 کچھ بھی نہیں کرنا صرف ہماری پینیل کو دیکھ لیں اس
 مجھے ایک اہم مینگ جوائن کرنا ہے کل میں اس
 تفصیل بتاؤں گا۔ آئیے اب میں آپ کو
 دکھاؤں۔" یہ کہ وہ رومر کرے سے مجھ کو
 کمرے میں لے گئے اس کمرے اور مسز وقار کے
 کے درمیان ایک ڈارک کلاڈیش قائم تھا کہ ہم
 خوب صورت تھا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز
 کے کل سے آپ کو یہاں بیٹھنا ہے۔ آپ اس کی یاد رہے
 آجائے گا بارہ ماہ سے پہلے تک میں فارغ ہو گا اور
 پھر مجھے مصروفیت کی وجہ سے شام کو فرم
 اب اگر آپ جانا چاہیں تو جاسکتی ہیں۔"

"میں مسز وقار کے ایک فلیج میری جائے والی ہے"
 وہاں جاتا ہے میں مسز وقار سے اجازت لے چکی ہوں۔
 انھوں نے کہا ہے کہ مجھے ہر جگہ آزادانہ کی آزادی
 ہے۔"

"ایڈریس ہے آپ کے پاس؟" اس نے پوچھا تو میں
 لے کر اس میں سے پر کاغذ کی ٹیڈی کا کارڈ نکال کر اسے

پر اس ایک جانب رکھ کر بیٹھ گئی۔
 "یہ صاحب جو آپ کے ساتھ تھے غالباً یہ بھی۔"
 انھوں نے حسب عادت جملہ اور حورا چھوڑ دیا۔ جملہ پرانہ
 کرنا شاید ان کی عادت تھی۔
 جی ہاں۔ یہ بھی تنظیم سے متعلق ہیں اور میں انہیں
 پاکستان ہی سے جاتی ہوں۔"

"ہوں! میرا خیال ہے کہ اس معاملہ میں مجھے کچھ بتایا تھا۔
 خیر! اس آراء آپ کے مشورے میرے لیے اہم ہیں۔ میں
 نے نوٹ کیا ہے کہ آپ میری نظر رکھیں ہیں۔ اس معاملے کی
 باریکیوں پر سوچتی ہیں اور ان باتوں کی طرف نشاندہی کرتی
 ہیں جن پر عام لوگوں کا دھیان نہیں جاتا۔ آپ کا کچھ کام
 نہیں سوائے بعض اہم معاملات کی تفصیل حاصل کر کے
 ان پر سوچنا اور اپنا کرنا۔ اس سے جو معاملہ یا جو مشن
 بھی شروع کیا جائے گا اس میں آپ کو شریک کیا جائے گا
 اور اس کا نقل رپورٹ تیار کریں گی۔"

"میں مسز وقار کے آپ مجھے اتنی اہمیت دے رہے
 ہیں۔ میں کو کوشش کروں گی کہ آپ کے معیار پر پوری
 اتر سکوں۔" میں نے ہر فکر سے جواب دیا۔ میں خوش
 تھی کہ اس طرح میں اپنے بہت سے معاملات سے آگاہ
 ہو سکوں گی جو بعد میں بہت کام آئیں گے۔ مجھے اس تنظیم
 کے خلاف وہ شواہد چاہنے تھے وہ کرنا اس آسان
 ہو گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ ظاہر کا بیان کیا ہے اس سے
 لاک بھی اس لیے میرے حوالے کیا تھا کہ اس میں تنظیم
 کے خلاف ایک نوٹ قلم تھی جس طرح لوگ اس لاک
 کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اس سے مجھے یہ خدشہ پیدا ہو گیا
 تھا کہ یہی نہ تھی اگر لاک میرے ہاتھ سے نکل گیا تو میں
 کی کوئی ایسا ہیاد رکھنے کا کوئی مواد مل سکا تھا اور میں ان
 لوگوں کے طریقہ کار سے واقف ہو سکتی تھی۔ اسی لیے میں
 نے بائبل و جنت اس کام کو کرنے کی ہائی بھی۔
 "کیا سوچ رہی ہیں جس آراء؟" مسز وقار نے مجھے چونکا
 دیا۔

"میں۔ میں سوچ رہی ہوں مسز وقار کہ جتنا اعتماد آپ
 مجھ پر کر رہے ہیں کیا تنظیم کے دوسرے لوگ بھی اتنی ہی
 اعتماد کریں گے؟"

"کیوں نہیں؟ میں آراء! اس ایک طاقت ہے کہ آپ
 بعض معاملات میں بہت جلدی ہیں۔ آپ میں کچھ بھی پیدا کرنا

کسی صورت میں ان کی آزادی نہیں جاتی
 کچھ سبب تیری فتنہ سامانی نہیں جاتی
 اچھی نگاہ نقش ہیں دل پر کسی کے نشتریں وے

اچھی نگاہ اس دل و شہ کی نافرمانی نہیں جاتی
 مری تہائی نے آنا کیا ہے خود سے بیگانہ!

تہداری یاد کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی
 مرے کا شہ زادوں میں یہاں ہیں کے آجاؤ

کراس آؤری ہوئی لہجہ کی وادی تپس جاتی
 رہا بہ دل پہ آئے سے تنہے پیچھے جاتی ہے

وہ ایک کبھی پرچا میں کبھی پانی نہیں جاتی
 گے ہیں گریہ پہرے کے چارو صحن گستاخ پر

کوچہ بھی گلوں کی چاک دامانی نہیں جاتی
 ہزاروں گیت غم کے چھپا رہا ہے سازوں

طبیعت ہے کہ تاجر اس کی جولانی نہیں جاتی

نامہ زمینی

ہوئے ہیں اس کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ برہما ہے۔
پاؤں میں تم نہیں سمجھو گے۔

”مگر یہ ڈیڈی۔ آپ کو دیکھ کر ڈیڈی کو کیا ہو گیا ہے
میرے بار بار بتاتے ہیں کہ وہ آپ کو ٹریا گئے ہیں وہ آپ
کے جانتے ہیں جب کہ وہ بھی پاکستان میں بھی گئے اور نہ
کبھی آپ انڈیا آئی ہیں۔ میرے خیال میں تو بنگال بھی پہلی
مرتبہ آئی ہیں۔ آپ نے بتایا تھا۔“

”اب اس میں اب سے پہلے ان سے کبھی نہیں مل کر کاٹ
۔ وہ مجھے نہیں سمجھتی اسی کو جانتے ہیں۔“
”مگر آپ کی کیا گمان ہیں۔ کیا وہ انڈیا میں ہیں؟“
”ہیں نہیں۔ اب اس دنیا میں کہیں بھی نہیں
ہیں۔“

”فہم میرے لیے کبھی نہیں پڑا۔“ وہ جھنجھکیا۔
”میں کہیں اپنے ننھے سے دلچزں بوجھ ڈالتے ہو۔ چھوڑو
ان باتوں کو بتاؤ کہ کون کیا ہوا ہے، تمہارے ڈیڈی کس
سے خوفزدہ ہیں!“

”جی نہیں وہ کس سے اور کہیں خوفزدہ ہیں۔ اندر تو
ڈیڈی کے بہت پرانے دوست بیٹھے ہیں۔ سورج اگلے اور
ڈیڈی ساتھ کے بڑے ہوئے ہیں بلکہ ڈیڈی کا سورج اگلے
کے ساتھ کا دیوار بھی قمار کھاتی عرصہ پہلے انھوں نے
مشترکہ کا دیوار خریدا۔ اور یہاں گا مینش کی دکان کھول
لی۔ سورج اگلے بہت عرصہ اس بات پر ڈیڈی سے ناراض
بھی رہے تھے کہ ان دونوں میں بڑا گریبا رہا تھا۔ اس لیے
کبھی بھی آجائے ہیں اور جب بھی ملتے ہیں ڈیڈی پر زور
دیتے ہیں کہ وہ پھر ان کے کا دیوار مشترکہ ہو جائیں مگر بات
نہیں کیوں ڈیڈی نہیں مانتے۔“
”یہ لوگ کتنی بڑے ہیں پلے جائیں گے!“
”جی نہیں! آپ کو کھلی ہے کیا؟“

”ہاں! بہت زیادہ دیر یہاں نہیں رہ سکتی اور بار بار
یہاں آؤ ان لوگوں کو مشکوک بھی کر سکتا ہے۔ میں نہیں
چاہتی کہ تم لوگ ان کی نگاہوں میں آؤ اور تمہارے لیے
کوئی نئی پریشانی کوئی ہو جائے۔“

میں سخت مضطرب تھی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ میں
جانتی تھی کہ اگر ادریش اب پریشان ہونے لگا ہوگا۔ میں جلدی
واپس جانا چاہتی تھی مگر یوں پرکاش کے ڈیڈی سے ملے بغیر
جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں جانا چاہتی تھی کہ وہ میری

ای کو کہہ جاتے ہیں اور میرے لیے سب
تھی کہ وہ یقیناً میرے ابو کو بھی جانتے ہوں
کے ڈیڈی میری اندھنی سی نظر کا پتا تھے۔ ان
اپنے ابو تک پہنچ سکتی تھی۔
”وہ شاید اگلے جا رہے ہیں۔“ کا لالہ
ہو گیا۔ اس کی آواز سن کر میں بھی چلا آیا
”اچھی۔ آپ بیٹھیں میں ابھی آئی۔“ یہ کہہ کر وہ
باہر چلا گیا اس کے باہر جانے کے بعد میں
سرسری جائزہ لیا اور میری نگاہوں پر گئے
فریم پر مگر وہی وہ۔ یہی اس عورت کی تصویر
میں ایک کھل مٹل سا پیرچہ تھا۔ پرکاش
عورت سے کافی ملتے جلتے تھے اسی لیے میں
یقیناً پرکاش کی ماں ہو گی اور وہ کھل مٹل پرکاش
تھا۔

میں ابھی یہ سوچ رہی تھی کہ پرکاش
ڈیڈی کس سے داخل ہوئے۔
”وہ چہرہ تو یہاں کیوں آئی؟“ میں نے
”کی۔ یہ پتہ۔“ مجھے نہیں کھونا جا سکتا
لیا۔ قہر۔ دنیا میں برس پیچھے چل جائے
ایا ہو گیا قہر۔ تو غصہ ہو جائے گا۔ غصہ
اس بار مجھے بھانسا دلا سورن کچھ بھی نہیں
”ڈیڈی! کیا ہو گیا ہے جس سے؟“ پرکاش
جھنجھوڑا۔

”ہاں پرکاش۔ یہ پتہ نہ پڑا۔
”یہ لوگ تو ہیں سے اپنا کیا تھا۔“
”میں کس سے ملتے لگے۔ وہ بڑے بے ڈار
ہاتھوں کو مل رہے تھے یوں لگتا تھا تو وہ
نہ ہوں۔“

”ڈیڈی! یہاں بیٹھ جائیے۔ میں آپ
پچھتا چاہتی ہوں۔“ میں نے دیر سے آپ
پر ہاتھ رکھا تو انھوں نے چونک کر میری طرف
”کیا یہاں سے تیرا؟“

”نہیں۔“ میں نے دھچکے لیے میں اب
کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ جہاں سارے
چھیناں بھری ہوئی تھیں۔ ایک عجیب سا رنگ
تھا۔

”وہ زہر بپ بپڑا ہے۔“ شریا۔ قہر تو بالکل وہی
کا تو شریا کی بیٹی ہے۔
”ہاں ڈیڈی! میری ماں کا نام شریا تھا۔ وہی شریا
میں نے انورا کیا تھا اور انورا اب بھی کی قید میں تپ
پر کر رہی۔ آپ اسے کیسے جانتے ہیں یہی پوچھنے کے
پہلے یہاں آئی ہوں۔“

”اے اے وہ کس پر بیٹھ گئے اور دونوں ہاتھوں میں سر قلم
”اب میں آئی کروں! جی گناہ کے۔“ حاس سے بھاگ
”ہاں! کیا قہار کہ کب میرا چھپا کر رہا ہے گاہ میں
کس سے سولی پر لٹکا ہوں! دھتے نہایت۔“ میں ٹھٹھکی
”میں نے خدا سے دعا کر رکھی تھی کہ جھٹکا راولا نہ۔“ وہ
”کیا کیا بول رہے جارہے تھے۔ ان کی آنکھوں کے کنارے
چھلکتے تھے۔“

”میں نے آپ سے کچھ پوچھا تھا ڈیڈی! میں نے
”کیسے ہوئے تھے میں کما۔“ میں جانتا تھا ہوں کہ آپ
”اب یہاں سے کیا تعلق تھا؟“

”وہ! پرکاش۔ پتہ تو مجھے مناف کوئے گانا۔ میں
”اب دیکھ لے گا۔“ میں نے پوچھا۔ لوگوں سے میری سس میں
”کا زہر میرا تھا۔ میں بھول گیا تھا کہ شے میری تھی
”کے انسان ہیں۔“ وہ پرکاش کے سامنے ہاتھ جو ڈکرو
”ڈیڈی! کیا کہہ رہے ہو؟“ اس نے ان کے دونوں

”اب غلام کر لیا۔“ ”میں کیا ہو گیا ہے؟“ تم تو بہت
”بہت مضبوط آدمی تھے۔“

”میں جب میں قہر تو بہت بڑا اور بڑا بڑا آدمی تھا
”پرکاش! نہ ہوتا تو انسانیت کے دشمنوں کے ڈراوے
”ہاں! آجانی جان کے خوف سے ان کے اگلا کات کی
”کی کہیں کہیں۔“ ہمارا وہ ہوتا تو آج تک یہ بات بچھا
”ہاں! پرکاش کہہ کر شریا کو میں نے جان سے مار دیا تھا اس
”کہ اس کی اذیت کم ہو سکتے۔ اس کی عزت ان
”میں نے محفوظ رہ سکے۔ اس نے۔ اس نے کما تھا کہ
”اب وہاں۔“ ہمارا وہ ہوتا تو اسے زندہ اپنے کندھوں پر
”کہ ان کی قید سے نہ نکال لیتا۔“ وہ بلکہ ملک کر دیتے
”تھے۔“

”تہم تم ڈیڈی۔ تم قاتل تھے۔ تمہارا کی ماں کے
”پرکاش! اپنے باپ کے ہاتھوں کو بھٹک کر کھڑا

دنیا کی پاکیزہ ترین اور غیبت ترین دو

چندیں

روایت ہے کہ حضرت لقمان نے اپنے خادم کو
”اب ہماری دی اور کہا۔“ ”اسے ذبح کرو اور اس میں
”پاکیزہ ترین چرن چیرے پاس لے کر آؤ۔“

اس خادم نے ہماری ذبح کر دی اور اس کا دل اور
”ذبان حضرت لقمان کی خدمت میں پیش کر دی۔“

دوسرے روز حضرت لقمان نے اسی خادم کو پھر
”ایک اور ہماری دی اور کہا۔“ ”اسے ذبح کرو اور اس

میں سے غیبت چرن چیرے پاس لاؤ۔“

خادم نے دوسری ہماری بھی ذبح کر دی اور اس کا
”دل اور ذبان حضرت لقمان کی خدمت میں پیش کر
”دی۔“

حضرت لقمان نے سوال کیا۔ ”تم نے دونوں بار
”دل اور ذبان ہی کیوں پیش کیے؟“

”اس پر خادم نے جواب دیا۔“ ”دل اور ذبان جب
”خفاست پر آتے ہیں تو ان دونوں سے زیادہ غیبت چیز
”ہاں! میں نہیں ہوتی اور اگر یہ پاکیزگی اختیار کر لیں
”تو ان دونوں سے زیادہ دنیا میں کوئی چیز پاکیزہ نہیں
”ہوتی۔“

اس واضح مندانہ جواب کو سن کر حضرت لقمان
”نے کہا۔“

”ایسا لگتا ہے کہ تو تو لقمان سے بھی زیادہ دانا ہو
”کیا ہے!“

”مراسلہ۔“ اصغر نظامی۔ سعودی عرب

کر آتی ہیں۔ ذرا سے لس سے چار سو بکھر بکھر جاتی ہیں کبھی خوشبوئیں پر کھینچتی ہیں تو کبھی قوس قزح کی آسمان کی بلندیوں سے لپٹ جاتی ہیں۔

بھابھیاں اسے پھیر رہی تھیں گدگد اہی تھیں۔ ان کے جملے شہد کی طرح کانوں میں رس مگول تھے۔ اس کی چھوٹی ہنسنے کی آنکھوں میں کتنا شرارت آمیز پیار تھا۔ منگنی نہیں تھی یہ پیار کا سنگم تھا۔ چاہت کا اظہار تھا جو دونوں گھرانوں میں شروع سے تھی یہ اس خواہش کی تکمیل تھی جو تیار اور بھابھیاں دلوں میں مدت سے پرورش پا رہی تھی۔

رنگارنگ منٹ کے بعد دونوں بھائیوں چوہدری حشمت اللہ اور چوہدری عظمت اللہ نے ایک ہی جگہ سے گھر بنوائے تھے جہاں زنان خانے اور مردان خانے علاحدہ علاحدہ تھے مگر مردانی دیوار میں دروازے بھی رکھے گئے تھے جو زنان خانے اور مردان خانے میں چلتے تھے۔ رہائشی کمروں کے چیمبروں میں پائیں باغ تھا جہاں ہیری شتوت "امرو اور آم کے بیج پیڑ تھے" مسکے چین کی ٹھنڈی چھایا بھی اور ان پھولوں کے پودے بھی۔ اس باغ کے وسط میں سینٹ کا چوبوترہ بنا ہوا تھا۔ جہاں شام کو دوری بچہ گھر لوں کے افراد خانہ بیٹھ جاتے تھے۔ تایا شمت کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی ان کے بیٹے گھر اپنے بیروں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ بچا عظمت کے پانچ بچے تھے تین بیٹیاں اور دو بیٹے دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کے فرض سے وہ بھی سبک دوش ہو چکے تھے۔ اور آج وہ ایک اور بیٹے کا نام اپنے بڑے بھائی اکوٹی بیٹی زینب منصوب کرتے ہوئے کتے خوش تھے۔

دونوں گھروں سے خوشیوں بھرے قہقہے اُڑ رہے تھے اور زینب کی امی نے تو اشارتاً "یہ بھی کسرا وہ اپنے نعمان کے بڑے ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔ پھر وہ اپنے لیے ایک اور بیٹی لے آئیں گی جو بھابھیاں کی باریک چھوٹی ہنسنے۔

کتے ہی دن خوشیوں کے بے پایاں احساس تلے گزرتے چلے گئے۔۔۔ دونوں گھروں کے رخصت ہو گئے تھے اور اب زینب کا قصور ہی باقی رہ گیا تھا کیونکہ وہ اس سے پردہ کرنے لگی تھی اسے یہ عجیب سا لگتا تھا۔۔۔ کل تک جس کے ساتھ وہ گھنٹوں کیرم کھیل کر آتا تھا جس کی چٹا پکڑ کر کرتا تھا اور وہ بھی جو کھیل میں اس کی ذرا سی بے ایمانی پر اس سے لڑنے لگتی تھی اب کچھ سمجھ نہ سکتی تھی۔۔۔ ایک دن موقع پا کر اس نے پھولوں کے پاس اسے جالیا۔ وہ اپنی کتابیں سینٹی پر لگی گھبراہٹ لگ رہی تھی۔

"اب"

وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور دوپٹے میں اپنا چرو چھپانے لگی۔

"اپنا چھپانا نہیں۔"

وہ خاموش کھڑی کتاب کا کور دیکھتی رہی۔۔۔ اس کی کلیں لرز رہی تھیں۔

"گھر سے تم کترانے کیوں لگی ہو۔ منگنی ہی ہوئی ہے کوئی۔۔۔"

"اگر کروہ تھوڑا سا ہوا۔" چھانچر پھوڑو۔۔۔ آؤ تمہیں امرود توڑ کر دیتا ہوں۔۔۔ چلو آؤ۔"

اس نے پکلیں اٹھا کر دیکھا "وہ امت پیار سے دیکھ رہا تھا۔ سورج کی ڈھونچ کر نوں نے زیب کے اٹھارے مائل بنا دیا تھا وہ قدرت کی اس کاری گری سے بے خبر اپنی آنکھوں میں دھشت سینے کسی کوئی ہرنی کی طرح چوڑیاں بھرنے کے لیے تیار نظر آ رہی تھی۔

"بھاری بھاری سے ڈر رہی ہو کیا۔۔۔ کھا تو نہیں جاؤں گا۔"

"کھا کر تو دیکھیں بڑی سخت چیز ہوں ہضم نہیں ہوں گی۔"

بھابھیاں کی رگ پھڑک اٹھی تھی۔

"تم سخت کہاں سے ہو مجھے تو نہیں لگتی۔" وہ اس کی گرم نگاہوں سے پھیلنے لگی تھی

بھابھیاں نے کھار کی پتا چلے گا کہ تم زیادہ سخت ہو یا میرا معدہ زیادہ مضبوط ہے۔۔۔ اور ہاں تمہیں میرے لیے کی ابھی سے کتنی فکر ہے۔ شایبہ تم میں اچھی خاتون خانہ میرا مطلب ہے شریک جات بننے

راشیم موجود ہیں۔" وہ اپنی ہانک رہا اور زینب نے جو دوڑ لگائی تو کسرے میں ہی آکر دم لیا۔

☆.....☆

پھر ایک دوسرے کے گھروں میں خوب چل پھل رہتی۔۔۔ بھابھیاں اور بھائی بھی پردیس سے لے گئے۔ ان کے قہقہے بچوں کی قہقہاں بھابھیاں کے ذوق برق لباس بت سے چاند جیسے ایک ساتھ ان میں اتر آتے۔

وہ اسے عید کے کپڑوں میں دیکھتا رہ گیا۔ سفید مغللی لباس اس پر کتنا چمک رہا تھا۔ اس نے موقع پا کر فحشو

مالی دیا۔

"یہ روٹی کا بنڈل کدھر سے آیا گھر میں۔"

"خانے سے آیا ہے۔" زینب نے جوابی حملہ کیا تھا۔

"اپنا کوئی گدا رضانہ وغیرہ بھروانا ہے کسی نے۔"

”ہاں بھروانا ہے۔۔۔“

”بہت خوب۔۔۔ روٹی تو اچھی لگ رہی ہے پھر تو خوب گرم اور نرم ساگرا ہوگا۔۔۔ میرا
مجھے چچی جان سے آج ہی بات کر لیتا چاہیے سر میاں بھی آ رہی ہیں مجھے نگرے کے کی ضرورت ہے۔۔۔“

سامنے سے چچی جان آ رہی تھیں وہ رسالہ لے کر اس پہ ایسے جھک گیا جیسے مطالعے میں غور
انگوٹھا دکھائی دیاں سے بھاگ گئی۔

زیب کے ایف اے کے امتحان سر پر تھے وہ تن من فراموش کے پرہیزی میں مگن تھی
چوتھے پر مزے سے ناگئیں پھیلانے کتابیں بکھیرے بیٹھ کر پڑھتی رہتی اور اس کا پائیں
حال ہو جاتا۔۔۔ امی کی نظر پکار جانا چاہتا چچی جان کی کھکا اس کے قدم روک لیتی۔

اور اس دن ہیر کی غصلی سن سے اس کے سر پہ آکر لگی تو اس نے ادھر ادھر دیکھا اور سامنے
کلکی کھڑکیوں سے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ یہ کسی کی شرارت ہے پھر دو تین گھنٹیاں اس
باکیں آکر گریں تو اس نے غم کر دیکھا وہ ہیری کے چوں میں خود کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی
”میں ابھی چچی جان کو جا کر بتاتی ہوں کہ آپ مجھے پڑھنے نہیں دے رہے ہیں۔“

”بہت کیا میرا نام لوگی ان کے سامنے یا کوئی ہونے والے بٹے کے ابا درخت پر چڑھ کر
کر رہے ہیں۔“

تو یہ کسی باتیں تھیں اس کی جسم میں خواہ خواہ چنگاری سی سلگ اٹھی تھی۔

”اچھا آپ کیا سوچنے لگیں۔۔۔ آج آدھیر کھاؤ کی بڑے ٹھٹھے ہیں۔۔۔“

”کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔؟“

”تو کیا۔۔۔ آج کل تیرے میرے پیار کے چرے پر زبان پر سب کو معلوم ہے اور
ہو گئی۔۔۔“

وہ آہستہ سے گنگنا یا۔۔۔ مگر اس نے سن لیا اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ اپنا دونوں پھیلائے کڑی
ہیری بھاڑ رہا تھا۔ سرخ سرخ ہیر کرتے جا رہے تھے۔

بابر نے ایم اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ اور وہ تھوڑا زیر میں چلی گئی۔ زندگی اپنی روتی

رہی۔۔۔ روز بروز منزل کے قریب آنے کی گنگنائیں ہوا میں بکھرتی رہیں۔ شرارت بھرے

دھجی آنچ سی جھوم میں سلگتے رہے۔ آہستہ آہستہ دونوں گھرانوں میں شادیوں کی تیاریاں

ای امی انکی اکلوٹی بیٹی کے لیے دنیا جہان کی چیزیں اکٹھی کر رہی تھیں۔

لے کھینچتے گزرتے جا رہے تھے اور پھر اس کا ایم اے کا رزلٹ بھی آ گیا تھا مگر ابھی اپنے پاؤں
کھڑے ہونے کی آخری منزل باقی تھی۔ اور یہ منزل حاصل کر لیتا کچھ دشوار بھی نہ تھا۔ اس کے

ایک دن کی واقعیت اپروچ اور پھر اس کی ذاتی ذہانت جس پہ اسے اعتماد تھا۔

اس نے سچا کافر ثابت ہوا جس کا کوئی کنارہ نہیں تھا۔ وہ تمام سفر کی طرح کبھی اس سراب کی

رہائی میں اس سراب کی طرف۔ زندگی کی حقیقتیں اس پہ چنے چنے تھیں۔ ڈگری کاغذ کا ٹکڑا اور

اب کو ناسکد بن کر رہ گئی تھی۔ جس کی دنیا کے بازار میں کوئی قیمت نہیں تھی۔ واقعیت اپروچ

مکمل تھی۔ دو سال گزر گئے تھے اور پھر یونی ہر روز بچکے کے سوالوں کا جواب دیتے دیتے اپنے امی

والیہ نظروں کو سستے سستے اور زیب کی خاموشی پر امید نظروں کو دیکھتے دیکھتے ایک سال اور بیت گیا

مکمل بی اے کے لیے ہونے دو سال گزر گئے تھے۔ اس نے نکلیں اور چاروں پہ پھول بھی کاڑھ کر

لے گئے تھے اور باپائی (بابر کی پسند کے کتے ہی سونگر بھی بن ڈالے تھے۔

رنگ آکر ایک اسکول میں نوکری کر لی تھی۔ اب وہ ایک لائق استاد تھا۔ چچی کا گھرانہ اس

میں جانے پہ بہت خفا تھا اور پھر یہ خفگی بڑھتی گئی۔ پہلے دونوں بھائیوں کے درمیان ٹوک جھونک

اس سلسلے میں کل کرتا بن ہوئے لگیں۔

ابھی کوئی مستقبل ہوتا ہے۔ ڈگری کو کس نے چاہا ہے۔ ساری عمر ٹیچر رہنا تو دوسرے درجے کی

رہنے کے مترادف ہے۔“

نے ترقی کی تو کہیں بڑھاپے میں جا کر ہیڈ ماسٹر بن جائے گا اور کیا۔۔۔ نہ بیٹ بھر کر روٹی ملے نہ

خواہشیں پوری کی جاسکیں۔“

کے لیے ہوتا ہی کیا ہے۔ زیب ہماری اکلوٹی بیٹی ہے ہم کس طرح ایک اسکول ٹیچر کے پلے باندھ

اس کا مطلب ہے کہ آپ کو خاندان کی نجابت و شرافت کا کوئی احساس نہیں۔ آپ کو صرف

پیار تھا۔“

ارات و نجابت کے سکے بازار میں نہیں چلے۔ بابر بھی بہت لاڈلا ہے اس سے کہیں کہ وہ یہ نوکری

بھڑک کر کسی اور اچھی نوکری کا بندوبست کرے۔۔۔ ورنہ۔۔۔“

اور یہ باتیں طول کھینچ گئیں پھر محبت کی دُور ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ دُور کا چاہا ہے ایک چھوٹے مگر دوسری طرف کھینچنے والے کو ساتھ لے گرتی ہے۔

آندھی کی طرح یہ بگولا ان درو دیوار سے اٹھا اور اس کی مقلی ٹوٹنے کے اعلان پہ ختم ہو گیا۔ اس کے بنائے ہوئے محبت کے تاج محلِ زمیں پہ ریت کے گھروندوں کی طرح گر گئے۔ دونوں گھروں میں اٹھ کے بیچ چھوٹ چکے تھے۔ دیواریں اونچی کر لی گئیں۔ باغ میں چوڑا توڑ کر دیوار بنا دی گئی۔ ایسا ہی وہ ہے؟ ایسا بھی ہو جاتا ہے کیا اپنے بھی یوں منہ پھیر لیتے ہیں۔ زیب جو اس کی مقلی جس کے ساتھ اس نے مٹی کے گھروندے بھی بنائے تھے اور اپنے آئندہ گھر کے خواب بھی دکھائے تھے۔ کیا وہ بھی دیکھی ہو گی یا دیریں اگر دُور سے کھرچی جاسکتی تو سب ایسا کر لیتے مگر یہ پل پہل پہل پڑھ کر دیکھ کر کچھ یاد آنے والی ہیں جن کے ساتھ چند گزلیوں کا نہیں برسوں کی رفاقت کا حساب تھا وہ کیسے بھولتے۔

دکھ ایک بھاری سلی کی طرح اس کے وجود پہ اُترا تھا۔ ماں اداس تھی۔ بیٹیں غمگین تھیں۔ پیارے شریر بھائی کے لیے مگر وہ خود وہ جو بولساں تھا کرجی کرجی تھا جس کی انا بکھر گئی تھی جس کی دُور کی گئی تھی۔ وہ سب کو ہانسنے کی اسی طرح کو کشل کرنا چاہیے کو غم پہ ہی نہیں۔

”تو نہیں اور سہی“ اور نہیں اور سہی۔ جو ہونا تھا ہو گیا کیا فائدہ غم کرنے سے۔ امی جان۔ اس کو کسی اور نے آنا ہو گا۔۔۔ تبھی اس طرح ہوا ہے نا۔۔۔! وہ اپنی ماں کو تسلی دیتا تو وہ حیرت دیکھتی رہ جاتی ”یہ جھوٹ بولنا اس نے کب سے سیکھا تھا!“

☆.....☆

اور پھر اسے معلوم ہوا کہ زیب کی شادی ایک بہت امیر گھرانے میں طے کر دی گئی ہے۔ اس والا شوہر دو برسوں کا مالک تھا۔ لاکھوں کی آمدنی تھی۔

شادیانے بچ رہے تھے۔ چڑھاواں ہو رہا تھا۔ زندگی کی رگوں سے جیسے لوہنچرنا جا رہا تھا۔ کوئی دھیرے دل مٹلے دے رہا تھا۔ زیب پرانی ہو رہی تھی، ہمیشہ کے لیے۔ نیچے باغ کے درخت اندھ میں بھولوں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ موٹے گلاب اور چنیل کے پودے سب پھر خوشبو پھیلا رہے تھے یا اسے دواغ کرنے کے لیے خوشبوئیں کراڑا جانا چاہتے تھے۔

یہ مک ادا سی بن کر پھیلی جا رہی تھی۔ اب وہ کہاں لے گی؟ کیا یہ آنکھیں اسے دیکھیں گی۔ اس طرح پھرتا ہے۔۔۔ کوئی اس طرح بھی ٹوٹا ہے۔۔۔

آپنی چھت پہ آئیں تو اسے دیکھ کر خشکیں۔ چھت کی منڈیر سے لگا وہ بڑی بڑی آنکھوں سے اس

سے بے نیاز زیب کے گھر کی دیواروں پر پھیلی ہوئی روشنیوں کو نکلے جا رہا تھا۔۔۔

”چلو۔“ وہ اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولیں اور کسی معصوم بچے کی طرح وہ ان کے پیچھے بے اُپاہا آیا۔

☆.....☆

رواں رواں رہتی ہے۔ وہی اس کے تھانے، وہی غم روزگار، وہی بازاروں کی رونق، وہی غم غم، وہی ہما ہی، زندگی اسے ساتھ لے کر چل پڑتی تھی۔ وہ چند سالوں بعد بی ایچ ڈی کا کیا کیا۔ اور جب واپس لوٹا تو وہ یونیورسٹی کا استاد تھا۔

”باوقار، اداس آنکھوں والا ذہین استاد“ اور پھر اس کی شادی ہو گئی۔ ناصرہ بڑی اچھی بیوی۔ زندگی میں ٹھہراؤ آیا تھا۔ زخم مندمل ہو گئے تھے، اگرچہ ان کی ٹیسس اب بھی اتنی ہی جاں

بھرا ایک انقلاب آ گیا تھا۔ تیا حشت کے بیٹے نعمان نے عالیہ کو اپنے لیے پسند کر لیا تھا۔ یہ اُجائے کہاں کس کوئے میں چھپ چھپ کر پروان چڑھ گیا تھا۔ حالانکہ دونوں گھرانوں میں وہ بہت ہی تیز تھی۔

”ماشوق تھی۔ منہ سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ وہ تو اس روز اس بات کا انکشاف ہوا جب اچانک اس نے اپنے والدی شخصیات کو دیکھ کر سب کو ساپ سو گھ گیا۔ بوڑھے ابا حقے کی نے ہاتھ میں لیے اسے مس دیکھتے رہ گئے۔ اماں چاول پختے پختے منہ کو لے بیٹھی کی بیٹی رہ گئیں۔ رمی علیک سلیک

ان پر ان ہو رہے ہوں گے باؤبی، ہمیں یہاں دیکھ کر مگر اب اس ایک واقعے سے ہماری آنے والی زندگی میں ہونا چاہیے۔ یہ ہمارے بچے غریبوں کی طرح ہم سے دور ہو گئے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں انہوں میں صلح ہو جائے۔ کبھی گوشت بھی ناخن سے جدا ہوا ہے۔ اس ایک رشتے کی دُور سے تو ہمیں بندھا تھا کہ وہ رشتہ نہیں رہا تو باقی رشتے بھی نہیں رہے۔ میں تیرا بڑا بھائی ہوں جس کی لڑائی اسکول جاتا تھا جس سے تو اپنی غلطیوں پہ مار بھی کھاتا تھا مگر آج تو مجھے برا بھلا کہنے میں ہلک گیا ہوں، صرف اس لیے کہ خون سے خون کو جدا نہیں رہتا چاہیے مجھ سے اب مزید میری لڑائی کا کیا بھروسہ۔ آج ہم بھی کل نہیں ہوں گے۔۔۔!“

والی سفید چھوٹی سی داڑھی میں آنسو جذب ہو رہے تھے۔ ابا بھی ابھی تک حیرت سے بہت بنے

وہ ہاتھ دھو کر لان میں جانے کے لیے بیڑھیوں سے اتر رہا تھا کہ اچانک مانوس ی آواز نے اس کے دم بکڑ لیے۔
"بہی!"

انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ وہیں بیڑھیوں پر اندھیرے اجالے کے درمیان سفید ساڑھی میں ملیں۔ یہ اسی تھی وہی۔۔۔ اس کی زینب جس کے لیے اس نے نجانے کیا کیا سوچا تھا۔ جسے کتنا چاہتا تھا۔۔۔ اس کی اسی کا پلہ ہوا کہ جھوٹوں سے آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی دیکھیں، ہنسی کی ہلکی بڑی ہنسی سی اور کاہل لگا کر تو وہ اور بھی بڑی لگتی تھیں۔۔۔ اس کے ہونٹوں پر لپ لپ انگلی کتنی اچھی لگ رہی تھی۔۔۔ وہ کسی موتی کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔ گزرتے لمحوں کا کلس اس کے چہرے پر گھر کر گیا تھا۔

یہی وہ ہونٹ تھے۔۔۔ وہی بال۔۔۔ وہی سراپا۔
"کیا تم نے پہچان لیا۔۔۔؟"

"میرے دل کی آنکھیں ابھی بند نہیں ہوئیں زینب۔" اداسی کی لہر نے باہر کے من کو چھو لیا تھا۔
"کیا تمہارا دل اب تک مجھے بھولا نہیں۔"

"کوشش تو بہت کی ہے۔۔۔ بہت کی ہے پر۔۔۔ خیر یہ بتاؤ تم خوش تو ہونا!" باہر نے بڑے ڈوبے سے کہا۔
"ہاں پوچھا۔"

"ہاں بہت۔۔۔"
"لے لے خاموشی سے سرسراے گزر گئے ٹھنڈی ہوا کے جھوٹے زینب کے بالوں کو منتشر کرتے رہے۔
"وہ باغ کی دیوار گردا رہی ہے آپ لوگوں نے۔۔۔" باہر کا لہجہ نوٹ رہا تھا۔

"لیکن ان پر کیا فرق پڑتا ہے جن کے قدم زمین نے بکڑ رکھے ہوں۔۔۔ درختوں کی طرح۔۔۔؟"
"اس کی آواز روح کے سانے میں گونجنے لگی تھی۔۔۔" "ہاں کچھ انسان بھی تو درختوں کی طرح ہوتے ہیں۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"اور درخت تو ہمیشہ اوروں کے لیے ہوتے ہیں۔ ان کے پھل بھی، اور ان کی چھاؤں بھی۔"
"ان درختوں سے جنگا رہا تھا۔۔۔ بہت خوبصورت ہنگامہ تھا۔۔۔ ان دونوں کو وہاں کھڑے کافی دیر لگی۔ پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ پھر اسی اترتے لان کے ہنگاموں میں گم ہو گئے۔



بیٹھے تھے وہ بھی اٹھے اور دونوں بھائیوں نے روتے ہوئے ایک دوسرے کو گلے لگایا۔ تائی جان نے اٹھ کر لگے سے لگایا اور آنسو ساری کدورتوں کو اپنے سیلاب میں بہا کر کہیں دور لے گئے۔ دونوں گھروں میں صلی کی کڑی دراصل نعمان کی محبت تھی جس نے اپنے ہاں باپ کو مجبور کیا تھا کہ وہ جا کر پہلے صلی کی طرف سے پھر عالیہ کو اس کے لیے مانگ لیں۔ اس نے اپنے گھر والوں کو دھکی دی تھی کہ اگر یہ رشتہ نہ ہوا تو ہمیں کس سوہ گایا ہمیشہ کے لیے کہیں دور چلا جائے گا۔

اور پھر چند دنوں بعد تیا شہمت جب دوبارہ ان کے گھر آئے تو حرف نہ مانی ان کے لب پر تھا۔ تیا کے جانے کے بعد انھوں نے اپنی بیگم سلطانہ سے مشورہ کیا تو وہ ہلکی سی کہیں۔
"واہ اپنی دفعہ تو ان کی لاڈلی آنسوؤں کی پری تھی اور ہمارا بیٹا زمین پر گر پڑا آدمی۔"
"دیکھو عابدہ بیگم جو ہونا تھا سو ہو گیا اب گزری باتوں کی خاک آنے والی نسلوں پر مت ڈالو۔ تو اور وہ نوشتہ تقدیر سمجھ کر چپ چاپ سہ لیا ہے اب پرانے زخم گریہ نے سے کیا فائدہ؟"

اور ہاں باپ معصوم گفتگو تھے اور ادھر بائیں باغ میں عالیہ پڑھنے میں مگن تھی کہ ایک کاندہ کی چٹ سے اس کے سر پر آکر لگی۔ اس نے جلدی جلدی اسے کھولا۔ اس کی ٹھکانا تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے عالیہ کہیں تمہارے انی ابو انکار نہ کریں۔ اگر ایسا ہوا تو میں مچاؤں گا (نعمان)۔
"چاہ نہیں کیا ہوئے والا ہے شاید اس گھر کو محبت راس نہیں۔ نعمان! مجھے ابھی اپنے بھائی کا کہنا نہیں بھولا کہ جب وہ ہنستا بھی تھا تو لگتا تھا جیسے درختوں کے منہ کھل گئے ہیں اور اب اس میری عمر اٹھی درود دیوار پر لرزاں ہے جہاں آندھری سے پہلے بھی درود دیوار کو بے قصور ہی جہاں آکر دیا تھا۔ اس دھکے سے سوچا اور کتنا سیتھی اندر بھاگ آئی۔

اور پھر نہ یاد موسم چلی نہ یاد صرصر۔ گھر کے درود دیوار سے خوشی کا نغمہ پھوٹا اور دونوں کی کھال اعلان پر ختم ہوا۔ خزاں کا دور ہمارے ایک جھوٹے سے ختم ہو گیا۔ یہ خیریاہر کے لیے بہت خوش کرانہ حیران کن تھی۔

اور اس دن شادی ہو رہی تھی۔ دونوں گھر سے ہوئے تھے۔ درویشوں، رنگوں اور خوشبوؤں دونوں گھر معطر تھے۔ باہر کی آنکھیں اواپیوں کے تاثر کے باوجود جھک رہی تھیں۔ کوئی خیال بار بار اس سے آکر چپک جاتا تھا۔ وہ محفل میں بیٹھے بیٹھے جیسے تنہا ہو جاتا تھا۔ کوئی کچھ ہوا مانوس سا جھوٹا یاد آتا تھا تو وہ ایک دم اپنے ساتھ بیٹھے بیٹھے شخص سے باتیں کرنے لگتا۔

کھانا کھاتے ہوئے لوگ اپنی اپنی بیٹنیں لیے ادھر ادھر ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔

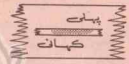
تین عورتیں تین کہانیاں

اُس کی خراب صحت اُس کے لیے وبال بن گئی

ایک ایسی حسین اور معصوم لڑکی کی داستان جسے اُس کی خراب صحت نے تھکایا اور کمر دیا وہ جہان گئی۔ باقیات اس کے تعاقب میں تھک کر اُس نے غم و ملال کا دریا...

فرح شاہانی

شادو



بہت کسات

بہت پال کے اور چند ہر سال کی عمر میں شادو کی وادی آئی۔ اور اس کی ثانی نے اسے گاؤں کے چوٹی میں لپکا کر لیا۔

چودھراں اچھی کورت تھی چند دن قبل کچھ دنوں میں شادو نے محسوس کیا کہ پھوسلے علی کی نظر ہر لمحہ اس کے تعاقب میں تھی ایک دن چودھری نیاز علی نے موقع پا کر شادو کی جانب بڑھا دیا۔

”یہ کیا بھولے چودھری میں ان دوپٹوں کا شادو گھبرا کر پھینچ رہی تھی۔“

”اے رکھ لے یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

بات مان لے تو میں تیری غریب دور کروں گا۔“

”گوں کیا بات؟“ شادو نے حیران ہو کر کہا۔

”آج رات چوٹی کے کچھوڑے آجائے اور دوں گا۔“ نیاز علی نے لپٹائی نظروں سے کھٹکے۔

شادو اگرچہ عمر کی چھوٹی تھی مگر اب اس کی تھی چودھری کی باتوں کا مطلب نہ سمجھتی۔

رات کا دوسرا پہر تھا۔ بڑے گاؤں پر اس وقت خاموشی کا راج تھا، سبھی جھینگے کے بولنے کی آواز سے تھوڑی دیر کے لیے خاموشی ٹوٹ جاتی تھی۔ گاؤں کے تمام لوگ میٹھی ٹنڈو سو رہے تھے کدو آنکھیں ایسی تھیں جو بے خواب تھیں۔ اور اپنے آنے والے کل کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ چاند کی چٹکی روشنی شادو کے خوبصورت چہرے پر پڑ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں چاند بھی شادو کے حسین چہرے کی تاب نہ لا کر بالوں میں چھپ گیا۔

شادو اپنے کمرے ہوئے دونوں کے متعلق سوچنے لگی۔ ابھی ایک سال قبل ہی وہ کسی قدر بے فکر کی زندگی گزار رہی تھی۔ سیمپلن کے ساتھ کھلتا گزرتوں کی شادی رہا تھا۔ پگھٹ پڑی بھڑا اور گھر آکر شہر آگئی ٹنڈو سونا تھا پھر اچانک اس کی تمام خوشیاں غم کے گہرے بادلوں میں چھپ گئیں۔ اس کا بیاہ کر کے والا باپ اس کا سامنا چل بسا۔ شادو اپنی بوڑھی مائی کے ہواہ آئیل رہ گئی۔ چند دنوں تک گاؤں والوں کی ہمدردیاں ساتھ رہیں۔ پھر بس اپنے میں گمن ہو گئے۔ بوڑھی مائی میں اتادم نہ تھا کہ وہ کام کر کے اپنا اور شادو کا



”مائی! میں کل سے چوٹی میں جاؤں گی۔“

”کیوں! اگر چوٹی میں جائے گی تو کھائے کسی کماں“

”پوڑھی مائی کھائے ہوئے ہوں۔“

”تو فکر نہ کر میں چاچا رحمت سے بات کر کے شہر جا کر لاری کیوں گی۔“

”نہ بیٹا نہ میں تجھے شہر جانے نہیں دوں گی، وہاں کے لوگوں سے نہیں ہوتے۔“

”مائی! وہاں کے لوگ چودھری نیاز علی سے بڑے نہیں ہیں۔“ شادو اپنے گورے ہاتھوں کو کیلے دوپٹے سے تھپک کر رہے ہوئے بولی۔ اور دوسری دن شادو نے چاچا رحمت کو تمام بات بتائی۔ رحمت نے شادو کو تسلی دی کہ اگر وہ وقت وہ شادو کو اپنے ہمراہ لے جائے گا وہ چودھری کے بارے میں جانتا تھا کہ اگر اس کی نگاہ کسی لڑکی پر پڑے تو وہ اسے حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ آزما لیتا ہے۔ اسی لیے شادو کی مائی نے رحمت سے بیٹنا چاہتا تھا کہ اس نے شادو کی مائی سے کہا کہ شادو اس کے ساتھ اپنے کسی اور وہاں اس کے ساتھ رہے گی۔

”میں شہر جانے وقت شادو مائی کے گلے کر دوں گی۔“

”اے تم بے فکر رہو! آخر شادو میرے مرحوم دوست کی نشانی ہے میری مٹیوں کے جیسے تو تسلی رکھ چل پڑ شادو لڑکی کا وقت ہو رہا ہے۔“ چاچا رحمت مائی ماں کو تسلی دے کر شادو کو گھر کو رخصت ہو گیا۔

رہل گاؤں پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی شادو تمام راستے چاچا رحمت سے شہر کے متعلق پوچھتی رہی چاچا رحمت اتنا دبا کر جواب دیتے کہ اپنی آنکھوں سے شہر کو دیکھا تو گھر صدمہ مٹی۔ اسے تو پتا بھی نہ تھا کہ دنیا اتنی بڑی ہے اور دنیا میں اتنے بڑے لوگ ہیں۔ وہ تمام راستے آنکھیں میاڑے چاچوں طرف دیکھتی رہی۔

”آجا پڑ اندر آجا۔“ چاچا رحمت کے کہنے پر شادو نے ڈرتے ڈرتے بھولے مکان میں قدم رکھا۔

”یہ کیوں ہے؟“ شادو کو دیکھتے ہی رحمت کی بیوی کیکیڑی بیٹھانی پر بل آگئے۔

”یہ میرے بھائی کی مٹی ہے۔“

سارا بے ہوا رہا۔ ہمارے پاس رہے گی۔“

”کیا؟ ہمارے پاس؟ غضب خدا کا پہلے ہی اتنی مزگانی ہے، اوپر سے چار جوان لڑکیاں گھر پر بیٹھی ہیں اور اب یہ مانجھیں۔“

کر دیے۔ ”کاشف ماں کو دیکھ کر گھبرا گیا اور بیٹی سے اپنی غلطی چھپا گیا۔“

”میں تو کہتی ہوں ضرور اس لڑکی کے لچھن ٹھیک نہیں
اس لیے ان لوگوں نے نکال دیا۔“

"جوتے ہم اتارتے ہیں یا پھر
نہ اتارتے ہیں۔ درپ کے

تعبیر از
بطلان
تعاقد
بی
شخص این است

سمجھتی تھی اور آپ۔۔۔ اس سے آگے شادو سے کچھ نہ کہا گیا۔ وہ روتی ہوئی بنگلے سے باہر آگئی۔

”واہ کیا بات ہے ظالم کی چال ہرنی جیسی ہے۔“ گلی کے کلوپر کھڑا دلور مست لہجے میں بولا۔

”یار ایسی قیامت اور اتنی سی عمر میں۔۔۔ توبہ توبہ بھرپور جوانی میں توبہ کیلئے والا دور ہی سے جل کر بھسم ہو جائے گا۔“ پان والے نے بیڑہ بنا کر دلور کی طرف بڑھایا۔

”ہم تو ابھی سے جل کر بھسم ہو گئے یار۔۔۔ آگ بجھانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“ دلور انگلیوں کو سر سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اے میرے اللہ میں کیا کروں، تو نے یہ خوبصورتی دے کر میرے لیے زندگی کے راستے بند کر دیے۔“ شادو بے ساختہ رو دی۔

ایک مرتبہ پھر رحمت چاچا نے اسے سوسائٹی کے ایک بنگلے میں رکھوا دیا۔ یہ سیٹھ صدیق کا بنگلہ تھا یہاں اس کے ساتھ اس کی بیٹی تالیس سالہ بیوی رابعہ اور بیٹیس سالہ بیٹا انور رہتے تھے۔ انور کا دم شادو کے لیے کاٹنا بن کر کھٹک رہا تھا۔ مگر گھر پر بیٹھ کر چاچی کے طعنے تو اس کے پورے وجود کو چھلنی کر دیتے سواس اس پر کہ شاید قیمت یادوری کر جائے اور یہاں کچھ بھی نہ ہو، وہ سیٹھ صدیق کے بنگلے پر جانے لگی۔

شروع شروع میں رابعہ بیگم کا رویہ شادو کے ساتھ ٹھیک رہا مگر رابعہ بیگم نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ شادو کے سامنے آتے ہی ان کے شوہر سیٹھ صدیق اور بیٹے انور کے چہرے خوشی سے کھل جاتے پھر بیٹے کی حد تک وہ کچھ برداشت کر بھی لیتی۔ مگر سیٹھ صدیق کا گلابی ہوتا چہرہ ان کے لیے خطرے کی گھنٹی بن گیا۔

سیٹھ صدیق پچپن سال کا اچھا خاصا موٹا آدمی تھا۔ اس کا پیٹ باہر کو نکلا ہوا تھا اس کے ہونٹ کالے اور بہت موٹے تھے اور رنگت بھی کالی تھی مگر پیسے کی کمی نہ تھی اور اس مناسبت سے عیاشی ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

شادو سیٹھ صدیق کو اپنے باپ کی جگہ سمجھ کر بھاگ بھاگ کر اس کا کام کیا کرتی اور شادو کے اسی انداز نے سیٹھ کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ دوسری طرف سیٹھ صدیق کا بیٹا انور بھی باپ کے نقش قدم پر چلتا ہوا شادو کے

ارد گرد منڈلانے لگا۔ رابعہ بیگم تو شوہر کی طرف سے پریشان تھیں کہ بیٹی کی حرکتوں پر دھیان بھی نہ دے گا وہ ہر وقت شادو پر کڑی نگاہ رکھتی اور موقع کی تلاش تھیں کہ کوئی بہانہ ملے اور وہ شادی کی چھٹی کر دیں مگر روز گزرنے پر بھی انھیں کوئی بہانہ نہ ملا اور جس بات خدشہ رابعہ بیگم کو تھا وہی ہو گیا۔ سیٹھ صدیق نے اپنی رابعہ بیگم کو صاف بتا دیا کہ وہ شادو سے شادی کرنا چاہتا ہے اگر اسے کوئی اعتراض ہے وہ شادو کو الگ گھر لے کر آئے گا۔ بظاہر تو رابعہ بیگم نے سوچنے کے لیے مہلت مانجی تھی کہ گرما گرمی میں کچھ بھی نہ ہوگا اور شوہر ہاتھ نکل جائے گا۔ وہ کوئی ایسی ترکیب سوچ رہی تھی جس سے مانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ پھر اسے سوچ ہی گئی۔ دوسرے دن رابعہ بیگم نے اپنے دلور زیورات شادو کے کمرے میں رکھ دیے اور صبح ہوئے زیورات چوری ہوئے کا واپلا مچا دیا۔ سیٹھ صدیق پولس طلب کی تلاشی کے دوران زیورات شادو کے کمرے سے ملے۔

پولس شادو کو گرفتار کر کے لے گئی۔ سیٹھ صدیق کو شش کی کہ شادو کی ضمانت کر کے اسے واپس لے آئے مگر رابعہ بیگم نے خود کشی کی دھمکی دے کر شوہر کو قاتل کرادیا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“ جواب میں شادو روتی رہی۔ ”یہ مگر مجھ کے آنسو بہانا بند کرو، میں تم جیسی لاکھوں خوب سمجھتا ہوں، حوالدار اسے لے جا کر بند کر دو۔“ شادو کو ڈانٹ کر دوتا بند کرنے کا حکم دیا مگر جانے اسے لگا جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہو رہا ہو۔ شادو کی صورت آنکھوں سے گرنے والا آنسو کا ہر قطرہ گہرا اس دل پر گر رہا تھا۔ تبھی اس نے اپنا آدمی بھیج کر رابعہ کو بلوایا۔

”نہیں حوالدار! میری شادو چور نہیں ہو سکتی۔ اس الزام لگایا گیا ہے۔“ رحمت نے حوالدار کے آگے اشارہ دے دیا۔

”میں جانتا ہوں چاچا اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس الزام کیوں لگایا گیا ہوگا۔ تم اس کی ضمانت کرالو۔“ ”مگر کیسے حوالدار جی؟“



دوسری کہان

وہ شوہر کے دل میں اتنا شہناج تھا جی اور کہیں سے پڑھ لیا تھا کہ شوہر کے دل میں اتنے کا راستہ اُس کے معدے سے ہو کر جاتا ہے۔ وہ اسی راستے پر

اندھا ڈھنڈو ڈرتی رہی اور...

نامعلوم

بھوک

بیٹھ جاتی۔ ساتھ ساتھ وہ بھر کے حالات و واقعات بھی سناتی رہتی۔ ”بیٹھ کی ساس کا انتقال ہو گیا آج دو دنوں میں یوی کو اطلاع ملی۔ بس بسے گاؤں چلے گئے

”یہ میں بتا دوں گا۔ مگر ایک کام کو“ اسے یہاں سے لے جاؤ۔ وہیں“ اسی گاؤں میں جہاں سے یہ آئی تھی وہنہ چاچا میاں اس کی زندگی اجیروں ہو جائے گی۔“ تھانیدار نے نرم لہجے میں کہا۔

اور رحمت چاچا جو والدہ کو حیرت سے تنک رہا تھا۔ اس نے اتنا نرم تھانیدار زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ ”مگر والدہ رہی! وہ کمانے کی کیسے؟“

”میاں وہ کمانے میں کسی کی چاچا۔ یہ باتیں اسے کمانے ہی نہیں دیں گی۔“

پھر والدہ نے ہی اس کی ضمانت کا بندوبست کر دیا اور رحمت چاچا شادو کو لے کر چلا گیا۔

شادو تمام راستے روٹی دہی اور چاچا کو یقین دلاتی رہی کہ وہ چور نہیں ہے۔

”میں جانتا ہوں چور کو چور نہیں ہے۔ بس چپ کرنا چاہیے۔ سب قسمت کے کھیل ہیں لگی خدانے تجھے دولت ہی دینا تھی تو حسن کی دولت کیوں دے دی۔ دینا یہاں دے دیتا تو یوں ذلیل نہ ہوتی۔“

”میں کیا کروں چاچا۔ یہ میرے بس کی بات تو نہیں۔“ وہ روٹی ہوئی بولی۔

”اب یہاں بیٹھ کر مفت کی روٹیاں توڑے گی؟“ چاچا نے اسے دیکھتے ہوئے ہی سوال کیا۔

”ارے چپ کر جاؤ۔ روزی دینے والا اللہ ہے۔“

”چپ کیوں کر جاؤں۔ میری بیٹیاں اپنی ہی پانی مشکل ہیں۔ اور پھر بیٹھے اپنے کھر کھر کہیں بولائے اس پر تو کلمہ نہ ملتا ہے۔“

”چاچا! خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔“ شادو نے رحمت چاچا کی یوی کیسے کی باتیں نہ سنیں کی اور وہ کمرے میں آکر بیٹھ کر رو دی۔

”یہ خوبصورتی ہی میری دشمن ہے“ اسی کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچی ہوں نا! میں آج اس قصبے کو ختم کروں گی۔“ شادو نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ پھر کانپتے ہاتھوں سے

کوٹے میں بڑی تیزاب کی بوتل اٹھالی۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد شادو کو فخر گراں چھین کرے میں گرہن رہی تھیں۔ مگر کبھی بھی افراد ہمارے ہوئے کمرے میں کھس گئے شادو کمرے کے پتھوں سے بچے ہوئے پڑی تھی۔

وقت

شادی میں ایک شخص بہت دیر
لٹکانا کھانا ہوا۔

لوگوں نے کہا، "آپ بنگ فارم ہوں
گئے؟"

اُس شخص نے سب کو گھوڑو کو روک دیا
پھر عجب سے دعوت نامہ نکالنے پونے

کہا، "کھانے کا وقت بارہ بجے ہے میں بچے
نگ ہے۔"

مرسلہ

سب محبتیں رضا جعفری
کواچی

"زری! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی پھر بھی تم
بادیڑی خانے میں کھجی رہتی ہو، مجھے بتاؤ میں بازار سے
تیار لے آؤں گا پھر مجھے دونوں کے لیے بارہ بجی رکھ لیتے
ہیں۔" شیراز نے اسے پارے سمجھایا۔
"نہیں۔ نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بھلا کھانا بنانے
میں ایک وقت لگا ہے۔ میں خود ہی کر لوں گی۔" وہ اپنی
حکومت میں شراکت کا سن کر ہی ہولناک ہوئی۔ ایسے میں
رشتہ دار میں دو تین بار پھر لگا جاتی۔ اس کی طبیعت
پوچھتی۔

"کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ کچھ بازار سے تو میں منگوانا۔" وہ
بازار جاتے ہوئے بھی پوچھتی جاتی۔ اور وہ اس کی تسکین
کی تعریف شیراز سے کرتے نہ سمجھتی۔

"بہت خیال رکھی ہے رشتہ دار۔ سب سے بڑھ کر
ہے۔" وہ شیراز سے یہیں باری ہوئی بات کو پھر دہرائی۔
جب سے اس کو نواس مینا کا تھا اس رشتہ کی
سیرمیاں چڑھ کر اب کھاؤ مذاہب لگا تھا۔ اس لیے وہ کچھ
پکائی تو شیراز کے خاں کے کرتے کرتے۔ "ذرا رشتہ کے ہاں
دے آؤ۔ مجھ سے تو اتنے نہیں چڑھا جاتا۔"

"سے نہیں۔ تم آرام کو دس ہاں آؤں گا۔ اور ہاں
دہاں سے مجھے دوست کے ہاں بھی جانا ہے ضروری کام

ارباب کر دینے کا شکوہ کرتے۔

اور ہوں ٹھیک۔ میں رینا کو سلا کرتی ہوں۔ خواہ خواہ
اربی ہے۔" وہ جو پیش کرتی۔ رشتہ سے کافی ہے

اچھی۔ جس نے رینا کے اس لیے کہنے کی وجہ
اربی کے بعد میاں سے میرے سہیلی کو بکھڑا کر عادت

اربی میں رشتہ آسان کا فرق تھا اور بقیل رشتہ شایب
اربی کے بغیر اس کے میاں کی زندگی ادھوری تھی

اربی میں بعد ہی ان کی ملاقات ہوئی اور پھر ہاں پکی
اربی۔ میاں باپ کا دو سال لگی ایک کارنے میں

اربی قیاد اکوٹی اولاد ہونے کے ساتھ وہ ان کی تمام
اربی وارثی نمبر ہی۔ اب پچھلے سات سال سے تما

اربی رہی ہیں۔
رشتہ نے اپنے کو معصوف رکھنے کے لیے گھر کے نیچے

اربی بچوں کے لیے ماہی گیری کھول لی۔ رینہ نے بھی
اربی میں کوہن دوہن داخل کر دیا۔ اب جس کو سب رینا

اربی پھر میں رہتی۔
اربی شیراز کے آفریں کی دولت سے فارغ ہو کر اس

اربی بہت مت گری گری محسوس ہو رہی تھی قول
اربی کے رشتہ کے ہاں پکی۔ "کیسی ہو رینہ

اربی گئی ہو۔" کیا بات ہے؟ "رشتہ اس کو
اربی سمجھانے ہوئے پکے۔

اربی آج دن شیراز کے آفریں کی دعوت کی تھی۔ نا
اربی بوجھ تھا اسے آمادہ کر لمبیت میں بڑی کرانی

اربی سوتی ہیں ڈانڈے کے پاس ہو آؤں۔
اربی ہیں۔" اور لگے ڈانڈے کی تھی دیا تھی

اربی ڈانڈے سال بعد کی عادی ہوئی جاتی تھی۔
اربی کی تعداد میں مزید ایک کا اضافہ۔ "تو ہے میں

اربی کے قتل قدم پر چل پڑی ہوں۔ اب کے فارغ ہو
اربی آپریشن کے قصہ پر غم کروں گی۔" اس نے

اربی طے سوچا۔ اماں کے ہاں بچوں کی چھوٹو پکار سے
اربی کے سمجھو جانای پھوڑا تھا۔ میرے عید

اربی کرنے کے لیے آئی اور اب وہ خود اپنے گھر
اربی جانے جا رہی تھی۔ اب دفعہ تو اس کی طبیعت بھی

اربی کے تھکا ہوا ہو رہی تھی۔

"کیوں نہیں۔ ضرور۔ اندر شریف لائیں۔
خوش اخلاقی سے ہوں۔ اس کی ضرورت اس اشیاں

اور لگے دن کھانے پر بھی اس کو اتارے اس
پھر جب وہ لگے دن کے ہاں بھی رہتے اس

وہ لگے کی تعریف کر رہی تھی تو رینہ اپنی
پونے نہ سا رہی تھی۔ شیراز بھی ان کے ساتھ

تھے۔
"میں ہماری بیگہ کا تو یہی کمال ہے۔ ان کے

ہوئی وال بھی نہیں تو ان کا چاہنے رہ جائیں۔
شیراز نے اسے اس کو بچنے ہوئے کہا۔ کہا۔

فارغ ہو کر وہ ڈانڈے ہم میں رشتہ
"رینہ! آپ دن بھر کیا کرتی ہیں؟" رشتہ اس

مخاطب ہوئی تو رینہ سکرانے ہوئے کہتی۔
"کوئی ایک کام ہو تو بتاؤں۔ دن بھر بچوں کو سمجھانا

ہوتا ہے۔ اور دوسرا باورچی خانے سے بھی قریب
ملتی۔ میں تو بن بازار کا بیٹا ہوں۔ سب بھی استعمال

کرتی۔ بات ماسے لار کیا ایک دان اپنے
چھتی ہوں۔ پھر ان کو دھو کر صحت میں کھاتی ہوں۔

خود پیش ہوں۔ کبھی چائے پکی بھی ہوتی ہے۔
شیراز فوراً بولے۔ "اور بھی ان کو باہر کھانا

کو وقت سے پوچھتی ہیں یا ہر کیا کھانا پندہ کو کے
گھر میں اس سے چھاننا ہوں گی۔"

رشتہ سکرانے ہوئے بولے۔ "یہ تو یہی اچھی
کہ ان کے ہاتھ میں آتا ہے۔ بچے بچے تو

معالے میں پائل کو رہی ہوں۔ میرا تو یہی ہے
آئیٹ کھا کر گزارا کر لوں گھر میں زیادہ کھانے کا

نہ کہ پڑے تو خوش ہوں۔ ویسے چھانچا پکایا کھا لیا
تو بڑے شوق سے کھاتی ہوں۔" اور اس کی اس

سب سے سادہ سن پڑے۔
ان کی دو دن بدن ہوتی جا رہی تھی۔ بازار

اٹھے جائیں۔ کبھی سیر و تفریح کا پروگرام ہو تو آؤں
رینہ کچھ بھی پکائی رشتہ کی طرف ضرور

دونوں میاں ہوئی اس کے ہاں چلے جاتے اور غم
کچھ میں وقت گزارتے اور بھی وہ ان

آجانی۔ اور پھر کرم کا بازی ہوتی۔
بچوں کی وجہ سے چھ سچ سے اٹھنا پڑے۔

جب تک گھر نہ لٹا وہ کھانا نہ کھاتی۔ شادی سے لے کر اب
تک اس کا وہی دستور تھا کہ کھانا اکیلے نہ کھاتی۔ شروع

شروع میں تو شیراز بہت سہما وہ نہ کھا۔ "تم کھا لیا کرو۔
میرے انتظار میں کیوں بیٹھی رہتی ہو میں بھل اوقات

معصوف ہوتا ہوں۔ کچھ دیر ہو جائے تو تم بھی بھولی رہتی
ہو۔" مگر اس نے ایک نہ لٹا۔ بھلا جب تک کھانچا کھانچا

فرار نہ میں لے کر وہاں نہ کرے وہ جس طرح کھانچا
اور اب شیراز بھی اس کی نظرت کا جان کو روکتے پھر لٹنے

کی کو شش کر تا۔ ہو کھانچا۔ رینہ نے سانس گرم کیا
اور اسے منہ ہاتھ دھو کر مزین چپکے کو کھا۔ آج اس کے

کوٹوں کے ساتھ رائتہ بنایا تھا اور ساتھ میں ایک پڈنگ
بنائی تھی۔

"چاہے رینہ! ساتھ والا۔" ٹھیک رہا۔ "وہ تو لیے سے
ہاتھ پوچھتا ہوں سیرھا میری طرف آتے ہوئے ہوا۔

"تجھ سے فریاد۔" وہ تجھ میں بولی۔
"چائیں۔ کوئی اکیلی عورت ہے کافی مالدار امانی

لگتی ہے۔ پورے بارہ لاکھ کا کچا ہے یہ گھر۔ کچھ دنوں میں
شاید شفٹ بھی ہو جائے یہاں۔" اس نے رینہ کی

معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
"چھا چھوڑو بھی۔ کھانا کھاؤ۔ دیکھیں گے جو بھی ہو

گی۔" رینہ نے اس کی پیٹ میں سامان نکالتے ہوئے کہا۔
لگنے دن بڑک پھر میرے اس سے گھر کے سامنے

آتے رہے۔ "کافی امیر لگتے ہیں۔" شاندار "بندہ"
ڈرنک تھیل اور مالدار اتارے کچھ کر وہ دن ہی دن

بولی اور پھر کچھ کی طرف دوڑی جہاں وہ مال لال کرے پھوڑ
آتی تھی۔

رات کو وہ بچوں کو بیٹھی کھانا کھا رہی تھی کہ اسے تین
تیل لگی۔ "کون ہو سکتا ہے اس وقت۔" وہ سوچتی ہوئی

اچھی۔ روانہ سے پر ایک پر دار عورت کھڑی تھی۔
کھانا تھاپہ زیادتی ہو کیونکہ اس کے چہرے کی ترو آڈی تو

عمر لڑکیوں کو بھی مات دے رہی تھی۔ ہلکے آسانی رنگ کے
کپڑوں میں لبوس وہ جب ٹھنڈک کا احساس دلا رہی تھی۔

"میرا نام رشتہ ہے۔ میں آپ کے ساتھ والے گھر
میں آئی ہوں۔ اپنی اماں میں کھانا کھا کر اور کھانچا

کی ضرورت تھی۔ سوچا ڈر آپ کو زحمت دہو۔" وہ
سکرانے ہوئے دھکے لیے اس سے مخاطب ہوئی۔

ہے دیر ہو جائے تو کھانا کھا لیتا۔ بھوک نہ بھٹی رہتا۔
محمارے لیے اچھا نہیں ہے۔" وہ بارے کا نیکہ کرتا تو وہ
دیر سے سوکھلا دیتی۔

دوسرے گرمیش دور کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ پہلے کافی
وقتوں سے محسوس ہونے لگی تھی کہ شیراز آجائیں
گے تو ان کے پاس لے چلیں گے مرگاب شام کے سات
ج رہے تھے اور ابھی تک شیراز دفتر سے نہیں آئے تھے۔
آج کل اس کی دفتری مصروفیات بڑھ گئی تھیں اس لیے
اسے اکثر و بیشتر دیر ہو جاتی تھی۔ آج تو کچھ زیادہ دیر لگا
دی۔ اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی جہاں کچھ بچوں کو جلدی
جلد کھانا کھلا کر لانا اور باہر صحن میں لگائی۔ "خدا یا کھانا
رہ گئے شیراز۔" کسی دوست کے ہاں نہ چلے گئے ہوں! اچھا
بھلا جانتے ہیں کہ میں کس حال میں ہوں مگر پھر بھی اتنے
سے پروا کی کر جاتے ہیں۔" وہ ٹیٹ سے باہر بھاگتے ہوئے
مسلحہ پوزیشن پر پہنچا۔

"اب تو سمجھو، معاملہ بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ ذرا
ہمت کر کے رشیدہ کے ہاں جاتی ہوں۔ اسی کو ساتھ لے کر
ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤں گی۔" یہ سوچ کر وہ رشیدہ کے کمر
کی طرف بڑھی۔ "آہا!" دو بیڑیاں چڑھتی ہیں دردی ایک
لہرائی ہوئی جو اسے بے حال کر گئی۔ ذرا دیر لگ کر وہ دردی تو دوبارہ
چڑھنے لگی۔ تین چار بیڑیاں چڑھ کر دم لگتی، دو کی لہریں
سستی دے آخر کار اوپر پہنچ گئی۔ دو دروازے کھلائے۔ سیرنگی اندر
چلی گئی۔ دیوار کا سارے کمرے میں گہری سائیں لیں۔ بیڈ
روم کی لائٹ تھل تھل رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ کمرے کے اس کی
طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی
تھیں۔ "شاید ہی دی دیکھ رہی ہے۔" اس نے سوچا۔
دروازے تک پہنچ کر کئی سانس لی اور دروازہ کھولے تو ہاتھ
پر چھائی ہی تھا کہ چائی پچائی آواز سن کر ٹھٹھکی گئی۔ "یہ تو
شیراز کی آواز ہے۔ یہ اس وقت یہاں۔" اس کے کان
کھڑے ہو گئے۔ ہاں یہ شیراز ہی تو تھا اور ساتھ میں ہنسی کی
آواز رشیدہ کی تھی۔

"اسو" رشقی وار لنگ، چھوٹا۔ کس کا نام لیا
استے سمجھتی لگات ہیں، اسے بھی کوئی تم نہ کر۔ اتنی
بیڑیاں چڑھ کر وہ اوپر آئے۔ یہ دیکھ کر اس کا ہاتھ
شیراز کے طرف مخاطب اس کا دل ڈول گیا۔
"کچھ بھی ہو رازی وزیر کمرے میں کھانا کھا رہا ہے۔"

باقی ہے۔ "رشیدہ کی اٹھلائی ہوئی آواز آئی۔
"ہاں رشقی اس میں کوئی شک نہیں مگر اس
وہ وقت نہیں ہا کہ مرگ کھلا کر لیا ہے وہ نام
ارے یہی سبب ہیں چہا ہو تو قدم قدم پر انوار
دکائیں ہیں جو چاہو سو کھانہ۔ وہ تو شاید
بھٹی ہوئی ہو کر اپنا فرض ادا کر گئی ہے۔ وہ
ہو میں شرابور رہتی ہے۔ اس کے تو پاس جاتے
کھٹی ہو جاتی ہے اور اگر کبھی غلطی سے پاس آتی
طور پر پڑتی تو وہاں کے بیکر میں گویا زندگی بھر
اور پتہ بند کرنا ہے۔ کچھ بچو تمہارا ساتھ
زندگی کو بھی جتنی معقول میں انجوائے نہ کرنا
بھیرے دھجوں کی تھائی کو سمیٹ لیا ہے۔ تمہارا
کا قصور ہے معنی ہے۔ ذرا اس بار ڈر ہے۔
محبت سے چمکارا لے تو اس کو مان کے پاس
جہاں پہلے ہی بچوں کی ٹیکری رہتی ہے۔
اور تم میری طبیعت شناس میری ضروریات کو
جس میں اپنی زندگی میں شامل کر کے میں غل
ہم۔"

وہ بولے جا رہا تھا اور زینہ کے پیروں سے
جاری تھی۔ آج اس کی زندگی کا فتنہ کا نام
وہ جسے راستے پر انوار حیدر ہانک رہی تھی وہ
تک پہنچ جاتے تھے۔ وہ دروازے سے دوڑ کر آ گیا
"کوئی بھوک صرف پیٹ کی نہیں ہے۔
دل تک چھپتے جا راستے میں محسوس ہونے لگے۔
ارے یہاں تو بڑی بھول مہیاں ہیں قدم قدم
کھول کر چٹا پٹا ہے کہ ذرا سی بھول بھی
لگ گئی۔" اس کا من چاہ رہا تھا کہ چٹ چٹ کر دے
وہ جو چھپنے کے لیے اپنے ماتن دھن سب
تھی اسے رشیدہ نے خود میں خوشبودار کپڑوں
بھلوں سے حاصل کر لیا تھا۔



حیرتی کپڑا

ایک عظیم کر بیوی کا لٹا کہ داستان

وہ اپنے پیروں کو اس کے سامنے سے چھینا جا رہی تھی مگر چپاں اس کے منتظر تھیں
ٹوٹ پیوٹ جیلنے والی اس عزت کی کہانی جیتنا اور یہ اس کی

خالد فاضل



پہلے آئی ہے کہ ان کے لیے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے
حد مشکل ہو گیا ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ اس انتخاب میں
میں ان کی مدد کروں۔ اس انکار بھی نہیں کر سکتی۔ میری

اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں شہلا بائی کو کیا مشورہ
دے دوں تو انہیں میں جلتا ہیں ہی، انہوں نے مجھے بھی
انہیں میں جلتا کر دیا ہے۔ زندگی انہیں ایسے دورا ہے

مکان اور مکین

ان ہی دن دنیاؤں میں
اپنے نام کی تختی والی ایک عمارت
نئے دھوکوں کی اینٹیں جن کر گریختی ہے
ہر چہرہ کو دیکھو
میں نے بھی ایک گھر بے بتایا
رنگن پھولوں تعمیروں سے اس کو سجایا
دروازے کی اونچ پائنتا مگھلایا
انہی اس کے ہر کمرے میں چم رہتے ہو



”ہاں۔ وہ دنیا دارک گئے ہوئے ہیں۔“ بائی نے دکھ سے جواب دیا۔
”جی! آپ نے بھی بتایا ہی نہیں۔“
”کیسے بتائی کہ میرا شوہر جیل میں ہے۔“
”جیل میں!“ میں چونک گئی۔ ”وہ دنیا دارک کی جیل میں ہیں؟“
”میں ’خیر آبادی جیل میں ہے۔“
”اچھی تو آپ نے بتایا تھا کہ وہ دنیا دارک گئے ہوئے ہیں۔“
”یہ جھوٹ میں نے اپنی بیٹیوں سے بول رکھا ہے۔ میں انھیں یہ کیسے بتائی کہ ان کے ابو کو چار سال کی سزا ہو گئی اور وہ ایک مجرم کی بیٹیاں ہیں۔ اس طرح وہ سخت احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتیں لہذا میں نے یہ جھوٹ بولا کہ وہ دنیا دارک میں ہیں۔ وہ یہی سمجھتی ہیں کہ ان کا باپ امریکا گیا ہوا ہے۔“
اس افسانے نے مجھ کو ہلکا کر رکھا۔
اس دن انھوں نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں اور بہت کچھ بتایا۔ ”میں اندر ہی اندر فوٹ چھوٹ رہی ہوں فوٹ بڑھ گیا۔“

اس شہلا بائی اس تمام کارروائی کی عادی ہو چکی تھیں بلکہ وہ کرشمہ تین بیروں سے ملاقات کے لیے آ رہی تھیں۔
میں نے کیٹ لگا دیا کہ کارکن کی بجائے سوچنے لگی کہ شہلا بائی نے مجھے اپنے شوہر سرفراز کے جیل جانے کی اطلاع کب سنائی تھی پھر مجھے یاد آیا کہ وہ حالاً اکت ۸۸ کے اوائل میں آئے تھے۔ ہم اکثر چلنی وہیں ایک کمرے تھے اس دن شہلا بائی بہت سنجیدہ اور چپ چاپ تھیں۔ وہ سامنے دو دیوہ میں بیٹھ کر ان کی آنکھیں بائیں ساکت تھیں۔ آنکھیں بالکل خاموش تھیں۔ ہوں تو زندہ آدمی بھی مرہو لگتا ہے میں نے لائونڈری طرف دیکھا۔ ایک آدمی کی نگاہیں شہلا بائی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے انھیں چھیڑا۔ ”کیا دیکھ رہی ہیں بائی؟“
”میں مسئلہ آپ کو دیکھنے جا رہا ہے۔“
”وہ زخمی جسم کے ساتھ بولیں۔“ اپنی آنکھیں پھوڑے گا رہا تھا۔ ”میں نے سرفراز کو گولی جانتے والا ہوں۔“
”وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ کیا کبھی باہر گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

کے لیے بھی لے جاتا تھا۔

چائے کی کرب میں چلنے لگی تو انھوں نے بار بار ”فوزیہ! اکل جتنے پیچے پیچے جانا۔ درمیت کرنا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یاد ہے بائی! میں وقت پر پہنچی ہوں۔“

دوسری صبح میں نے ان کے قلیق کی کال میں ہل چلی۔ بڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ شہلا بائی ٹینو سے بیدار ہو کر نکلیں ملتی دروازہ کھولے آئی تھیں۔ انھوں نے ”سوری فوزیہ! رات گھانا بنائے میں دروہی کی چار بجے تک ٹینو نہ آئی۔“ اچھی سوچوں میں مبتلا رہی کیا کرنا چاہیے؟ ”قرن بے کمرہ چلا۔“
”بھی تو میری کچھ نہیں چاہی! بائی!“ میری موضوع بولنے کے لیے کہا۔ ”اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“
”دروہی ہائی، رات بڑھ چلا گئے۔“
”اب جلدی تیار ہو۔“ بیٹیوں کو بائیں رات اور اچھی صبح کے لیے کہا تھا اور میں انکار نہیں کر سکی تھی حالانکہ ان کے ساتھ جانے میں مجھے ہوریت ہی نہیں ہوتی۔

کام سمیٹنے کے بعد جب ہم گری طرف روانہ ہوئے تو شہلا بائی کی کارٹرک جگہ میں پھنس گئی۔ خدا خدا کر کے وہاں سے نکلے تو بائی نے اس کی بجلی فل کو ان کی کچھ کچھ سات جنے لگے۔ میں اسے پھینک میں جانا چاہتی تھی کہ بائی نے چائے کے لیے روک لیا۔
گھر میں داخل ہوتے ہی ان کی چچیاں ان سے پلٹ گئیں۔ ان کی بڑی بیٹی ذہرا آٹھ سال کی ہے اور بیٹی پانچ سال کی ذہرا نے کہا۔ ”میں بائی کے ابو کو کھانا دیا ہے۔“
”کے آپ سے پوسٹ کروں گی؟“

”ہاں بیٹی۔“ بائی نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا اور فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر منہ سے لگائی شاید انھیں خنک پاس لگ رہی تھی۔
”میں نے بھی ابو کو کھانا دیا ہے۔“ لٹنی نے بتایا۔
”دونوں اپنے اپنے کھانے کھاتے۔“ کل میں انھیں پوسٹ کر دوں گی۔“
دونوں نے کھانا کھانے کو دیا تو انھوں نے اسے اپنے برس میں رکھ لیا۔ ہمارے بائیں خانے میں آگے میں چائے بنانے کی ادائیگی کھانا تر کر گئیں۔ کھانا انھیں اپنے شوہر

میں بھی کچھ نہیں آہا کہ انھیں کیا مشورہ دوں میں ساری بات آپ کو سناؤ دیتی ہو۔ شاید آپ کو بھی ضروری مشورہ دے سکیں۔
شہلا بائی ہمارے بڑوں میں رہتی ہیں۔ وہ انشورنس ایجنٹ ہیں۔ میں نے بھی اپنے لیے بھی پیشگی بک اپ اور انھیں سے قریب لے رہی ہوں۔ ان کے ساتھ ہی دسترخوانی اور وائس آئی ہوں۔ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ کوئی پہلو مجھ سے ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ لوگ ان کے بارے میں جاننے کی کیا کیا باتیں کرتے ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ حقیقی شریف اور حوصلہ مند عورت ہیں۔

برسوں قبل وہ رک کے بعد دفتر واپس آئیں تو شہلا بائی نے جلدی جلدی اپنا کام میٹھا شروع کر دیا۔ پانچ بجے والے تھے۔ گھر پہنچ کر بھی انھیں بہت سے کام سنانا تھے اور کل بعد تھا۔ سینے کا تیسرا جب بعد انھیں اپنے شوہر سے ملاقات کے لیے جانا ہوتا ہے اس مرتبہ انھوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا اور میں انکار نہیں کر سکی تھی حالانکہ ان کے ساتھ جانے میں مجھے ہوریت ہی نہیں ہوتی۔

کام سمیٹنے کے بعد جب ہم گری طرف روانہ ہوئے تو شہلا بائی کی کارٹرک جگہ میں پھنس گئی۔ خدا خدا کر کے وہاں سے نکلے تو بائی نے اس کی بجلی فل کو ان کی کچھ کچھ سات جنے لگے۔ میں اسے پھینک میں جانا چاہتی تھی کہ بائی نے چائے کے لیے روک لیا۔
گھر میں داخل ہوتے ہی ان کی چچیاں ان سے پلٹ گئیں۔ ان کی بڑی بیٹی ذہرا آٹھ سال کی ہے اور بیٹی پانچ سال کی ذہرا نے کہا۔ ”میں بائی کے ابو کو کھانا دیا ہے۔“
”کے آپ سے پوسٹ کروں گی؟“

بکھرتی جا رہی ہوں۔“ وہ کار اشارت کرتے ہوئے بولی تھیں۔

”میں کنی روڈ سے چادری تھکی کر کسی کنی سے کہہ کر
دل کا بیوہ لایا کہ کنی دوسرے شاہیہ میرے داغ کی شریان پھٹ
جائے یا پھر میں پاگل ہو جاؤں۔ ہوا میں نال پلے
پولس کی کاروائی کا میرے کہہ کنی۔ اس کی سہرا سرفراز
کی گرفتاری کا وارنٹ تھا سرفراز اور شگفتہ نے کسی کی
میں مطلوب تھے۔ سرفراز کی مصروفیات کا کوئی علم نہیں
تھا البتہ ضرور جانتی تھی کہ وہ غیر ممالک سے اپورٹ
کیسپورٹ کا کام کرتا ہے۔ ہر حال پولس آئی اور اسے
میں نے تیار سے دونوں پتوں پر سہرے نے تم انھیں چکنا
میں عجیب سمجھا۔“

میں اس وقت نروس ہیست جی اور مجھے کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کھنٹی میں جیسنے نے وارنٹ پر فائلز کو پھینک دیا۔

اور ان پندرہ افراد کے پاس سرفرز اور اس کے ساتھ چلے گئے۔ میں دو روزے پہلے ہی فائلز میں دیکھ رہی۔ سب کچھ ایک جگہ ہی ہو گیا۔ میں اس قدر نروس تھی کہ یہ بھی خیال نہ آیا کہ سرفرز اور اسی کو فون کر دوں یا کم از کم کہیں کہ وہاں دوں۔ بس اس رات بوائے میرے میں بیٹھی ہو سچی۔ معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن سب کچھ بیکار تھا۔

ایک روز اسے پتھری ہو گئی ایک قاتل میں چمک پڑی۔ صبح ہو گئی پہلی پتھری میں مسمرہ دارو اسے موجود ہے۔ ان کے ہاتھ میں آج آغا خاں اخبار کے آخری صفحے پر دو کالم کی خبر تھی۔ چھوٹی سے چھپی جی مسمرہ دارو کی قسم سوچ گئی کہ کیا کلمات ہوتی ہیں وہاں میں بڑی مشکل سے مسمرہ دارو کو روزے سے واپس کیا پھر اخبار والے کا انتظار کیا رہی۔ آج اخبار پڑھ کر اسے نظر سے دور رکھا تھا۔ مسمرہ دارو گھر میں پارکروا اخبار میں ان کی تصویر دیکھ کر وہ جاگنے لگا کیا واقعی افقہ کرتے ہیں اسے بچوں کو کسی نئے طریقے سے اس خبر سے لاعلم رکھنا۔

میری بڑی بیٹی پانچ برس کی تھی اور سرفراز دفتر جانے سے پہلے اسے ضرور پیار کرتے تھے۔ اس لیے مجھے بچی کو سمجھانا بہت دشوار تھا۔ بہر حال جھوٹ بول بول کر میں اپنے

بچوں کو قلعہ دی رہی۔ میں نے انھیں بتایا کہ اگر
کے سلسلے میں اپنا ملک سے باہر چلے جائیں۔
میں سمجھ رہا ہے اس سے بھگت پوانا میں ایک
میں شروع میں اس نے تھیں کہ لین لیکن پڑ
مسئلہ آدراہ میں اس نے وادیوں کے لوگوں کے
میں جلا کرتی رہیں اور وہ پریشان بنے۔ اس
سے دوبارہ پچھا تو میں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ
تک حقیقت سے واقف ہو چکی تھی۔

میں بھی جوں کا توں اپنے اپنی میں کوچ جاتا رہا
ورنہ ممکن ہے اس کے منصوبہ میں میرے
تو رہے اور وہ اس بھگت پر چلتے ہی ہمیشہ بھوتانی
رہے۔ میں نے سرفراز کے ساتھ اپنی زندگی شادی
اور سرفراز ہاں نے مجھ کو اپنے محلہ

کیا تھا۔ یہ خود بھی بیٹھنے کی سانس سے دور رہی۔
اب حالت بدل چکے تھے۔ مجھے اپنی سانس سے
اور معاونت کی ضرورت تھی۔ آغا علی اور اب
ضرورت تھی۔ میں اپنی قاضی کی میری سانس سے
اپنے سے کم تر تھا۔ اور دل سے میری خشیت کی
نہیں کی لیکن مجھے اس وقت اپنی سانس کی ضرورت
میری سانس ایک خوشحال اور امیر خاتون تھیں۔
جانید اور امی کی اور مروٹو شوپر کے ورکشاپ میں
خفیہ رہے۔ یہاں سے خود بخود میری سانس سے میری
میں دوسرے صاف انکار کر دیا اور کہا۔

”ہمیں معلوم نہیں کہ تمہارے شوہر ہیں
کچھ خرچ کیا ہے اس کی پرورش کی ہر طرح خیال رکھا
مجھے تعلیم دلائی لیکن اس نے صرف میرے پیسے
کیے۔ بیشہ عورتوں کے چکر میں رہا۔ پھر تم سے اپنی
سے شادی کر لی۔ اب میں اس کی یا اس کی بیوی
کوئی ذمہ داری قبول نہیں کروں گی۔ ہاں اگر تم
سرفراز کے بچوں کو چھوڑا جائے۔ میں ان کی بہانہ اور
کڑے کا خیال رکھ لوں گی۔“ شملہ باپنی سے پوری رونا

”میرے شوہر کے رشتے داروں کے علاوہ دوستوں
بھی آہستہ آہستہ مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ ہر شخص نے مجھ
جان چھڑانے کی کوشش کی۔ شاید ہر شخص یہ سوچ رہا تھا
سرفراز کی دوستی یا اس سے قربت انھیں بھی سرفراز

لیکھ کر لے گئے۔ کسی نے میرے احساسات کی
کسی نے میری پریشانی جاننے کی کوشش نہ کی۔
حکایت کے لئے بھی میری مدد نہ کی۔ سرفراز کے
نے ضرورت کے وقت اس سے بچا س ہزار
لے گئے۔ تھے میں اس سے بھی مدد نہ کی۔
میں ٹیبل بڑے اعتماد سے اس کے نام ایک پرچہ
دیا تھا۔ وہ بہت دیر ہو کر اس کی قیمت
میں شہر رکتی تھی۔ وہ پورے معروف تھا۔
میں نے فون پر اس سے ملاقات کیا تو اس نے
میں بھی اس کے اخلاق سے مجھے خوش آمدید
دیا۔ سرفراز کی حالت پر اس نے الجھنا کیا
میں نے سرفراز کا خط لے کر اس پرچوں کی
تو اس نے سرفراز کے لئے ضرورت کی

میں فرقا کرنا مقربوں ہوں۔ اس نے کہا۔
اے پیسے کا روادار میں کہے ہوئے ہیں اس نے کہا۔
میں مشکل ہے جو یہ ممکن ہوں جس
کا فون کروں گا۔ پھر اس نے دروازے کے
دروازے پر تھپتھپاؤ۔
میں انتظار کر رہی ہوں کہ آیا تیل فون۔
میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے کا طریقہ سیکھا
صرف دکھاؤ۔ اس نے کہا۔
میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے کا طریقہ سیکھا
میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھنے کا طریقہ سیکھا

ام شروع کر دیا۔ میں زندگی کی قاضی چلا کر
اپنے بھی شہلا بی بی کی ملازمت کرتی تھیں انھوں
الطافہ لافہ جو ان کر لیا۔ زندگی کا تیرہ کرے
دیکھ کر ادا ہوئی تھیں۔
"ہر سہنہ وہ سہنہ بچے لے گا" وہ سہنہ
"ہاں میں ادا کر رہی ہوں" وہ سہنہ
"کاش میں۔۔۔ آہستہ۔۔۔ وہ سہنہ
"اے اللہ! یہ موضوع پر بھی سوچتی رہیں۔
"ان کو اکثر بھیجنا کر لیا۔ کئی محنت آپ کی جان۔
"وہ سہنہ کرتی تھیں۔
"میں بھی انھوں نے تیرہ کر کے تقریباً پچاس ہزار
"میں مسلسل محنت نے ان کی محنت جاوا کر
"میں

جب ان کے شوہر کو گرفتار کیا گیا تھا، تو اس کا سب سے بڑا مسئلہ، میسج کی کمی کا غذاب تھا۔ انھوں نے مکان فروخت کر دیا ہمارے پردوس میں ایک چھوٹا فلیٹ خرید لیا تاکہ بچوں کی تعلیم اور عدالتی خرچے پورے ہو سکیں۔ ایک بار انھوں نے مجھے بتایا۔

”ایک شب میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں ایک
کلائنٹ سے مل کر رات گزارنے کے بعد لوٹ رہی تھی۔ میں
کسی سوچ میں مبتلا تھی مجھے اپنے گھر کا راستہ بھی یاد نہ رہا۔
کھلی سڑک پر اپنی کار دوڑاتی رہی آگے اور آگے نہ
معلوم کہاں، مجھے خود بھی یہ معلوم تھا کہ کہاں جا رہی
ہوں۔ بس یہ بتا رہی تھی، ”میں یہاں، بس چند گھنٹوں کے لیے
میراثہ کے صفات سارا رہ گئے تھے۔“

پھر میں ایک گھر کے سامنے رک ٹھہری۔ کاتے کا اڑکھڑکے کے دروازے پر آئی اور دروازے کے تالے میں کبھی لٹکانی لٹکین وہ گھوم گھومیں رہی تھیں۔ میں نے پورا روز لگایا۔ ایک چمک بلب روشن ہو کر دوڑنی کے ساتھ ہی میں ہوش میں آئی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے چمکے ہوئے گھر کا دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چونکہ میں کسی اور کی ملکیت ہے۔ میں دوڑتی ہوئی واپس کار میں سوار ہوئی اور کارپوریس قمار سے دوڑاڑی۔ میں نے آئینے میں دیکھا، چند لوگ دروازہ کھول کر باہر لپکتے رہے ہیں اور شور مچا رہے ہیں۔ اس جب میں بستر پر بیٹھی تو آواز آئے کہ میں اپنی صلاحیت سے زیادہ محنت کر رہی ہوں اور میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں۔

اگلے روز میں نے دوپہنے کے لیے شہر سے باہر جانے کا پروگرام بنایا اور بچوں کے ساتھ مری بیٹی کی دوپہنی عمل پختیٰ نے مجھے دوبارہ فریخ کر دیا اور میں کام پر لوٹ آئی۔

میں نہ جانے کب تک انھی کے بارے میں سوچتی رہی کہ اچانک میری نظر سامنے جا پڑی۔ شملہا جانی جیل سے نکل کر کار کی طرف آ رہی تھیں۔

اوہ! میں نہ جانے کہاں کبھی بھی وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو سکا۔ میں ان کے ساتھ شملہا جانی کے کماؤ اور حال کی بحوالہ نکال رہی تھی۔

”سرفراز صاحب کیسے ہیں؟“ میں نے دریافت کیا۔
 ”بہت بہتر!“ انھوں نے جواب دیا۔

211

”بہتر“ سے میں سمجھ گئی تھی کہ صرف تسلی دینا مقصود تھا۔

گواہ شہلا بانی کو مالی پریشانی بالکل نہیں تھی مگر عورت کا وجود صرف مالی مدد سے ہی آلودہ نہیں ہو سکتا۔ سرفرازی کی انھیں پیشہ ادھر اور راحت تھی۔ رشتہ دار انھیں کچھ نہیں کہتے ہیں۔ لوگ ان کے سامنے کوئی بات نہیں کر سکتے۔ ان کے والد انھیں احترام سے شوہر سے ملنے دیتے ہیں لیکن بانی جانتی ہیں کہ رشتہ دار کتنے پیچھے کسی سببی یا سبب مانتے ہیں۔ دوست احباب ان کے شوہر پر بھرم سمجھتے ہیں۔

شہلا بانی کی سب سے بڑی پریشانی ان کی دونوں بچیاں ہیں۔ سب سے بڑی بیٹی دارہ کی اور ان کے شوہر میں بیات کا شکی ہے کہ وہ بھرم کی بیٹیاں ہیں یا ان کا باپ جیل میں رہ چکا ہے تو وہ کیا سوچتی ہیں۔ ان کے کھراور خاندان کا کیا ہو گا؟ ان کی انتھک محنت اس غالی کو کیسے چھپائے گی؟

شہلا بانی بظاہر ہر وقت مطمئن رہتی ہیں۔ خوش و خرم اور مسکراتی ہوئی لیکن اندر اندر وہ دلچسپی جاری ہیں۔ نوٹ لہت کر بھرم رہی ہیں۔ دیکھی اور رنجیدہ۔

بہم واپس کے لیے روانہ ہو سکے۔ کافی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولیں۔ ”اب تو میں اپنے آپ کو بھی قیدی ہی سمجھتی ہوں فوزیہ! شوہر کی کمی اور بچوں کا بے باپ گھر پر رہنا زمانے سے بچاؤ کر چنانا اپنے سامنے سے بھی دور لگتا ہے۔ میں نہیں سے باہر بھی قیدی ہوں“ ٹھیکری قیدی، ”اطلاقی خوف کی قیدی۔“ پھر وہ دو بڑوں اور دو تکیہ دوئی رہیں۔

میں واحد دوست تھی جس کے سامنے وہ اپنا دل کھول دیتی تھی۔

تھا۔

اس تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ بہر اپنی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔

اب شہلا بانی قدر سے پر سکون تھیں۔ جیل جاتے ہوئے کاری و رفتار میں جو تیزی اور دل کے وجود میں جو اصلائی کاؤ تھا وہ ان میں تھا۔ میں بھی خاموشی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ دوپہر داخل کر شام کا روپ دھار رہی تھی۔

”سرفراز سے ملاقات!“ انھوں نے اچانک کہا اور ان کی طرف منسوب ہو گئی۔ ”میرا ایک فرض ہے۔“

پورا کر رہی ہیں۔ میں وہاں پہنچنے کی جلدی تھی تاکہ فرض پورا ہو سکے۔ اب وہ فرض ادا ہو گیا۔ میں اسے ضرور اپنی دنیا کی طرف جا رہی ہوں۔ اپنی دنیا میں، اچھی ملاقات

تک“ وہ قہقہہ مار کر نہیں۔ میں توجہ دینے لگی۔

”سرفرازی سزا میں ابھی ایک برس باقی معلوم میرا مستقبل کیا ہو گا؟ جب سرفراز جیل کے تو میں اپنی بات سے کھل کر دوبارہ ان کی بات کی یا نہیں؟ یا پھر صرف فرض پورا کر سکوں گی؟“ انھوں نے غصہ سے آواز دیا۔

دونوں کی امانت ہیں۔ ہم سب ساتھ رہیں۔ اپنے بچوں کو بھر جاپ کے ساتھ نہ رکھیں۔ دیر۔ زندگی کا مذاق بھی خوب ہے۔

ہے۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ بچے ہم کو کائنات میں جہن میں بچوں کو سرفراز سے دور ہوں۔ شاید میں بچوں اور سرفراز میں سے کسی ایک کو بچے شوہر دو کہ میں کیا کروں۔“

”میں اس سلسلے میں کاغذ دوسے کسی کوں“ ”تو مجھ کو فیصلہ نہیں دینی طور پر اتنا الجھتی ہوں قوت فیصلہ ختم ہو چکی ہے۔ تم میری واحد امید میں اعتماد کر سکتی ہوں۔ میں دیکھوں گی کہ میں کون کی ملاقات میں مجھے سرفراز کو اس فیصلے سے آزاد جلدی کر ہو سکے مجھے شوہر دے دینا۔“

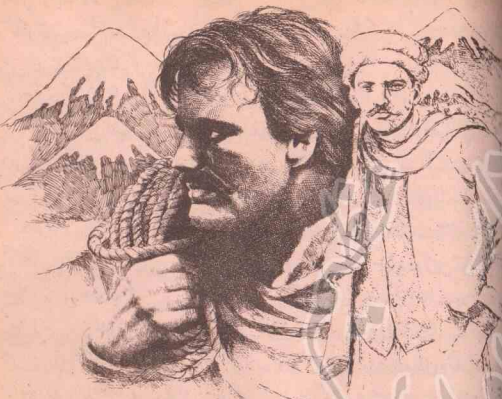
”میں خاموش ہو گئی کہ انکار کر کے ان کا دل چاہتی تھی۔

کاراب شہر میں داخل ہو چکی تھی۔

تھا۔

اس بات کو تمہیں ہتھے مگر پکے ہیں اور میں نہیں کہ بانی کہ شہلا بانی کو کیا شوہر دوں؟

سلسلے میں سوچتی ہوں میرے ذہن میں یک طرفہ افکار ہے۔ افسانہ خاں خاں خاں کا شوہر شہلا بانی کی سواہوں کا شوہر، ان کی لٹی بی بی آرزوؤں اور نگاہ کا شوہر، ماضی اور مستقبل کے تضاد کا شوہر، اب تاکہ میں شہلا بانی کو کیا شوہر دوں؟



انتہی

کبھی کبھی انسان اپنے ہی ہتھیار سے خود ہی تیرا کر کھاتا ہے ایک ایسے عیب آدہ کہ کبھی کبھی جیسا ہے طور پر دیکھیں کہ کتنا بیکار نہیں؟ جھگڑا کر رہتے تو کبھی بے ایک پناہ کھانا



محمّد تقی

میں اپنے شاندار ایر کنڈیشنڈ آفس میں بیٹھا ہوا تھا آفس کے باہر ایک طویل راہداری تھی آفس کے باہر بھی ایر کنڈیشنڈ تھی۔ پوری راہداری میں میالے رنگ کے نرم قالین بچھے ہوئے تھے۔ آفس کے دونوں طرف کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر بیٹھے ہوئے وہ لوگ اپنی باری کے منتظر تھے کسی کام کی غرض سے سیٹھ سے ملاقات مقصود تھی۔ جتاگیر بھی ایک کرسی پر بیٹھا اپنی باری کا منتظر اور سب اس کی باری آتی تو آفس کے دروازے پر متعین چہرے ای سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اندر

"زبان خان کو بلا کر لاؤ۔ وہ جو مال کھاتے میں دیور ہے۔"

"بہت اچھا صاحب۔"

وہ بہت بڑا سیٹھ تھا۔ اس کا نیوا رک میں ایک شاہک سینئر ابو ہنسی میں ایک اعلیٰ درجے کا رستوران، اس کی لنگ میں ایک سینما ہاؤس اور پاکستان میں ایک ٹیکسٹائل مل تھا جس کے آفس میں وہ اس وقت بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی دو بیویاں، تین بیٹے چار بیٹیاں اور متعدد وراثتیں تھیں۔ اس کی عمر اسی سال کے لگ بھگ ہوئی مگر چہرے سے ابھی وہ جوان ہی نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخی لگتا تھا کہ زرد چہرے والے مزدور اس کا سارا خون اس کے چہرے میں سمٹ آیا ہے۔

اس کا دروازہ کھلا اور زبان سامنے آکر ہوا گیا اس نے زبان پر نظر ڈالی۔ وہ اٹش میں برس کا زبان لڑکا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش نیچے اور دلکش تھے۔ سر کے بال سہرے اور رنگ گورا تھا کی آنکھوں سے ذہانت جماعت کی دکھائی دیتی تھی۔

"تم کدھر کے رہنے والے ہو؟" سیٹھ نے اپنے مخصوص ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"میں سوات کا رہنے والا ہوں جناب۔"

زبان آدھ بہت خوبصورت جگہ ہے مگر نہ کہ..... تمہارے خیالات بہت گندے ہیں۔

"نہ نہ!" وہ حیرت سے سیٹھ کا منہ دیکھنے لگا۔ "کس نے کہا ہے کہ گندے ہیں جس نے بھی کہا وہ خود کی ذہانت کا ہو گا میں بہت سچے خیالات کا آدمی ہوں اور سچے خیالات گندے نہیں ہوتے جناب۔"

"ہوں۔" سیٹھ اس کی ذہین آنکھوں میں اپنی مکار آنکھیں ڈال کر سوچنے لگا اور پھر بولا۔

"تم نے میرا بنگہ دیکھا ہے؟"

"نہں جناب۔"

"اٹش سوسائٹی دیکھی ہے؟"

"ان جناب وہ دیکھی ہے۔"

"اچھا چھوٹی لوکارو!" اس نے میز کی دراز سے کارڈ نکال کر زبان کو دیتے ہوئے کہا "آج شام چھٹی کے بعد وہاں بیٹھ کر آ جاؤ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

زبان نے سوچتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے جناب میں آ جاؤں گا۔" وہ واپس مڑا اور آفس سے باہر نکل گیا۔ اس کے طرف جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کون سی ایسی ضروری باتیں ہیں جو سیٹھ اس سے اپنے بیٹھنے پر کرنا چاہتا ہے کھاتے میں پینچا تو اس کے جوڑی دار اور کھاتے میں موجود دیگر مزدوروں

داخل ہو گیا۔ سیٹھ ریو لوگ چیز کو دھیرے دھیرے دائیں بائیں گھماتا ہوا ٹیلی فون پر کسی سے گفتگو تھا۔ بات ختم ہونے پر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور جمائیکیر کی طرف متوجہ ہوا جو باغ کے سامنے کھڑا تھا۔

"کو جمائیکیر خان؟"

"جناب۔ میں حضور کو یہ بتانے حاضر ہوا تھا کہ زبان آج کل بہت آگے جا رہا ہے وہ کئی مزدوروں کو اٹھا کر کے بیٹھ جاتا ہے اور انھیں نہ جانے کیا کیا سکھاتا رہتا ہے۔ آپ اسے روکیں۔ بہت آگے نکل جائے گا۔" جمائیکیر نے اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔

"تم کمرت کرو جمائیکیر خان۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔۔۔۔۔ ویسے وہ کتنا کیا ہے؟"

"وہ نیا بھری باتیں کرتا ہے سیٹھ صاحب۔ بوتا ہے دیکھو مزدور دوستو! یہ جو میں آج کل کما رہا ہے یہ ہماری صحت کا دشمن ہے۔ کبھی بوتا ہے۔ اس بار علیہ پر ہمیں جو کچھ ملا ہے وہ دیکھنے والا مقابلے میں ہٹ گیا تھا اور اس بار ہم کو فائبرس بھی کم ملا ہے۔ کبھی بوتا ہے کہ کپلے اور کرنے والوں کو کینٹین سے چائے فری ملتی تھی اب کیوں نہیں ملتی۔ اور پھر وہ یہ بھی بوتا ہے کہ اپنی حقوں کو منظم رکھو دوستو! اپنا اتحاد بکھرنے نہ دینا۔ کینٹین ہی میں جیتیں سیٹھ صاحب۔ ان کے ڈیرے پر بھی جا کر بیٹھنے کے ہیں۔ وہ مل میں انتشار پھیلا رہا ہے مزدوروں میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔"

"ہوں۔" سیٹھ سر جھکا کر سوچنے لگا چند ثانیے گزرنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"وہ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟"

"ہاں سیٹھ صاحب اس نے دس جماعتیں پاس کی ہوئی ہیں۔"

"بس۔" سیٹھ نے ٹھیک آئیز قہقہہ لگایا "بس دس جماعت اور اتنی اونچی اڑان۔"

"اس کا داغ خراب ہو گیا ہے سیٹھ صاحب اگر آپ نے اس کو قابو میں نہیں کیا تو آپ نقصان پہنچانے لگا۔ بتانا میرا فرض تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ ہم اپنا کام جانتے ہیں تم جانتے ہو۔" سیٹھ نے جواب دیا اور جمائیکیر لالے قدموں پر آہستہ پیچھے ہٹتا ہوا آفس سے باہر نکل گیا۔

جمائیکیر کے جانے کے بعد سیٹھ نے فرش پر گہے ہوئے ٹھن کو دبایا تو فوراً "چرا سی حاضر ہوں"

صاحب

نے اس سے اشارے سے پوچھا کیا بات تھی۔ چہرہ اسی کیوں بلا کر گیا تھا لومڑی کھٹ کھٹ
شور تھا کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی اس نے بھی جواباً انھیں اشارے سے سمجھا
چھٹی کے بعد بتائے کا شام چار بجے چھٹی کی گھنٹی بجنے پر وہ گیٹ سے باہر نکلا تو اس کے ساتھیوں
گھیر لیا۔

”میں ہاشم کے بیٹکلے پر جا رہا ہوں تو انھیں آگاہ کرتے ہوئے بولا ”اس نے مجھے وہاں بلایا ہے۔“

”کیوں۔“ اس کے ایک ساتھی نے پوچھا۔

”کہتے تھے مجھ سے ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

وہ سب حیرت اور تشویش میں مبتلا ہو گئے اور زبان کو تکیا ”خبرہ کرتے ہوئے بولے۔

”خیال سے زبان۔“

”وہ سیٹھ سے زبان۔“

”تم فکر مت کرو ساتھیوں! میں کوئی بچہ نہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں صبح جب دہلیز پر آؤں گا تو
گاہک کیا بات ہوئی۔ ”فرار“ فرار“ اپنے تمام ساتھیوں سے ہاتھ ملا کر وہ بس اسٹاپ کی جانب چلا رہا
سوسائٹی پر اتر کر اس نے اپنی قمیص کی جب سے کارڈ نکالا کہ کسی آتے جاتے سے پتا پوچھ لے کر
کوئی بھی آتا جاتا نظر نہیں آیا۔ آج تو بہت لوگ رہے تھے مگر وہ سب کاروں میں سوار تھے وہ جگہ
ایسی تھی ایک شخص پیدل جاتے ہوئے ملا بھی مگر وہ بے چارہ ان پر نہ تھا زبان بھگول کے دروازوں
نیم چلیں پھٹا ادھر ادھر بھٹکا رہا آخر کافی دیر بعد سامنے سے ایک اسکوٹر سوار آتا دکھائی دیا تو اس
بھٹ ہاتھ دے کر اسے رکھنے کا اشارہ کیا اسکوٹر سوار تو اس نے فرار“ اس کے سامنے کارڈ
اسکوٹر سوار نے اسے پتہ سمجھایا اور چلا گیا۔ وہ اب با آسانی کے سمجھائے ہوئے پتے پر پہنچ گیا
پر لگی ہوئی نیم چلیٹ سے پتہ ملایا ایڈریس وہی تھا اس نے گیٹ کھٹکھٹا پر کوئی جواب نہ آیا۔ گیٹ
دیا تو وہ کھٹا چلا گیا اس نے جھانک کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ متعجب سا کھڑا
کہ اب کیا کرے۔ اچانک اس کی نگاہ کالی تیل پر جا پڑی۔ اس نے گھنٹی کے بین پر انگلی رکھ دی۔ اور
وقت کے بعد سیٹھ بذات خود عمارت سے باہر آیا اور زبان کو دیکھ کر مسکراتا ہوا بولا۔

”سوری زبان۔ میرا چکیدار اپنے عزیز کو اسٹیشن چھوڑنے کے لیے تھوڑی دیر کی چھٹی
آؤ آؤ اندر آؤ۔“ زبان اندر چلا گیا۔

دسویں ڈرائیگ دوم بڑی خوب صورتی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ ایک جانب چھوٹا سا بار کاؤنٹر بھی

نے بولے پوچھا۔

”تمہاری تعلیم؟“

”نہیں۔“ زبان نے جواب دیا۔

”تو بہت کم ہے۔“ سیٹھ نے سامنے رکھا گلاس اٹھا کر وہسکی کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

”اب جناب۔ بہت کم ہے کیوں کہ تعلیم کی کوئی حد نہیں۔“

”میں کل کتنے افراد ہیں؟“

”افراد صرف دو ہی ہیں جناب ایک میں ایک مجھ سے چھوٹی بہن والدہ ہمارے بچپن میں ہی فوت ہو گئی
ایک سال قبل والدہ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ اب میں ہوں اور صرف میری بہن میں اسے وہیں
میں اپنے چاچا کے گھر چھوڑ کر یہاں توکری کرنے آیا ہوں میرا خیال تھا مجھے کہیں کلرک وغیرہ کی
لہجے کی ٹکریاں آکر معلوم ہو کہ میرے پاس تو یہاں چہرہ اسی ہوتے ہیں کچھ دن اسی ناگام جدوجہد
میں آپ کے ل میں بحیثیت مزدور بھرتی ہو گیا مگر میں اس مزدوری پر شرمندہ نہیں ہوں جناب
کہ محنت میں عظمت ہے۔ ہمارے بچے نے بھی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے کمریوں تک
میں اور بچ پوچھتے تو مجھے اپنی اس محنت کے بعد جو روکھی سوکھی میسر آتی ہے اسے کھاتے ہوئے
خوش ہوتی ہے اور پھر آپ کے ل میں مجھے بہت سے اچھے لوگوں سے واسطہ پڑا میں ان کے
ان اپنے آپ کو قطعاً ”اجنبی محسوس نہیں کرتا وہ سب کے سب مجھے اپنے لگتے ہیں۔ ہم سب ایک
ایک ہی زنجیر سے بندھے ہوئے۔ مصائب اور مشکلات کی زنجیر۔“

”میں یہاں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟“ سیٹھ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

”اب ایک سال ہوا ہے جناب۔“

”اب اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے اپنی بہن کو کچھ پڑھایا لکھایا ہے؟“

”میں جناب۔ وہاں ہماری وادی کے لوگ لڑکپن کو اسکول کی تعلیم دینا کچھ اچھا نہیں سمجھتے۔ ہاں

اس نے دینی تعلیم حاصل کی ہوئی ہے۔“

”میں اپنی بہن سے بہت پیار ہوگا۔“

"یہ کوئی پوچھنے والی بات تو نہیں ہے جناب بھائیوں کو اپنی بہنوں سے بہت پیار ہوتا ہے۔"
 سیٹھ نے میز پر ہوا غیر ملکی سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں ڈالی اور
 زبان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ لو سگریٹ پیو۔"
 "تھینک یو سر۔" زبان نے اس کی اس نوازش کا انگریزی میں شکریہ ادا کیا۔ "میں نے سگریٹ
 ابھی تک نہیں سیکھی۔"
 "تو آج سیکھ لو۔"

"میں جناب میں سیکھنا نہیں چاہتا یہ کوئی اچھی چیز نہیں فصول خرچ بھی ہے اور مضرت بھی
 "ہوں۔ میں نے دراصل تمہیں یوں بلایا تھا زبان خان میں نے تمہاری شکایت سنی تھی۔"
 "کیسی شکایت جناب۔"
 "یہ کہ تم مل کے مزدوروں میں انتشار پھیلا رہے ہو انہیں مشتعل کر رہے ہو باغی بنا رہے ہو۔"
 "میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں جناب۔ میں جانتا تھا کہ آپ مجھ سے یہی بات کریں گے کہ
 کا یہ الزام سراسر غلط ہے۔"

"غلط اور ٹھیک کی بحث میں نہ پڑو زبان۔ میں تمہیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ تم یہ باتیں کرنا
 ورنہ۔۔۔۔۔"

"ورنہ کیا جناب؟"
 "مناجج اچھے نہ ہوں گے۔"
 "مناجج تو اس کے بہت اچھے نکلے چاہیں جناب مگر ابھی وقت نہیں آیا۔"
 "تو تم میرے مزدوروں کو ہرکانے سے باز نہیں آؤ گے۔"

"آپ کے مزدور۔" زبان خان نے زہریلے انداز کے ساتھ بات جاری رکھی۔ "گر وہ آپ کے
 ہوتے تو آپ جیسے محل نما بیگنے میں نہ سہی کچے مکانات میں تو رہتے گندے جھوپڑوں میں نہیں
 طرح عمر کھانے نہ سہی مگر بیٹ بھر کر تو کھاتے۔ وہ آپ کے مزدور نہیں میرے مزدور
 صاحب۔"

"یو۔ شٹ اپ۔۔۔۔۔" ہاشم غصے سے اپنی دونوں مٹھیاں پیچھے ہٹے ہوئے بولا۔ "تم۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ اس
 نہیں آؤ گے۔" اور پھر اس قدر غصے کے پادجو اٹھ کر ٹھٹلے لگا۔ اس نے اس سلسلے میں کافی
 کر رکھی تھی اگر وہ چاہتا تو زبان کو کسی بھی الزام میں سادوں جیل کی کو غری میں سزا دے سکتا تھا مگر

اس کے مل کے مزدور جان لینے کہ زبان کس جرم کی پاداش میں جیل گیا ہے، وہ بھر جاتے اس لیے
 وہ انوکھی اسکیم بنائی تھی جن پر عمل کرنے کا وقت قریب گیا تھا۔ اس نے ایک نظر اپنے خوشخوار
 الی اور زبان کی طرف انگلی سے اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"میں تمہیں شوٹ کروں گا۔"
 "اس جرم میں جناب؟"

"اس جرم میں جرم چھتا ہے۔ ذیل پینچ۔"

سیٹھ کا ایشیون کتا زبان کی طرف منہ کر کے
 اس نے کتے کی جسامت دیکھی سیٹھ اور بیت ناک کی بڑی ہی تھوکتی سے نوکیلے دانت
 اب رہے تھے۔ زبان کے بدن میں بھر بھری آگئی مرد دوسرے ہی لمحے اسے سیٹھ کی دی ہوئی گالی
 اور فہم بھر خود کر آیا۔

انہما کے مزدور رہنے دو۔ پھان مت بنے دو ہم یہاں مزدوروں کی بات کرنے آیا ہے ورنہ
 اس کی قسم گالی زندگی بھر ہم نے کسی کا نہیں سنا۔"

اس کی طرف منہ کر کے مسلسل غرائے چلا جا رہا تھا سیٹھ نے پھر کتے پر نظر ڈالی جو اس کی اسکیم کا
 اب روار تھا جس سے وہ حسب مشاکم لینے کے بعد مزدوروں اور قانون دونوں کی نگاہوں سے بچ سکتا

تھا۔ انہما ایسا بندوبست کروں گا کہ تم میرے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکو گے میں صاف بیچ جاؤں
 میرے سے غرایا۔

اس کی قہقہہ نہیں ہو گا سیٹھ لیکن تم کب تک بچے گا۔" زبان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں
 مارنے لگا۔

سیٹھ نے اسے مشغل کرنے کے لیے ماں کی گالی بک دی۔
 پہلے ہی غصے میں بھرا ہوا تھا اس کی گالی سن کر شاہین کی طرح اس پر بھپٹا سیٹھ نے کتے کو
 طرف اشارہ کیا غرائے ہوا کتا لپکا اور اس نے زبان کی ٹانگ اپنے دانتوں میں ڈال لی۔ زبان تپ
 کے گریبان کی دھجیاں اس کے ہاتھوں میں آگئی تھیں مگر وہ اپنے آپ کو کتے سے نہ بچا سکا
 ان کو محسوس ہونا شروع کر دیا۔

"سیٹھ نے کتے کو شاہی دی تو کتے نے ایک جھٹکے کے ساتھ زبان کی ٹانگ کا گوشت اوجھڑ

دیا۔ اچھی خاصی بوئی اس کے منہ میں آگئی تھی زبان شدت کرب سے چبنا تو ساتھ ہی اسے سیٹھ بھی سنائی دیا اپنے کتے کو شاید یاد رہا تھا کہ زبان کی ٹانگوں کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ انسان کا گوشہ تھا۔ زبان کی ٹانگیں لوہان ہو رہی تھیں۔ خون ٹپک رہا تھا بھر رہا تھا بہ رہا تھا اور دھڑ دھڑا رہا تھا۔ جب وہ شدت کرب سے بے دم ہو کر وہیں گر کر ڈھیر ہو گیا تو سیٹھ نے کتے کو چکار کہا اور اسے اس طرح گلے سے لگا کر چوما جیسے کوئی شکاری کامیاب شکار کرنے کے بعد اپنے ہتھیار کو باریک چومتا ہے اس پر ہاتھ جھیرتا ہے۔

چوکیدار ایشین سے واپس آیا تو اس نے زخمی اور نیم بے ہوش زبان کو اٹھوا کر جھنگل کے کنارے پھونکا دیا خون کے دھبے صاف کروائے اور پھر پولیس کو فون کر دیا۔

پولیس آئی تو اس نے انسپکٹر سے کہا میں اندر تھا اپنے بیڈ روم میں۔ چوکیدار مجھ سے اجازت کچھ دیر کے لیے ریلوے اسٹیشن چلا گیا تھا اور جب چوکیدار کسی کام کی غرض سے کہیں جاتا ہے جگہ نیو لے لیتا ہے مگر آج تک اس نے کسی آنے والے فرد کو نہیں کاٹا بلکہ وہ اندر آ کر اسٹیشن مطلع کرتا ہے کہ ہیر گٹ پر کوئی آیا ہے لگتا ہے کہ زبان نے زبردستی اندر آ جا رہا ہو گا یا تو یہ خانی کی ہوگی ورنہ تو انسپکٹر آپ جانتے ہیں یہ میرا صحابا ہوا کتا ہے یہ اس قسم کی حرکت کر سکتا۔ ویسے بے چارہ زبان میرا بہت مخلص مزدور تھا۔

زبان کو سوشل سکوریٹی اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ اسپتال میں اس کے ساتھی مزدور اس کے لیے آئے تو اس سے پوچھا کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ مگر اس نے لوگوں سے یہی کہا کہ سیٹھ ٹھیک ہی کہتا ہے وہ جانتا تھا کہ اس نے اگر ان لوگوں کو اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا تو وہ مشکل کے سمجھ جائیں گے اور نتیجے کے طور پر کچھ باپ اپنے بیٹوں، کچھ بیٹیں اپنے بھائیوں، اور کچھ شہروں کا ماتم کرتی رہ جائیں گی۔ اس کے ساتھیوں کو اس کے بیان پر شک گزرا مگر وہ یہ ہو گئے کہ زبان نے ان سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

زبان خاموشی سے اپنے صحت یاب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دنوں بعد جب وہ ڈسچارج ہوا تو اس کی بغل کے نیچے میسا بھی دبلی ہوئی تھی۔ کتے نے اس کی ایک ٹانگ کو کچھ جھنجھوڑا تھا کہ اب وہاں صرف ایک بڑی باقی رہ گئی تھی وہ اپنے ہتھکڑیاں لیے بغیر ہی اپنے گھر چلا گیا۔ اسے پتا تھا کہ سیٹھ اسے کچھ نہیں دے گا کیونکہ اس کی ٹانگ میں مل کام کے دوران اس کی ہڈی اس کی سروس بھی صرف ایک سال کی تھی اس لیے گرجو بیٹی وغیرہ بھی کچھ زیادہ نہیں

دول اور افسردہ سا تھا۔ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا تھا اس کے سینے میں سیٹھ کے خلاف نفرت اور اس کی آگ بھڑک ابھی تھی سیٹھ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ تو صاف ٹانگوں پر زبان ایک ٹانگ سے معذور ہو چکا تھا ہڈیوں بڑل تو ہرگز نہ تھا پر اس کے وہ اپنے آپ کو بے بس اور سہرا رہا تھا۔

وہ اپنے گھر پہنچا تو اس کی بہن اس کی معذور ٹانگ سے لپٹ کر رونے لگی۔ بہن کے بہتے ہوئے دل پر پھل کا کام دے رہے تھے۔ نفرت اور انتقام کی آگ تیز ہونے لگی وہ شدت جذبات سے کہہ رہے تھے کہ اپنے سینے پر دو ہتھ مارنے کا جیسے سینے کے اندر اٹھنے والے طوفان کو خاموش کر دینا چاہتا تھا اسے اس طرح تسکین نہ ملی تو وہ بھی اپنی بہن کے شانے پر سر رکھ کر رونے لگا۔ اپنے بھائی کو کہہ کر اس کی بہن چپ ہو گئی اور اس کی آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی ”مت رو بھائی، غم نہ کر مردوٹے والے ہوتے ہیں۔ میں تو عورت ہوں مگر تو مرد ہے۔ موت تو مجھے اس ظالم کا پتا دے میں اس کا اس تک پہنچوں گی اور اس کا سارا خون پی جاؤں گی۔“

اس نور بی بی۔ میری بہن نہیں۔“ وہ سسکتا ہوا بولا۔ ”تو نے ابھی خود کہا ہے کہ تو عورت ہے تو کسکی میری بہن کی۔“

اس نے بڑے بازاریش کوں کہا کہ اور نواور وغیرہ کی دکان کھول لی تھی جس سے گزر بسر ہو جاتی تھی اب اپنے معمول پر آچکی تھی مگر اس کے سینے میں سیٹھ کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ نے کچھ سی

اپنے گھر واپس آئے تقریباً ”چار ماہ بیت چکے تھے تو نمبر کے شروع ہوتے ہی موسم خراب ہو چلا اور بارش پڑنے لگی تھی۔ اس کا گھر جو بمبئی اور چھوٹوں سے مل کر بنا ہوا تھا آبادی سے ذرا دور ایک سب سے الگ تھلگ تھا۔ اس وقت موسم کچھ ٹھیک تھا وہ اپنے گھر کے آگے کھڑا کھڑا سے بیٹھ رہا تھا۔ ایک ٹانگ سے معذور ہونے کے سبب سے لکڑیاں چیرتے ہوئے کافی وقت پیش آرہی تھی کہ کسی ضرب کے ساتھ وہ زمین پر گر بھی جاتا تھا مگر چونکہ اسے دیکھنے والا اس کے اس طرح لڑاؤ اڑانے والا کوئی نہیں تھا اس لیے وہ گرتا، پھرتا اور لکڑیاں چیرتا۔ یہ کام اگر وہ نہیں کرتا اور پھر آئندہ خراب موسم کے لیے لکڑیاں جمع کرنا بھی اشد ضروری تھا۔ اس وقت بھی اپنے سینے میں سیٹھ کے خلاف نفرت کے آلاؤ بھڑک رہے تھے زمین پر پڑی ہوئی ہر لکڑی کو وہ سیٹھ کا عالم طیش میں اس کے دو ٹکڑے کر دیتا۔

”زمانہ لالہ“ اس کی بہن نے اندر سے آواز لگائی ”آج روٹی پک گئی۔“

ہاگ نہیں سکے گا کیونکہ وہ ایک ٹانگ سے آہنج تھا۔ ہر حال میں پکڑا جائے گا۔ اور پکڑے گا۔ صورت میں پھانسی کا پھندا یا طویل عرصے تک جیل کی فحشری اس کا مقدر رہ جائے گی۔ پھر اس کے آسرا ہو جائے گی۔ زمانہ یوں بھی ٹھیک نہیں ایسے میں اس کی بہن پر نہ جانے کیا بیتے۔ وہ سوں اور نیک ہے اور دنیا بہت بے درداور بری ہے۔ نہیں، نہیں اس کا ارادہ بدل گیا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا سیٹھ کا کار چہرہ تصور میں ابھرتا تو نفرت اور غصے سے اس کی مضیاں بجھ گئیں۔ اس کی بارگاہ میں خون جوش مارتا لگا۔ اتنی شدت سے جیسے رگوں کو پھاڑ کر پھانسی آئے گا اور اس کی ہڈیاں پکڑ کر کے گا۔ ”انصاف“ مگر بے بسی سے اس کی گردن جھک گئی اور خون آنسو بہ کر اس کے نکل پڑا وہ اپنی بے بسی پر روتا اور رستہ ہوا واپس اپنے گھر کی جانب چل گیا۔

بعض تقریریں دہاں آیا تھا۔ زمانہ اسے اکثر دیکھتا رہا کبھی بڑے بازار میں شاپنگ کرتے ہوئے اور پھر چل قدی کرتے ہوئے کبھی نکل کھاتی سڑکوں پر دوڑتے ہوئے مگر سیٹھ ایک بار بھی زمانہ کو دیکھ نہ سکا۔ زمانہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ اپنے آپ کو اس سے چھپاتا تھا۔ وہ سیٹھ سے نظریں نہیں ڈالتا اور فرموتا تھا۔ ایک بھان تھا۔ سیٹھ اب جب بھی نظر آتا وہ بڑے مشکل سے اپنے آپ کو قابو رکھتا۔ زمانہ کا چہرہ سامنے آ جاتا۔

اسی باقاعدہ شروع ہو چکی تھی۔ آج دوسرا دن تھا وادی کی ہر شے دھیرے دھیرے برف سے ڈھائی تھی بلند دیوالا پہاڑوں کی چوٹیاں مکلاؤں کی چھتیں اور سڑکیں ہر شے برف کے دیالوں میں ڈھائی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ زمانہ کڑی میں کھڑا ہر کار دیکھتا تھا اس کی بہن چارپائی پر گرم کڑی لپی ہوئی تھی لیٹے لیٹے اس نے مکمل میں سے اپنا منہ باہر نکال کر زمانہ سے پوچھا۔

”توہ پیو ہے؟“

”زمانہ نے اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔“

”توہ پیو نہ دے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ زمانہ کڑی میں کھڑا رہا۔ برف روٹی کے گالوں کی طرح تھی زمانہ نے دیکھا کہ گھائی سے بہت نیچے برف سے ڈھکی ہوئی سڑک پر ایک کار بہت آہستہ آہستہ آ رہی ہے کار کے آگے آگے ہٹا برف میں دھنسنے جا رہے تھے۔ اس نے پہچان لیا کہ یہ ہاشم کا کار ہے ہاشم سیٹھ اکیلا بیٹھا غار ڈرائیو کر رہا تھا۔ ٹکڑو ترو کے سامنے اس کے چہرے پر لرزہ آ رہا تھا۔ ہاشم پہاڑی سے نیچے جس پر زمانہ کا گھر تھا رک گئی برف نے کار کو مزید آگے بڑھنے سے روک دیا۔ سیٹھ نے کار کو آگے بڑھانے کی جدوجہد کی مگر بے کار وہ کار سے نیچے اتر آیا اور مدد کے لیے

وہ کھڑی بیٹھ کر واپس پلٹا پلٹا تھا کہ پہاڑی کے نیچے سانپ کی طرح کھاتی سڑک پر آ کر آئی کھاتی دی اور اس کے قدم جیسے زمین پر جم گئے وہ اس کار کو ابھی طرح پہچانتا تھا۔ سیٹھ کی تھی اس وقت اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر کوئی عورت بیٹھی ہوئی تھی اور وہ دونوں کی باتیں کر رہے تھے۔ اس نے لپک کر اپنی سیسہ کی سنبھالی اور تیز قدم اٹھاتا ہوا کار کے تعاقب میں پہاڑی چڑھنے لگا۔ کار سڑک پر رینگ رہی تھی اور وہ گرنا پڑتا پہاڑی پر چڑھتا رہا انتہائی تیزی اور جوش میں۔ کئی بار توازن بگڑا تو زمین پر گر پڑا مگر پھر سنبھل کر اٹھا اور تعاقب جاری رکھا۔ اس نے نظروں سے اوجھل نہ ہوئے دی۔ کار وادی کے رستہ ہاؤس کے سامنے جا کر رک گئی۔ وہ دھڑکیا۔ آیا۔ گھر پہنچا تو دلیر بہن اس کی ہنسنے لگی۔ ”کھانا چلے گئے تھے بھیا روٹیاں مٹھی ہوئی ہیں۔“ اس کی بات کا جواب دیے بغیر گھریں داخل ہو گیا۔ بہن بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی اور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا ہوا زمانہ لالہ۔“

”کچھ نہیں ہوا لاڈ کھانا لاؤ۔“ وہ زمین پر پٹھی ہوئی پٹائی پر بیٹھ گیا آدھی رات کو جب اس کے دوسرے کمرے میں بے خبر سو رہی تھی وہ بستر سے اٹھا اور گھریں پڑا ہوا کھانا اٹھا کر گھر سے باہر چار سو اندھیرے اور سانے کا راج تھا اس کے قدم گیٹ ہاؤس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ کھٹ کھٹ اور اس کے تلے آکر چرچانے والے عکبر نے سانے کا سینہ جبر رہے تھے۔ گھر کے آگے اس نے اپنا مکمل ساتھ لے لیا تھا جو بچ کر دیوے والی سڑی کو روکنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ آگے سے زیادہ راستہ طے کر چکا تو ایک اونچی سی پہاڑی پر چڑھ کر اس نے آگے کی جانب دیکھا۔ کافی فاصلے پر رستہ ہاؤس کی کڑکیوں سے لٹکی ہوئی روشنی نظر آ رہی تھی، پھر اس نے یونی سٹارڈ طرف دیکھا اس کے گھر کی کڑکی سے بھی لالٹین کی مدد میں روشنی چمن کر رہا ہر آ رہی تھی۔ ایک بجو کا آیا تو اس کے سارے بدن میں کچھ سی دھڑکی اس کی نظریں اب بھی اپنے گھر کی طرف ہوئی تھیں اس کی بہن گھریں اکیلی سو رہی تھی اس کا ارادہ تھا کہ وہ کسی طرح بھی رستہ ہاؤس میں ہو کر سیٹھ سے اپنے ساتھ کیے گئے ظلم کا انتقام لے گا لیکن اکیلے گھریں بہن کو سوتا ہوا ہوا تصور اس کے ارادے کو متزلزل کر رہا تھا اسے خیال آیا کہ اگر وہ سیٹھ سے اپنا بدلہ لے گا تو اس کی گرفت سے نہیں بچ سکے گا کیونکہ ظاہر ہے کہ رستہ ہاؤس میں سیٹھ اکیلا نہیں ہو گا اگر وہ ظہارہ کرنے کے لیے دوسرے لوگ بھی نہ آئے ہوں تو بھی رستہ ہاؤس کا چوکیدار تو ضرور ہو گا۔

کشتی جاہم باتیں دیوہی بیٹھے کھیلنے لڑنے چکے تھے طہر مجاہد بھی لکھتے قریض ادا ہیں
جلاتے ہیں سمیت کما چھوٹے جندوں کی دلغریب داستان
تاکڑ کے اعتبار سے ایک منفرد تحریر

قرض



الفاظی کچھ بے ڈھب ہوا تھا۔ صبح اچھی نہ ہو تو سارا دن شوگراری کیے گزر سکتا ہے۔ اس بات
میں آج دوپہر بس اسٹاپ پر آکر ہوا تھا۔ ڈیڑھ بجے دوپہر کوخت دھوپ اور شدید گرمی تھی۔
لوگوں کا تار کو لکھنے لگا تھا۔ جگہ جگہ ٹانگوں کے گہرے نشانات سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ
آل دھوپ اور گرمی کے باوجود ٹریفک میں کوئی خاص کمی نہیں ہوتی تھی۔ بس تو کئی گزر چکی
اکھل کالجوں کی چٹھی کا وقت تھا اس لیے انتشار شہر کا تھا کہ میں کسی بس کے پائیدان پر بیٹھ بھی نہیں
سکتا۔ میری سبکدوشی میں بس کا انتظار کر رہی تھی جو سیدھی منزل پر پہنچاتی ہے کبھی کبھی اس میں اتنا
لوگوں کا سامان رکھنے لگتی ہے مگر یہ لاچ کر دوسری بس بدلنے کی زحمت نہیں کرنا پڑتی۔ شدید آگ
میں ہرے جسم کو جھلسائے دے رہی تھی۔ ہرے کے اندر ہاتھ پر پینے کی بوتلیں پھوٹ آئیں تو

اور اھر دیکھنے لگا۔ زمان فوراً ہی کڑی میں سے ہٹ گیا چند ثانیے کے بعد وہ دوبارہ کڑی
نے دیکھا کہ سیٹھ کار میں بیٹھا ہوا ایک بار پھر کار آگے بڑھانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔ برف اور
تیزی سے گرنے لگی تھی کہ وہ تو کار آگے بڑھانے کی جدوجہد میں الجھ رہا تھا اور برف نے
دروازے جام کر دیے۔ سیٹھ نے گھبرا کر دروازہ کھولنا چاہا مگر بے سود دروازہ نہیں کھلا۔ زمان
سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا خوشی اس کے دوس دوس سے پھوٹ رہی تھی۔ سیٹھ کی جگہ کوئی اور
وہ ہرگز ایسی خوش محسوس نہ کرنا بلکہ ہر ممکن طریقے سے اسے بچانے کی سعی کرتا۔ وہ قہر
آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ برف متواتر کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے سفید بادل ٹوٹ ٹوٹ
گرہے ہوں کار میں سے اب سیٹھ کا صرف یہاں نظر آ رہا تھا جو بند دروازہ کھولنے کی آخری
دووا لگی کا مظاہرہ کر رہا تھا مگر گاڑی اب سفید تابوت لگنے لگی تھی۔ سیٹھ کی قبر اس تابوت
تھی۔ آسمان سے حوریں سپید سپید پتیاں پھار کر رہی تھیں۔ سیٹھ نے غائب ہونے سے پہلے
بیشہ توڑنے کی بھی کوشش کی تھی کیونکہ برف کے تابوت میں تھوڑی سی پھیل ہوئی تھی کہ
طوفان نے اس کا آخری وار بھی ناکام کر دیا تھا سفید بے بس چہرے کی طرح برف کے ہتھکڑے
تھا اور شاید بے ہوش ہو چکا تھا۔ کبھی ہوش میں نہ آنے کے لیے۔ زنا خاواؤرا۔ زنا خاواؤرا
برف میری پیاری برف۔ وہ خوشی سے جھومتا لڑکھاتا پھرتا چلا۔ ہاتھ لگا کر رفتہ رفتہ
ہوا کہ جیسے اس کی خوشی کھول ہے اس کے اندر چھپا ہوا ایک آدمی ہولے ہولے رو رہا تھا
درو میں تڑپ اٹھنے والا زمان ایک آدمی کو بے بسی سے مرتے ہوئے کب دیکھ سکتا تھا۔ انعام
بیک بچھ گئی انسانیت کا درد بھڑک اٹھا۔ میں ایک انسان کو ایسے مرتے نہیں دیکھ سکتا۔
کسی نے سسکی لی۔ مجھے بچانا ہو گا اس کے دل کے کسی گوشے سے آواز آئی۔ تو سیٹھ کی
دل نہیں بن سکتا زمان۔ ہاں یہ یہ بچ ہے۔ وہ بڑبڑانے لگا پھر وہ بیساکھی اٹھا کر گھر سے نکل کر
برف میں بیساکھی اور اس کے قدم ہری طرح دھنسنے رہے تھے مگر وہ آگے بڑھتا رہا لیکن
ایک جگہ ہری طرح لڑکھاتا اور تمام تر کوشش کے باوجود اپنے آپ کو نہ سنبھال سکا وہ
اس کی بغل سے نکل کر نیچے لوٹنے چلی گئی وہ اپنی ساری قوت جمی کر کے اٹھا لیکن وہاں
ناک موسم میں ایک قدم بھی آگے نہ جاسکا اور ایک بار پھر اوندھے منہ گرا اور پھر اپنے
گھٹنے لگا کہ برف کی وہ مرمیں قبر اسے دکھائی نہ دے۔ جو سیٹھ باشم کا مقدر بن چکی تھی۔

میں نے نقاب سے پیدتا پوچھ ڈالا۔ سامنے گئے کے رس والا ایک درخت کے سامنے میں اپنی
 گاہکوں سے نمٹ رہا تھا۔ سخت گرمی اور لو کے زمانے میں گئے کے رس سے بڑی فرحت ہوتی
 مجھے بھی کئی تھی لیکن سرک پار کر کے رہڑی تک جا میرا لیے انتہائی مشکل مرحلہ تھا۔ اول
 کرتے ہوئے یونی میری جان نکلتی ہے۔ لگتا ہے کہ بس ابھی کوئی ٹرک یا دیگر چیز رفتاری
 توڑتی مجھے روندتی ہوئی گزر جائے گی۔ دوسری بات یہ کہ اگر میں ادھر گئے کا رس پینے میں لگی
 ادھر میری بس آگئی تھی، لیکن بس تو کسی کا انتظار نہیں کرتی اور اسٹاپ پر سوار یوں کی کئی
 بس نکل گئی تو جانے پھر کتنا انتظار اور کرنا پڑے۔ دراصل آج مجھے کالج سے نکلنے میں ہی دو
 ورنہ روز تو میں دس منٹ پہلے ہی پہنچ جاتی تھی۔ بس میں زیادہ رش بھی عموماً نہیں ہوتا تھا البتہ
 دیر ہو جاتی تو وہ بس چھوٹے کے بعد مجھے نہ صرف انتظار کرنا پڑتا تھا بلکہ بس کے اندر بھی بے
 تھی۔ ریوٹوں کی طرح اس میں لوگ بھرے ہوتے۔ زیادہ تر طلباء و طالبات ہوتے کیونکہ یہ وہ
 کا ہوتا ہے۔

آج صبح کا آٹھ بجھ کر خوشگوار نہیں ہوا تھا۔ صبح صبح ہی سے میری جنگ ہو گئی۔ وہ ہمیشہ میرا
 کرتا تھا۔ میرے تو لیے پر اس کے گندے ہاتھ کے کالے دھبے لگ جاتے۔ میں چہنچا شروع
 بے اصولی ہرگز کسی صورت میں پسند نہیں اور ہتی جیسا بے پروا ہے اصولاً شخص میں
 دیکھا۔ دیے تو زیادہ تر ہماری بول چال بند ہی رہتی تھی مگر بغیر ایک دوسرے کو مخاطب
 کیے ہوئی لہذا طوطا ملی کو مخاطب کر کے اپنا کام چلا لیتے وہ مجھے بہت تنگ کرتا تھا۔ مجھ سے
 مگر عرب ایسے جھاڑا جیسے عمر رسیدہ بزرگ ہو۔ اماں کہتی ہیں کہ میں بڑے بھائی کا لانا
 رے بڑا بھائی۔ اب میں اسے بھائی جان بھائی صاحب تو تنے سے رہی۔ جب میں پیدا ہوئی
 اس سے چھوٹی تھی۔ کچھ دن بعد ہم برابر ہو گئے۔ لوگ ہمیں جڑواں بہن بھائی سمجھنے لگے
 برابری میں گزرے پھر میں پھیلنے اور بڑھنے لگی۔ وہ سنہ سکرے لگے بے چارہ بتا رہی تو رہتا
 اماں کی ساری ہمدردیاں اسی کے ساتھ تھیں۔ ابا تو اس کے عاشق تھے ہی۔ لوگ اس پر قہر
 بڑا ہو کر چھوٹا لگتا ہے اور چھوٹی بہن بڑی، لیکن تھی ہے۔ بس یہ اس کی چڑبن گئی۔ بس وہ
 بیکار کی ضد بحث لگنے لگے۔ ہر بات میں مجھ پر فوٹ جتانے کی کوشش کرتا۔ میں یوں ہی
 سے اس سے برتر تھی اور جین جھپٹ، دوڑ بھاگ میں کوئی میرا مقابلہ نہ کر سکتا تھا اس
 مجھ سے شکست کھاتا۔ اس کا غصہ بڑھتا گیا اور میری سینہ زوری۔ ادھر اماں ابا دونوں اس

کرتے۔ ابا کا تو پتا نہیں مگر اماں مجھے بھی کم نہیں چاہتی تھیں۔ کبھی کبھی چپکے چپکے سمجھاتیں۔ "ارے تو
 کی تو لحاظ کر لیا کر۔ دیکھ تو کتنا کمزور ہے پچھرا۔" اور میں اماں پر غرائی کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ قصور بہنی
 کا ہے اسی کی حمایت کرتی ہیں۔ اماں پھر مجھے سمجھاتیں۔ "میں تو اس کا دل رکھنے کو ایسا کرتی ہوں مجھے پتا
 ہے کہ تھلپی بہنی کی ہے مگر بتا رہتا ہے نا۔ اس کا دل کمزور ہے اسی لیے غصہ کرتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ
 اس کا دل ٹوٹے۔"

میرا ابا ہو کہ اس نے اچھا کم لبا ہونا شروع کیا۔ اتنا لبا، اتنا لبا کہ میں اس کے سامنے گڑیا کھتے گلی
 اور اب زیادہ ہی رعب بجانے لگا۔ بس پھر لڑائی شروع۔ میں اسے زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ
 لے دیتی۔ اب میرا قد اس سے کافی چھوٹا رہ گیا تھا مگر زبان نہ۔ اس کا مقابلہ وہ نہیں کر پاتا تھا۔ صبح بھی
 نے اسے خوب تنگ کیا اپنے تو لیے کہ بدلے میں اس کی پیٹ پر باورچی خانے کے کھٹنے ہاتھ صاف
 کر کہہ صاف کرتے ہوئے کئی چیرس ادھر ادھر چھپا دیں۔ طوسی طوسی۔ "اس نے چپکے سے کہا تو میں
 کہہ کر اسے دیکھنے لگی کہ آج یہ میرے لاڈلیوں ہونے لگے۔ وہ جھٹ پٹی کی طرف دیکھنے لگا۔ "پوسی
 تو کتنی گندی ملی ہے۔ پچھتے کتے گندے رکھتی ہے۔ چل میں تجھے گندے تالاب میں پھینک آؤں۔"

میں فوراً "طوطے کے خنجرے کے پاس چلی گئی۔" "میاں مٹھو۔ میاں مٹھو۔ چوری کھاؤ گے۔ اچھا شہد
 ہاؤ کے؟ اماں وہ شہد کا ڈبا کہاں ہے جو ابا لائے تھے۔" میں نے پکار پوچھا۔

"اوپں الماری میں رکھا ہے۔" اماں نے باورچی خانے سے ہی بانک لگائی اور مجھ سے پہلے ہی الماری
 کھلی کیا۔ ڈبا نکال کر الماری کے اوپر رکھا دیا۔ جہاں میرا ہاتھ نہیں جا سکتا تھا۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔
 بات ہے۔ وہ مجھے کتنا سائے تنگ کرے میں ہیز نہیں ہوتی، چرتی نہیں البتہ بدلہ ضرور لیتی تھی
 اسی لیے کبھی کبھی پیش میں نہیں آتی مگر وہ افواہ۔ اس کی جھلاہٹ دیکھنے کے لائق ہوتی۔ فوٹاں
 کو ابل کھاتا ادھر سے ادھر پھرتا۔ میری ہنسی سے اس کی جان جلتی تھی۔ صبح کا منظر یاد کر کے مجھے اس
 کی بے اختیار ہنسی آنے لگی۔

"میری سرخ چپک کی قیاس کہاں ہے؟" وہ اپنے کمرے کی ہر چیز الٹ پلٹ کر قیاس کی تلاش سے
 ابا کو چلائے لگا۔

"لگے کیا پتا۔" اماں نے تنگ کر کہا۔

"اکی تو میں یہاں رکھ کر گیا تھا۔" وہ بتایا ہوا تھا۔ "دیر ہو رہی ہے۔"

”تو دوسری قیص پرن لو۔“ اماں مفت مشورہ دینے کی عادی تھیں۔ ”میں ڈھونڈ کر رکھ دوں گا۔“

”فہم۔ میری سرخ چپک کی قیص۔“ وہ پھر چلایا اور اس نے گھور کر مجھے دیکھا۔ ”کدو صفائی“
 ”اے ہے۔ طوسی بتا دے اگر تو نے کیس رکھی ہے تو۔“ اماں خفگی سے بولیں۔ وہ ہماری ماں
 کچھ کہیں تھیں کہ اس گشدگی میں میرا ہاتھ ہے۔ وہ ہاری یہ چوریاں اکثر پکڑ لیتی تھیں۔
 ”مجھے کوئی۔“ میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ہتی بڑی اچھا آمیز نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔
 ”بھئی۔“ میں نے کندھے اچکا۔ ”میلے پکڑوں کے بکس میں ابھی نے میں سے پکڑ لیا۔“
 ”ہیں۔“ وہ جھلی کی سی تیزی سے غسل خانے کی طرف بڑھا۔ سارے کیلے پکڑے نکال کر اس
 پینک دیے۔

”اماں۔“ میں چیختی۔ ”ابھی میں نے صفائی کی تھی۔ بس اب میں نہیں سمیٹوں گی۔“
 ”ارے ارے۔“ اماں بھی خفا ہوئے لگیں۔ ”نہیں ملتی تو دوسری پن لے نا۔ کیا عجیب۔“
 اس نے میلے پکڑوں کے بکس سے اپنی قیص ڈھونڈ لی تھی اور شیطہ برساتی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔
 ”ابھی استری کر کے رکھی تھی۔ اگلے کیلے کی تیر نہیں جانور کو۔“ وہ غرایا۔
 ”کون جانور۔“ اماں نے بڑے معصومانہ انداز سے پوچھا۔

”آپ کی بلی اور کون۔“ پہلے میلے پنچر مار کر میری پیٹ کا ستیا کیا۔ اب قیص بدبو دار
 بڑبڑاتا ہوا استری کر رہا تھا۔ میں سامنے کھڑی اسے گھورتی رہی۔ بول چال نہ تھی۔ ہاتھ اٹھانے سے
 باہر جاتے جاتے وہ میرے قریب سے گزرتے ہوئے یہ جملہ چپکے سے کہہ گیا۔ ”وہ کتنی ہی ہے۔“
 میں بہت خوبصورت لگتا ہوں۔ آج ہماری ملاقات کا دن ہے۔“

ملاقات کا دن مجھے وہ حالات میں کسی سے ملے جا رہا ہے۔ ہونہ۔ یہ تو وہ اکثر بلی سے
 مجھے سناتا رہتا ہے کہ ”وہ بہت اچھی بہت پیارا رہے۔“ بلی سے ملاقات کا شوق رکھتی ہے۔ ”میں
 بات ہمیشہ نظر انداز کر جاتی۔ وہ چاہتا تھا میں اماں سے اس بات کا ذکر کروں پھر اماں اس
 بات آگے بڑھے مگر میں خاموش رہی کئی دفعہ وہ ذکر کر چکا تھا مگر میں نے طوطے کے اڑنے کی طرح
 جواب نہیں دیا کہ جناب کی عمر ہی کیا ہے کہ ”وہ“ بھی بلی لی۔

”وہ آج لارنس گاؤن آئے گی۔“ چل پوسی تجھے بھی ملا لوں بالکل تجھ جیسی ہے۔
 ”جھاؤ گی۔“

میں چپ چاپ سنتی رہی۔ لارنس گاؤن آئے گی۔ آئے۔ مجھے کیا۔ کوئی شریف لڑکی تو اس طرح
 اس سے ملاقات نہیں کرتی۔ یہ سب تو بس فلوں اور افسانوں میں ہی ممکن ہے اور پھر لڑکا بھی کبعت
 کا کا ہو یہ ہتی بھی کوئی چیز ہے۔ دودھ کے دانت ٹوٹے نہیں اور میں اچانک اپنے خیالوں سے بیدار
 ل۔ اف میں تو ابھی بس اسٹاپ پر ہی کھڑی ہوں۔ میں ایک بس کے آنے سے چونکی تھی۔ اس میں
 ایک بیگہ نہ تھی۔ ضحاض تو بھری سی تھی پھر میرے پاس کھڑے لوگ بھی اور دھڑلے پڑے تھے۔ ڈیڑا
 لالک گئے تھے کوئی کھڑی بیڑے لڑکا ہوا تھا۔ سب کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب جو بھی بس آئے
 میں اس میں ضرور بیٹھ جاؤں گی خواہ بدلتی ہی کیوں نہ پڑے۔ بھوک اور پیاس سے برا حال ہو رہا
 امی نے حواس باختہ کر دیا تھا۔ تیش بہت تھی۔ مجھے پھر سا آنے لگا۔ اچانک مخالف سمت سے ایک
 س نیوزی سے آنی دکھائی دی پھر جانے کیا ہوا شاید کسی سائیکل سوار کو بچانے کے لیے ڈراما کرنے
 لے۔ اسٹیشنرنگ گھمایا اور چکر لگاتی ہوئی گئے کہ رس کی ربڑی سے لگرائی ہوئی درخت سے ٹکرا کے
 ل۔ میری چیخ نکل گئی۔ بس اسٹاپ پر کھڑے لوگ مٹی کی طرف دوڑ پڑے مگر میں اپنی جگہ کا پتہ
 اور۔ کوئی دیوار ستون یا کوئی درخت نہ تھا۔ جس سے سہارا لیتی پھر بس میں سے لوگوں کو اتار گیا۔
 میں عبور میں بچوں کو سنبھالتی آ رہی تھیں۔ ان کے منہ سے گالیوں کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔
 کے لوگ ڈراما کر رہے تھے تب میں نے دیکھا ڈراما کرنے سے سرخ چپک کی قیص
 ل ہے۔ میرا دل الجھل کر باہر آنے کا چیخ مٹ گیا۔ میں سرخام کر زمین پر بیٹھ گئی۔
 مسل کر میں دیکھا۔ ڈراما کر کے سر سے خون بہہ رہا تھا مگر وہ ہنس رہا تھا اور حادثے کی وجہ بتا رہا
 اس سے برا بھلا کہہ رہے تھے۔ نصیحت بھی کر رہے تھے اور اس کی بیٹھ ٹھوٹک کر شامیاش دے رہے
 نے کمال ہو شیاری سے بہت سی انسانی زندگیاں بچائی تھیں۔ ہوتا کوئی انڈیا ڈراما تو جانتے
 کا نقصان ہو نا۔ کتنے اعضا کھینچ جاتے۔ بس کا کٹھن کٹھن سی ہوئی نظروں سے ڈراما کر کو دیکھ رہا
 وال بڑبڑاتا ہوئی تفصیل بیان کر رہی تھیں۔ کسی کے سر میں چوٹ آئی تھی۔ کسی کے ہاتھ جھل
 اور دیکھ زخمی ہو گئے تھے مگر کوئی بھی زیادہ زخمی نہیں ہوا تھا۔ سب اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے۔
 ڈراما کر بھی ابھی وہاں تھا جس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے سر سے لپٹے رومال کو اتار کر اس سے
 ل کیا۔ دھوپ اور پسینے میں اس کا سر چمک رہا تھا۔ گنجا سر اور میں نے اطمینان کی سانس لی پھر
 اسے ایک رکش میں بٹھا کر اسپتال بھجوا دیا۔ سوار یاں خصوصاً۔ عورتیں چیخ رہی تھیں کہ اب
 کا کٹھن کٹھن رہا ایک سے باری باری کہہ رہا تھا۔ ”گھبراؤ نہیں اماں“ ابھی دوسری بس آئے گی۔

کلی سڑک پر کیا ریس لگا رہا تھا۔ آخر اگلی بس سے آگے نکل گیا۔ میں تو جی ڈری بھی کہ بس
وہی ٹکر۔ اس نے تو مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ زندگی جتنی کہ بچ گئے۔
میں بھی گھر جا کر شکرانے کے نفل پڑھوں گی۔

درمیں نے سوچ لیا۔ اب جو کوئی بت بھی آئی میں اس میں کسی نہ کسی طرح سوار ہو جاؤں گی۔ خواہ
اپنی بدلتی پڑے یہاں سے تو نکلوں پھر ایک بس آگئی مگر یہ میرے گھر کی طرف نہیں جاتی تھی۔ وہ
میں میں چڑھ گئیں۔ میں پھر کبھی رہ گئی۔ پون گھنٹے سے میں یہاں کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔
اب اتنی پریشان ہوں گی۔ میرا اندر پھر بس کے حادثے کی طرف چلا گیا۔ ڈرائیور اگر اتنا ڈی ہوتا
کیا ہوتا۔ میں نے خود کو ہلانے کے لیے دوسری طرح سے سوچنا شروع کر دیا۔ روزی حادثے
وں۔ آج میرے سامنے ہوا تو میں اتنی پریشان ہو گئی۔ آخر میں کڑی کیا سکتی تھی۔ پچھلے دنوں یہی
آگے پیچھے پھرتے ہوئے کسی کیس کی خوشحال کرتا رہا تھا۔ اماں بس۔ ایک بار اماں میری سفارش
مجھے ایک گاڑی لے کر دیں پھر آپ کو کہیں آنے جانے کی تکلیف نہیں ہوگی۔ اماں میری
مشتاق پورا ہو جائے گا اور آپ کی ضرورت بھی ہے۔ اماں ادھر ادھر تاتی پھر رہی تھیں اور وہ
طلب ہو گیا۔ ”میری پوسی۔ تو ہی اب اسے سفارش کرو نہ۔ لوگ تو دوسروں کے لیے جان دے
کر مروت تو بے زبان بنی ہوئی ہے۔ دوسروں کے سامنے تو زبان بن جاتی ہے کئی۔“ پیچھے چلائی ملی
پھر کہہ دیا اسے باہر پھینک آیا۔ ”اب میں بیچ سڑک پر جا کر کھڑا ہو جاؤں گا۔“ وہ کمرے کے اندر
چلا آیا۔ ”کسی نہ کسی موٹر کے بریک تو خراب ہوں گے۔ نا۔ جب خون بہتا ہوا سر اور ٹوٹی ہوئی
لوہے کے آؤں گات سب کو پتا چلے گا کہ کس لیے میں نے یہ ایکسٹنٹ کرایا ہے۔“ اور اسی روز
کھانے پر میں نے ابا سے سرسری طور پر کہا۔ ”اب آپ بتی کو گاڑی کیوں نہیں دلا دیتے۔ اس
درا ہو جائے گا اور ہماری ضرورت۔“ ابا نے چونک کر مجھے دیکھا تھا۔ وہ کھانا کھا کر نہ پچلائے
رہا تھا۔ میری بات سن کر رک گیا اور پلٹ کر مجھے جرت سے کھنکھانے لگا۔

قلعے کے شوق پر میں اپنی محنت کی کمائی کے ہزاروں روپے تو نہیں پھینک سکتا۔“ ابا نے سختی
کی۔ ”اب کیوں ہماری ضرورت بھی تو ہے۔“ میں نے رمان سے کہا۔ ”روپی تو گھر میں ہی رہے گا۔“
ابا نے ڈرائیور ہانے کا شوق نہیں رکھا۔ ”ابا نے قدرے رکھائی سے جواب دیا تھا۔ ”میں اسے
ایکسٹنٹ چاہتا تھا مگر یہ کیا بننا چاہتا ہے۔“ ابا کے چہرے پر دکھ اور مایوسی کے گہرے بادل تھے۔

اس میں آپ سب کو بھادوں گا۔ آپ جی ذرا انتظار کرو۔ ابھی آتی ہے اگلی بس۔“ ان میں سے
عورتیں سڑک پار کر کے میری طرف آ رہی تھیں۔ وہ مستقل یولے جارہی تھیں۔ اسٹاپ پر آ کر
بڑبڑاتی رہیں۔ ”اتنی دور سے ریڈیو لگا رکھا تھا کبھت نے۔۔“
”نہیں جی۔ ٹیپ تھا۔ میں نے خود دیکھا۔ وہ جھک کر کیسٹ لگا رہا تھا کہ سامنے سے سائیکل سوار آیا
میں چیخ کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا پھر گاڑی موڑی۔ میری توجہ جان ہی نکل گئی تھی۔“
”حالات یہ ہیں بس ریڈیو یا کیسٹ چلا نا خلاف قانون ہے۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔
”جی کسی کی طبیعت خراب ہے یا کوئی پریشان ہے یا پھر اسے گانے پسند نہیں مگر میں میٹھی کی
سزا ضرور بھگتی پڑے گی۔ منع بھی تو نہیں کرنا کوئی۔“

”منع تو کرے مگر وہ سنتے ہیں بھلا۔ میری تو کئی دفعہ جنگ ہو چکی ہے اسی بات پر۔ اپنی سیٹ پر
ہوئے فزخون ہوتے ہیں بد بخت۔ ہائے میرا بازو۔“ لڑکی اپنا بازو سلارہی تھی شاید چوٹ آئی تھی۔
”پچھلے دنوں ایک بس میں کالج کے لڑکوں نے اسی طرح ریکارڈنگ سے منع کیا۔ ڈرائیور نے
روکی۔ لڑکوں سے کہا اترو۔ وہ نہیں مانے گا کہ اسی پر چائیں گے اور ٹیپ نہیں بچے گا۔ بات بڑی
انھوں نے اس کا ٹیپ ریکارڈ تو ڈیو۔ پولیس آئی پھر ڈرائیور کو ہی فرمانہ ادا کرنا پڑا کیونکہ اس نے
کے قانون کے خلاف ورزی کی تھی۔ ٹیپ ضبط ہوا۔ سوا لگ۔“
”ہم لوگ ان جینگیلوں کو قانون سکھائیں تو شاید انھیں شرم آئے۔“ ایک خاتون جوش میں
”مگر ہم بھی تو برداشت کرتے ہیں یہ خرافات انھیں جھوٹ مل جاتی ہے۔“
”ہاں! اور کیا۔“ دوسری کہنے لگی۔ ”گوشت کا ہی بے لوبہ تئیں بڑھانے جارہے ہیں اور کھانا
دماغ ہی نہیں ملتے۔ نہ نیس ہم دونوں گوشت پھر دیکھو دماغ ٹھیک ہوتا ہے یا نہیں۔ ہماری قوم میں
نہیں ہے۔ بے حس ہو گئے ہیں سب کے سب۔“

”اور کیا۔ ہماری بھی تو ذمے داری ہے مگر ہم سب کچھ جمیل رہے ہیں۔“
میرے پورے جسم سے پستے کی دھاریں بہ کر ہیروں تک پہنچ گئیں۔ میرا ذہن ڈرائیور کی طرف
ہوا تھا۔ پتا نہیں کتنی چوٹ آئی ہوگی۔ بس رہا تھا بے غیرت۔

”میں تو اب گھر واپس جاؤں گی۔“ لڑکی کہہ رہی تھی۔ ”اتنی گرمی میں دوسرے کو کمرے سے
لی۔“
”ہاں کر اہے کیا تو جانے دو۔ جان کا صدقہ کیا۔“

انھیں ہنی کے مشاغل بالکل پسند نہیں تھے۔ اس کے کمرے کی دیواریں نت نئی کاروں اور دیگیوں
ماڈل پوسٹروں سے پتی پڑی تھیں جنہیں وہ حسرت بھری نظروں سے دیکھتا تھا۔

”سی ایس پی آفیسر کی تو ہمارے ملک میں کمی نہیں ہے ایا۔“ میں نے کچھ رک کر کہا۔ ”اور
آفیسر ہمیں دیتے کیا ہیں؟ بدنامی؟ رسوائی؟ ذات؟ خسارہ ان سے تو ایک غریب بھت خش لاکھ دے دے
ہے۔ ایمان کی روزی کما تا ہے۔ روکھی سوکھی لاکر عزت کی زندگی گزارنے پر لائق لاکھ دوا کر تا ہے۔
کے کندھوں پر پورے ملک کی ترقی کا داؤدا رہا ہے۔“ میں نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ محسوس کیا کہ
کے چہرے پر بڑی دلریا بہت حسین مسکراہٹ ہے۔ وہ پر تشکر نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔
اس سے کہ نہ سکی کہ اس کا چاکلیٹیا بالوں والا سر مجھے بہت عزیز ہے۔ میں اسے خون میں بیگا ہوا
کی بہت نہیں رکھتی۔ اس کے کچھ دن بعد جب وہ خوشی سے چھلانگیں مارتا ہے معنی آواز میں
سے ادھر پھر رہا تھا اور مجھے مخاطب کر کے شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر میں اس سے بات کرنا نہیں
تھی۔ کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ بول چال شروع ہو گئی تو زیادہ بے تکلفی سے مجھ پر رعب بٹانے
اس لیے میں اس کی طرف سے منہ موڑے بیٹھی رہی۔

”مجھے کالج چھوڑ دوں۔ دوسرے کو لے بھی آؤں گا۔ گیٹ پر انتظار کرنا۔ اچھا۔“
میں نے طوطے کے پاس جا کر کہا۔ ”مجھے ضرورت نہیں میاں مٹھو۔ سڑک پر بہت سی بیس
اور مجھے سیکینڈ ہینڈ گاڑی میں لٹکوں کے ساتھ بیٹھنے کا کوئی شوق نہیں۔“ اس کا چہرہ غصے اور
احساس سے سرخ ہو گیا۔

”وہ بیس جو سڑک پر چلتی ہیں۔ کیا بالکل نئی ہوتی ہیں؟ بالکل اپنی ذاتی ہوتی ہیں؟“
”میاں مٹھو بے شک وہ دھواں اگلتی ہوئی پرانی ہوتی ہیں مگر وہ میرے ملک کی دولت ہیں۔ میں
ادا کرتی ہوں جو ملک کی ترقی کے کام آتا ہے۔ میں ان سے گفت کی صورت میں جو رسید لیتی ہوں
سے مجھے احساس ہوتا ہے کہ اپنے ملک کی تعمیر میں میرا بھی حصہ ہے۔“

”اچھا۔“ اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔ ”تو کرایہ دے دتا۔“ وہ زیادہ بحث نہیں کر سکتا تھا۔
کی کمزوری تھی۔

”جب کرایہ ہی دیتا ہوا تو میں سرکاری بس میں بیٹھ کر ملک کی دولت میں اضافہ کیوں نہ کروں
نے شک کر جواب دیا۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور کمرے میں جا گھسا۔ اندر سے ہی چلانے لگا۔
دنیا پاگل ہے۔ یہ جو اتنی بڑی بڑی کایں۔ وہ گینیں اور پک اپ وغیرہ لوگ خریدتے ہیں۔“

ایک ہماری بہن عاتکہ وزیر زادی ہیں۔“ اس کے بعد کپڑے بدل کر وہ میرے سامنے سے گزرا۔ خفگی
پے اس کا تجوید اسوچا ہوا تھا۔ کسی مضمون پہنچنے کی طرح پھولا ہوا چہرہ لے وہ دروازے تک پہنچا۔ مجھے بڑی
ادری کی ہنسی آگئی۔ اس نے میری ہنسی کی آواز سن لی اور مزید خفگی کے اظہار کے لیے اس نے دروازہ زور
سے بند کیا۔ دھڑاک۔

”اوسے۔ کیا دروازہ توڑ دو گے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا معیت ہے۔“ اماں غسل خانے سے چلائیں۔
”پلے گئے آپ کے لاڈلے۔“ میں نے اونچی آواز سے انھیں بتایا۔

”کوئی تو بیکار میں خد کرتی ہے۔“ چلا جاتی اس کے ساتھ کچھ تو فائدہ ہوا اس گاڑی کا۔
”کیوں چلی جاتی ہیں۔“ میں نے شک کر کہا۔ ”اس کی تو سیکینڈ ہینڈ گاڑی چار دن بعد روکشاپ میں
لڑی ہو گئی مجھے پھر بس میں ہی آنا پڑے گا تا تو میں کیوں اپنی عادت بگاڑوں۔“ اور آج آج تو قیس کی
لاٹ اور پھر استری کے دوران اس نے کتنی بار مجھے غصے سے گھورا تھا جلدی میں تھا۔ ”اس“ سے
کلمات کی گھبراہٹ بھی تھی مگر شام کو ضرور مجھے ستانے چلانے کے لیے کوئی ترکیب سوچ کر آئے گا۔ میں
اور وہ نہیں بچنے چھڑا دوں گی۔۔۔ اور پھر۔۔۔ اماں کے دربار میں پیشی۔۔۔ مجھے ہنسی آئے گی۔ پیشی کی اس وہ
اماں کا نام۔ میں جواب دیتی رہتی تھی۔ اماں فکر بیکاری یاری ہمیں دیکھتی رہیں۔ ان کی گردن ادھر
لٹکی رہتی۔ کبھی میری طرف کبھی اس کی طرف۔ اماں کے سامنے جانے کی نوبت بہت کم آتی۔ اصل
وہ اب کچھ دنوں سے اماں کی خواہشات پر پورا نہ اترنے کی شرمندگی میں ان سے خائف رہتے آئے تھا۔
میں ابنا چھڑا تھا اسی لیے ابنا مجھے بہت اہمیت دینے لگے تھے۔ میں نے گھرواری کے علاوہ تعلیمی حجاز پر
میں نے گاڑی دے تھے۔ ہر بار فرسٹ کلاس فرسٹ۔

اب سوچ سوچ کر میرا ذہن شل ہو گیا تو چاک ایک دیگن آتی نظر آئی۔ نمبر دیکھا۔ اوفہ بدلتی پڑے
نیرا گلی سیٹ خالی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھی۔ کنڈیکٹر چھو کر جلدی سے بول اٹھا۔
”کچھ آجا نہیں آیا۔“

”کیوں۔“ میں نے کہا۔ ”اگلی سیٹ خالی جو ہے۔“

”وہ کسی اور کے لیے ہے۔ آپ پیچھے آجائے۔“ اس نے بے رخی سے کہا۔ میں تو چاہا۔ زبردستی آگے
لوں مگر سوچا اگر یہ بس میں نکل گئی تو نہ ابھی اور کتنا انتظار کرنا پڑے مجبوراً پیچھے جا بیٹھی۔
ساتھ ایک آیا ٹاپ عورت بیٹھی تھی۔ کنڈیکٹر چھو کر دروازے کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔
میں بولے جا رہا تھا۔ زیادہ پاں کھانے سے اس کے ہونٹ دانت اور مسوڑھے کالے پڑ چکے تھے جن

کی وہ عام نمائش کر رہا تھا۔
 ”تم اسنے پان کیوں کھاتے ہو؟“ میں نے اسے ٹوکا۔ وہ جیب سے ایک پان نکال کر کھا رہا تھا۔ اس طرحی نظروں سے مجھے دیکھا۔
 ”اچھی لگتے ہیں۔“ اس نے میری نقاب کو گھور کر کہا۔
 ”تم سیب کھایا کرو۔ سیب ہمارے ملک کا پھل ہے۔ بہت فائدے مند ہے۔ پان دوسرے ملک کے پھل ہے۔“
 ”آپ کی در آمد پر ہمارا کروڑوں روپے خرچ ہوتا ہے۔“ میں نے اسے سمجھانا چاہا۔
 ”لکھنا چھوڑ دو تو کروڑوں روپیا ملک کی ترقی کے کام آئے۔“
 ”آپ کھائیں سیب۔ ہم غریب لوگ اتنا تنگ پھل نہیں کھا سکتے۔“ اس نے بے رخی سے جواب دیا۔
 ”دو کروڑ کے پان کھا سکتے ہیں۔ سینکڑوں روپیا ماہانہ پان پر خرچ کر سکتے ہیں۔“ ایک نوجوان نے حمایت میں اس سے کہا۔
 ”اچھا تو تم گنا کھایا کرو۔“ میں نے سوچ کر کہا پھر خود ہی شرمندہ ہو گئی۔
 ”گنے سے چینی بنتی ہے اگر ہم گنا کھانا کھا دینے کا رس پینا چھوڑ دیں تو چینی کی کمی نہ ہو۔ کنڈیکٹر ڈرائیور کی طرف منہ کیے بک بک کر رہا تھا۔ ”ہاں استاد بھیجی گئی سے فاصلہ رکھنا۔ دیکھنا آئے پائے۔ آج تمہارا امتحان ہے۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔ اپنا استاد کوئی انٹروی نہیں ہے۔ میں نے پہلے گئی اڈے پر پہنچا دوں گا۔ استاد آج آیا ہی تو انتظار ہی میں ہوں گی۔ آج میڈی اسپتال میں گئی یہ سڑک چوڑی نہیں ہو سکتی۔ استاد میڈی اسپتال میں کیا رہا ہوتا ہے۔ بے کار گئی پھنس جاتا۔“
 ”میں نے روک کے استاد ذرا جلدی بھائی جلدی اتار دی ہوئی تو پچھلی گئی کی نکل جائے گی۔ آج میں اپنے استاد کی استاد کی۔ استاد ذرا ریکارڈ تو لگنا دیر ہو گئی گانا نہیں سنا۔ ریس کے وقت بند کر دیا۔ خیر ہے۔ گلیکی۔ گلیکی ہے کوئی میرے بھائی جلدی جلدی ارے واہ بڑی سواریاں ہیں استاد۔“
 ”ہی سواریاں۔“
 ”تم یہ سرگٹ بچھا نہیں سکتے۔“ میں نے کنڈیکٹر کی بکواس سے تنگ آکر ایک شخص سے کہا۔
 ”پل رہا تھا۔“ ”پڑھ لکھ کر اتنا نہیں جانتے کہ بس کے اندر سرگٹ پینا کتنا نقصان دہ ہے۔“
 اس نے بغور میرے برقعے کو دیکھا پھر بے پروائی سے منہ پھیر لیا۔
 ”سرگٹ بچھاؤ ورنہ میں ٹریفک سارجنٹ سے شکایت کروں گی۔ تم ہی پکڑے جاؤ گے اور پھانسی دیا جائے گا۔“
 ”دوسرے مسافروں نے بھی دلی زبان سے کچھ کہا پھر استاد نے شاگرد سے کہا۔“

استاد غصے سے ہونٹ چباتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ بس کے اندر ریکارڈنگ پر پابندی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میں سچ مچ ٹریفک سارجنٹ سے شکایت کر کے چالان کروا دوں گی۔ اگلے اسٹاپ پر کنڈیکٹر نے دروازہ کھول کر ایک لڑکی کو میرے ساتھ بٹھا دیا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ استاد کا چہرہ مسکراہٹ سے کھل گیا تھا۔

”دروازہ زور سے مت بند کرنا آپا۔“ کنڈیکٹر نے لڑکی کو یاد دلایا۔

”مجھے پتا ہے۔“ لڑکی مسکرا کر بولی۔ ”یہ خراب ہے اور روز کوئی نہ کوئی سواری زور سے بند کرے اس کو خراب کر دیتی ہے اور مستری پچیس روپے لے لیتا ہے، ہے نا؟“

کنڈیکٹر نے اپنے کالے سوڑھوں کی بھرپور نمائش جاری رکھی۔ لڑکی کی آواز بہت سریلی اور لمبہ نکلتی تھی۔ صورت بھی پیاری سی تھی وہ سفید لباس میں تھی اور کافی کم سن دکھائی دیتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ فرسٹ ایئر کی طالبہ ہو سکتی تھی۔ استاد نے ترچھی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے لڑکی سے اس کا نام، تعلیم، گھر کا پتا سب کچھ پوچھ لیا۔ وہ کچھ حیران تھی۔ نقاب کے اندر میری صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جب میں نے کہا۔ ”تم بہت پیاری لڑکی ہو۔“ تو وہ مسکرا دی۔ استاد کے خوبصورت چہرے پر بھی خوشی کے رنگ بکھر بکھر گئے۔ مارے خوشی کے اس نے دوسرا کیسٹ چلا دیا۔

”یہ شام اور تیرا نام دونوں کتنے ملتے جلتے ہیں۔“

میں نے ہاتھ بڑھا کر پھر بند کر دیا۔ مسکراہٹ کا فور ہو گئی۔ ”کیا ہے؟“ وہ غرایا ”یہ تو پاکستانی لفظ ہے۔ عالمگیر کا۔ اپنے عالمگیر کا۔“

”چلتی بس میں ریکارڈنگ پر پابندی ہے۔“ میں نے بھی ڈانٹ کر کہا۔ ”ایکسیڈنٹ کا خطرہ ہے۔“

”میں اتنا ناٹھی نہیں ہوں۔“ اس نے منہ پھلا کر کہا ”بڑی آئیں قانون دان۔“

میرا اسٹاپ آنے والا تھا۔ میں جانتی تھی کہ میرے اترتے ہی وہ پھر ٹیپ چلائے گا اس لیے میں ارم سے کہا ”اگر تمہیں گانے سننے کا شوق ہے تو تم گھر جا کر سن لینا۔ بس کے اندر کیسٹ نہ چلائے۔“

ایکسیڈنٹ سے پندرہ بیس جانوں کو خطرہ ہو گا اور تمہیں بھی زندگی بھر افسوس رہے گا۔“ میں نے استاد کی اچنتی نظر ڈالی جو منہ پھلائے تھوڑا سا سجائے سامنے دیکھ رہا تھا کسی معصوم بچے کی طرح۔ میرا اسٹاپ آنا اس نے روٹھے ہوئے انداز میں اپنائیت سے کہا ”بیٹھی رہو گھر چھوڑ دوں گا۔“

میں نے اترتے ہوئے ارم سے پھر کہا ”تم ابھی بہت چھوٹی ہو۔ اس قسم کی ملاقاتیں اگر تم اسٹاپ

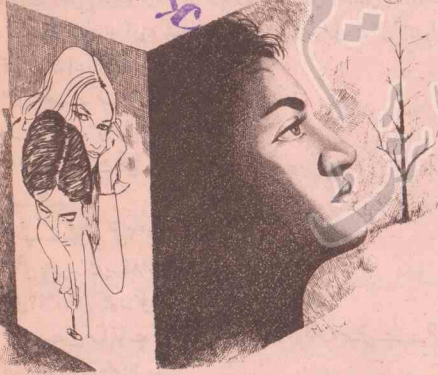
آئینہ کی پشت

آئینہ دیکھنے والی ایک ایسی عورت کافلان، جو کبھی نہ دیکھ سکی کہ اس آئینے کی پشت پر کیا ہے
ایک ایسے دست کی کہانی جس سے قدرتی بانی دیو کی مدد و درست کون تھا
وہ جو تنگیا یا وہ جو سب کچھ پگھلیا، اُچلے چڑھے، کڑھتے لائیفز والی کہانی



شکیلہ رفیق

Ukashaban & Bookbinders
Jinnah Chowk, Sukkur



جب محسن نے اپنی سفید ٹیٹا گھر کے باہر سرخ اینٹوں سے بنی روش پر روشی تو بائیں جانب بنے
اور صورت لان میں ایک عورت بیٹھی نظر آئی۔ وہ چائے کی پیالیوں کو درست کر کے رکھ رہی تھی۔ محسن
نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس کی سمت بڑھنے لگا۔
”جی اس سے ملو، میرا یا ر منظور اور کاظمی“ اور منظور یہ ہیں وہ محترمہ جنہیں میں اپنی گاڑی کا دوسرا

اپنے والدین کے سامنے کیا کرو تو تمہارے لیے بھی بہتر ہے۔ پوری قوم تمہاری احسان مند ہو گی اور
ہمیشہ سرکاری بس میں، ٹکٹ لے کر کیا کرو۔ سمجھیں۔ تمہاری اس ملاقات کے لیے بہت سے
تکلیف میں رہتے ہیں۔“ میں نیچے اتاری تو کنڈیکٹر نے بلی زبان سے کہا۔ ”تقریر کا بڑا شوق ہے۔“
استاد مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اچانک ضبط کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا
اس نے غرا کر مجھ سے کہا ”اب مت بیٹھنا میری گاڑی میں کبھی نہا۔“ اور ٹیپ پر ہاتھ مارا ٹیپ دو اور

ارم نے ہاتھ بڑھا کر اسے بند کر دیا اور میں نے چلا کر کہا۔ ”نہیں بیٹھوں گی۔“ اور پوری ملاقات
دروازہ بند کر دیا۔ دھڑاک کنڈیکٹر جو دروازہ بند کرنے کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اچانک سر پر ہاتھ
زمن پر بیٹھا گیا۔
”کئے بیچیں روپے۔“ اس نے کہا۔
”بلکہ زیادہ۔“ ارم ہارے نہی کے سرخ ہو رہی تھی۔

گاڑی ایک زنانے سے میرے سامنے سے گزری تو استاد کے چاکلیٹیں پال ہوا میں لہرا رہے تھے۔
کی سرخ چمک کی قیص پینے سے تر تھی۔ ”ہائے میرا محنت کش بھائی!“ میں ہارے نہی کے زین
گئی۔ کیسا منہ سوچا ہوا تھا بے چارے کا۔ اس کی ارم سے ملاقات بہت بے رنگ ہو کر رہ گئی تھی
شام کو ابانے مجھے آواز دی۔ میں تو دیر سے اس آواز پر نے کی تھک رہی تھی۔ آج ابانے کی عدالت
تھی۔ ہنسی کھنڈ بھر سے ابانے کے کمرے میں مجھ پر الزامات عائد کر رہا تھا۔ دوپٹے سے سر ڈھانک کر
سجیدگی ملاری کر کے میں خود کو صفائی پیش کرنے کے لیے تیار کرنے لگی مگر میں اپنے کیے پر ذرہ
نہ تھی۔ میں نے تو اپنا فرض ادا کیا تھا دراصل میں ہنسی کے ان خوبصورت چاکلیٹیں لہریے دار ہاتھوں
سر کو سلامت دیکھنا چاہتی تھی ”اے خون میں بھیجا ہوا دیکھنے کی مجھ میں بہت نہ تھی کیا ہوا جو آج
پاکل ہی ٹوٹ گیا۔ آئندہ تو وہ احتیاط کرے گا نا اور وہ لڑکی ارم بھی کافی سمجھدار اور فرض شناس
کل ہی اس کے گھر جاؤں گی۔ مجھے ہنسی کے چہرے پر وہ دلیرا مسکراہٹ بہت پیاری لگتی ہے۔

ایک بات اور بتا دوں اگر آج ہنسی نہ ہو تا کوئی دوسرا ڈرامیو ہوتا تب بھی میرا رویہ یہی ہو گا۔
فرض ہے نا۔



پہا کتا ہوں سرشانہ حسن! "حسن نے اپنی عادت کے مطابق مذاق کیا۔

"آداب! "میں نے ادب سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آداب! "وہ بھی مسکرائی اور بیٹھے کا اشارہ کیا۔ سب بیٹھ گئے تو حسن نے پھر غبی مذاق شروع کر دیا۔ وہ مستقل اپنی بیوی کے سامنے میرا ریکارڈ لگا رہا تھا اور میں مسکرا کر چپ ہو جاتا تھا کہ وہ اپنی دل سے بولا۔

"آپ، ہم لوگوں کو چائے وغیرہ ملانے کا ارادہ رکھتی ہیں؟"

"ہاں ضرور..... چائے تو تیار ہی ہے بس ایک پیالی اور لانا پڑے گی۔" اس نے کہا اور اٹھ کر چائے لینے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد منظور مجھ سے بولا۔

"بڑی فرمائیدار عورت ہے۔ شروع میں ہی میں نے اسے بتا دیا تھا کہ مجھے وہ عورتیں قطعاً پسند نہیں جو آفس سے واپس پر شوہر کو سرسراڑ اور منہ چاڑ حالت میں ملیں۔ جب ہی ہے وہ ہمیشہ تیار ہو کر کے ساتھ منتظر ہوتی ہے اور بھی جو کچھ میں نے کہا پیشہ اسی طرح کرتی ہے بھی تمہیں کیا بتاؤں کہ اچانک اس نے بات غصہ کر دی شانہ واپس آ رہی تھی۔

"میں منظور سے تمہاری تعریف کر رہا تھا۔" حسن نے کہا۔

"تو رک کیوں گئے۔" وہ خوشی سے بولی۔

"اس لیے کہ سامنے تعریف کرنے سے بیویاں مغرور ہو جاتی ہیں۔" حسن نے مزاح سے کہا۔ مسکراتے لگے۔

"آپ کے لیے شکر کتنی؟" شانہ نے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے کیا ہیں۔" میں نے فراخ دلی سے کہا۔

"جی؟؟؟" وہ شاید مجھ نہ سکی اور میرا منہ سکنے لگی کہ حسن بولا۔

"مجھ سے یہی کہنا آیا ہے جی تو ڈاکٹر ہونے کے باوجود شوگر کا مریض ہے..... تم ہر گز اس کی پرکاش نہ دہرائیں دو چھوٹے ڈال دو۔"

وہ ہنس کر دو چھوٹے شکر ڈالنے لگی تو میں نے احتجاج کیا۔

"یہ زیادتی ہے دو چھوٹے تو بتا ہی نہ چلیں گے۔"

"بھوس نہ کر دو چپ بیٹھے رہو۔" حسن نے ڈانٹ دیا مگر شاید شانہ کو میری مسکین صورت دیکھ کر آگیا اس نے ایک چھوٹے اور ڈال کر پیالی میری جانب بڑھا دی۔

"یاد رہے اچھی تو تمہاری بیوی ہے۔" میں نے کہا اور اس کا شکریہ ادا کر کے پیالی تھام لی پھر چائے کے ساتھ ساتھ باتیں شروع ہو گئیں تو حسن نے پھر میرا ریکارڈ لگانا شروع کر دیا۔ مجھے جواب تو ایک سے لے کر دینے آتے تھے مگر میرا انداز ذرا بے باک قسم کا ہوتا تھا اور شانہ سے یہ پہلی ملاقات تھی اس لیے لڑ رہا تھا کہ کوئی غلط بات منہ سے نہ نکل جائے جو اس کی بیوی کو ناگوار گزرے مگر جب اس کی باتیں حد سے بڑھ گئیں تب ایک موقع پر میں نے کہا۔

"یاد رہے جیسا لگور اور ایسی بیوی! سچی بات تو یہ ہے کہ تو ان کے قاتل نہ تھا۔" میں نے سارے حال کا جواب اس ایک جملے میں دے کر گویا حساب برابر کر دیا۔ حسن منہ پھاڑ کر نہا۔

"بلکہ رہے ہو؟"

"اور کیا کروں جب سے آیا ہوں بیوی کے سامنے ذلیل کیے جا رہے ہو۔" میں شانہ کو دیکھ کر بولا وہ ادنیٰ پھر میں نے حسن سے پوچھا۔

"لکنا عرصہ ہوا شادی کو؟"

"میں سال ہو گئے۔"

"اور رزلٹ ابھی تک نہیں نکلا؟"

"تم نے کیسے سمجھ لیا؟" حسن نے کہا۔

"ماہی کو دیکھ کر۔" میں نے کہا تو حسن بولا۔

"دوبار رزلٹ نکل چکا ہے اور اس وقت دونوں رزلٹ پارک میں گھوم رہے ہیں۔" حسن نے لہجہ کیا۔

"کیا؟؟؟" وہ سوچنے لگا۔ "میں حیرت زدہ رہ گیا۔ شانہ کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دو بچوں کی ماں

"یقین کیوں نہیں آ رہا؟" حسن نے تعجب سے پوچھا تو میں شانہ کی جانب انگلی اٹھا کر بولا۔

"اور یہ جسم اور دو بچے! بڑی ناقابل یقین سی بات ہے۔"

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرا انداز گفتگو بے باکانہ ہے اور یہ بات بھی غیر ارادی طور پر عادت کے تحت منہ سے نکل گئی۔ میں نے دیکھا کہ شانہ کی پیشانی عرق آ رہی ہو گئی ہے اور اس نے سر ہٹا کر ارادی کے تاثرات اس کے چہرے سے مٹا دیے تھے۔ میں نے شرمندہ سا ہوا کر بات بدلی۔

"یاد رہے تمہارے ساتھ تھا بتایا کیوں نہیں تھا مجھے بچوں کا؟" میں نے حسن کو ڈانٹ کر کہا۔

”بس.... میں یہی چاہتا تھا کہ تم شی کی تعریف کرو یہ بڑی خوش ہوتی ہے جب لوگ اس سے کہتے ہیں
”ارے آپ شادی شدہ ہیں۔؟ کیا وہ بچے بھی ہیں؟ بھی یقین نہیں آیا۔“ حسن نقل کرنے لگا تو میں
کہا۔

”مگر اس وقت تو کچھ ناراض نظر آ رہی ہیں۔“

”نہیں..... میں یوقتی کی بات میں نہ کرو۔“ حسن نے ہاتھ ہلا کر کہا اور بات آئی گئی ہو گئی مگر
حال مجھے اس کا اندازہ ہو گیا ہے کہ آئندہ مجھے شبانہ کے سامنے گفتگو کرتے وقت محتاط رویہ رکھنا
کیونکہ کھلی کر اور بغیر آئین کے بلاؤز کے باوجود اس کی سوچ خالصتاً ”مشرقی تھی۔“

اس ملاقات کے بعد میرا اثر ان کے ہاں آنا جاتا رہتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ میرے جانے کے بعد
حسن نے شبانہ کو ڈانٹا تھا کہ مذاق کی بات کا برا نہیں ماننا چاہیے کیونکہ شبانہ کئی بار گھبرا کر اس کا انکار
کر چکی تھی سب سے زیادہ مجھے اس کے دونوں بچے پسند آئے تھے ایسے بھولے بھالے بچے تھے کہ
اقتدار پر مارنے کو بھی چاہتا تھا۔ میں پہلے اسلام آباد میں رہتا تھا پانی گھروالے ابھی وہیں تھے۔ میں کراچی
شفٹ ہو گیا تھا اور جس روز میرے کلینک کا افتتاح ہوا۔ میں بہت ساری مٹھائی پھل اور بچوں کے
تھانف لے کر حسن کے گھر پہنچا۔

”آداب بھائی! شبانہ نے دروازہ کھولا تو میں نے کہا۔

”آداب! مگر..... آپ یہ سب کیا لیے آ رہے ہیں؟“

اس نے میرے ہاتھوں میں تھمے بنڈلوں کی جانب اشارہ کیا جن کی اونچائی شاید میری ٹھوڑی کو پہنچتی
تھی۔

”یہ بچوں کے لیے اور یہ آپ دونوں کے لیے۔“ میں نے تمام چیزیں میز پر رکھ دیں۔

”مگر کس خوشی میں؟“ وہ تعجب سے بولی تو میں نے بھی حیران ہو کر پوچھا۔

”حسن نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟“

”نہیں تو۔“

”کچھ بھی نہیں؟“ مجھے اب تک یقین نہ آیا کہ اتنی بڑی خوشخبری کو حسن نے کوئی اہمیت نہ دی تھی

”کہاں ہے وہ خبیث؟“ میں دانت پیس کر بولا۔

”نہاں رہے ہیں“ میں جا کر اطلاع دیتی ہوں۔“

وہ جانے ہی لگی تھی کہ حسن تویہ کر کے لیٹے آجودہ ہوا۔

”خانا۔۔۔! تو آپ آگئے۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔

”اوتے خاے ذیل ہیں آپ؟ ساری خوشی خاک میں مل گئی یعنی بھائی کو کچھ بتایا ہی نہیں اور بچوں کو
ارک روانہ کر دیا ہو گا کہ کہیں میری منوس صورت نہ دیکھ لیں۔“ میں بگڑ کر بولا۔

”ارے ارے.... ناراض مت ہو بھی بات تو سنو۔“ حسن نے کہا۔

”پھلو۔“

”ابھی ابھی آفس سے آیا تھا اب نہادھو کر اطمینان سے جانے کا ارادہ تھا کہ تم خود ہی طوفان میل کی
آؤ گئے۔“ اس نے کہا پھر شبانہ کو صورت حال بتائی۔

”بارک ہو۔“ شبانہ نے کہا تو میں خوش ہو کر بولا۔

”شکر۔ بھائی! چلتے اب جلدی سے اچھی سی چائے پلوا دیجئے اور بچوں کو بلوانے تاکہ جو بریت اس کی
ہے ہوئی ہے اس کا دوا ہو سکے۔“

اجانک مجھے حسن کی حالت کا احساس ہوا جو اطمینان سے صرف تویہ لیٹے کھڑا تھا۔

”دوہے پانی واوے یہ کس تہذیب کی جانب اشارہ ہے۔“ میں نے تویہ کی طرف اشارہ کیا۔ حسن ہنسنے
کا اور میں اپنی عادت سے باز نہ آیا اور پینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”انا کہ بھائی ہے کوئی تکلف نہیں مگر پبلک کا تو خیال کر لیا کرو۔“

”اچھا میں چائے بنا کر لاتی۔“

شبانہ جلدی سے باہر چلی گئی۔

”یار کیا کروں اس زبان کا جو میرے قابو میں نہیں۔“ میں ندامت سے بولا۔

”اچھا میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔“ وہ کمرے کی طرف جانے لگا تو میں بولا۔

”بچوں کو بھی بلالو۔“

کچھ دیر بعد چائے وغیرہ فارغ ہو کر میں نے بچوں کے ختے کھولے جنہیں پا کر بچے بہت خوش ہوئے
اور اچھل اچھل کر اپنے ختے دیکھنے لگے۔

”آپ نے بڑا تکلف کیا۔“ شبانہ نے مجھ سے کہا۔

”یار انھیں بتا دو ایسی باتوں سے میں تیار پڑ جاتا ہوں۔“ میں نے ناگواری سے حسن سے کہا جس پر
حسن اس سے بولا۔

”یہ تکلف بالکل پسند نہیں کرتا..... آئندہ ایسی بات نہ کرنا ورنہ خفا ہو کر آنا چھوڑ دے گا۔“ شبانہ

نے مجھے دیکھا میں نے تائید میں سر ہلایا تو مسکرا دی۔

”ویسے یہ تم نے یہاں کراچی آنے کا پروگرام کیوں بنالیا؟“ حسن نے مجھ سے باتوں کے پوچھا۔

”اخبارات کی اطلاع کے مطابق پاکستان میں آب و ہوا کے لحاظ سے سب سے بڑا شہر کراچی ہے یہاں مجھے ڈاکٹر بھی اچھا خاصا کام لیتے ہیں لوگ دبا کے بیمار پڑتے ہیں اور ڈاکٹر کا بینک بینکس اپنا کام بوجاتا ہے..... سو ہم بھی ادھر آگئے کہ ایک مکان تو بنا ہی لیں۔ بچی بات بتادی اب جو چاہو سمجھو۔“
”ویسے منہ دھور کھو کم از کم اس گھر سے تمہاری کوئی کمائی نہ ہوگی۔“
”خدا نہ کرے، مجھے یہاں کی کمائی چاہیے بھی نہیں دوست! میں غلوں سے بولا پھر دقا“ کہا۔
”غرض کو کوئی بیمار یا بچی تو تم جیسے تجویز سے پیسوں کی امید کس کا فرکو ہے۔“

”بھائی فرما آپ نے۔“ حسن ہنسا۔

”ایک پائی نہیں ملے گی۔“

مگر میں بھلا کیا جانتا تھا کہ مذاق کی یہ بات چند روز بعد حقیقت بن جائے گی اور میرا جان سے مارا دوست اتنا شدید بیمار پڑ جائے گا۔

ایک روز میں حسب معمول وہاں پہنچا تو حسن بستر پر لیٹا ہوا تھا اور شانہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”کیا ہوا؟“ میں ایک دم پریشان ہو کر بولا۔

حسن مسکرائے لگا۔ اور شانہ نے مجھے بتایا کہ آفس سے آئے تو سینے میں درد بتایا اور ہلکی ہلکی بھی ہو رہی ہے۔ وہ بے حد فکر مند اور پریشان معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے حسن کی نبض دیکھی اسے اس سے حرارت بھی تھی۔

”یہ کیفیت کب سے ہے؟“ میں تشویش سے بولا۔

”بس آج ہی ہوئی ہے۔“ حسن نے کہا۔ ”میں تو روز بونی آتا تھا وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”میں ابھی اپنا کس وغیرہ لے کر آتا ہوں۔“

”پاگل ہو گئے ہو کیا؟ کل آتے وقت لیٹے آنا ایسا کیسا بڑی ہے، کون سا میں شدید بیمار ہوں۔“

”میرا ہوا کچھ کچھ بھٹکا چاہا مگر میں ہاتھ چھڑا کر بولا۔

”تم تو سدا کے بے پروا ہو..... بیماری کی اگر ابتدا میں ہی دیکھ بھال کر لی جائے تو وہ کبھی تشویش کا

اعتبار نہیں کرتی..... لہذا آپ چپ چاپ پڑے رہیں تو بہتر ہے۔“

اس نے اسے جھڑک دیا تو شانہ مجھ سے بولا۔

”اب ہاں آپ چاہیے یہ تو ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔“

اس فوراً ہی چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد میری واپسی ہوئی۔ میں نے دیر تک حسن کا معائنہ کیا مگر کوئی لڑکی بات نہیں تھی۔ میں ہنس کر اس سے بولا۔

”احول والا قوتہ! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ بات کچھ بھی نہیں بس یوں لگتا ہے کہ کچھ تھکن زیادہ ہے اور بھائی، آپ بھی مت گھبرا سیں کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔“

”انہ نے تمہیں تن کی سانس لے۔ حسن نے منہ دونوں کو دیکھا اور خشکی سے بولا۔

”میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا ٹھیک ٹھاک ہو کر آپ دونوں خدا جانے کیوں خود کو اس قدر غفلت سمجھتے

احول پر سکون ہوا تو مجھے چائے کا خیال آیا اور میں نے شانہ سے چائے کے لیے کہا۔ وہ چائے بنانے

لگا یہ سکون بڑا عارضی ثابت ہوا چائے پینے کو کیا ہوا کہ وہ روز بے روز کمزور ہوا گیا اور آخر بستر سے

کھائیں خود بھی پریشان تھا مگر اپنی پریشانی چھپا کر شہنہ کو تسلیاں دیتا رہا جس کی حالت حسن سے بھی بدتر

تھی معلوم تھا کہ ان دونوں میں کتنی محبت ہے یہی وجہ تھی کہ میں شانہ سے ہمیشہ پوچھتا کہ پریشان

کی ضرورت نہیں، بس عرض پکڑیں آجائے پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا مگر میری تسلیوں کے

بجائے اب اس کی طبیعت کسی طرح نہ سنبھلی تو میں نے ایک روز شانہ سے کہا۔

”بھائی خیال ہے حسن کا معائنہ کسی اسپیشلسٹ سے کرایا جائے۔“

”اب یہ آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔“

”جائے فوراً تائیڈ کی مگر حسن نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور بولا۔

”میں تمہارے سوا اور کسی کا علاج نہ کراؤں گا۔“

”علاج کرنے کو کون کہتا ہے صرف مشورہ کرلو۔“ تفتیش اس کی ہوگی مگر وہ اور وغیرہ تو میں ہی دوں گا۔“

”میں سمجھا مگر حسن نہ مانا۔

”ار نہیں! میں ان باہر امراض سے بڑا گھبرا ہوا ہوں..... طرح طرح کے تجربے کر کے کل کے مرے

ان مار دیتے ہیں۔“

میرا جانا نامکن تھا اور یوں بھی میں شبانہ کا دیران سا چہرہ اور بچوں کو لکنا نہ دیکھ سکتا تھا۔ بچوں اور گزرتا گیا حسن کی جوان موت کا غم گہرا ہو گیا۔

والدہ کے چہلم کے بعد میں نہ جانے کس طرح حسن کے گھر پہنچا بہت دیر تک گم سم بیٹھا اور الفاظ نہیں مل رہے تھے جن سے میں شبانہ کی دلچسپی کرنا کھو بیٹ کر ہستی بالکل اچانک چھڑا زبان یونہی ساتھ بھوڑ دیتی ہے۔ کچھ دیر بعد ملازم دونوں بچوں گنار اور عشرت کو لے کر آیا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور میں انھیں گود میں بٹھا کر آہستہ آہستہ ان سے باتیں کرنے لگا اور شبانہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس کے بعد میں اکثر وہاں چلا جاتا شبانہ تو کم صبح ہی رہتی میں بچوں کو باغ میں شلا کر لے آتا ہوں کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ میں وہاں نہ جاسکا آخر ایک روز شبانہ کا فون آیا کہ بچے مجھے باہر ہیں۔ میں وہاں گیا تو وہ مجھے پہلے سے بھی کرکڑ نظر آئی۔

”اپنی صحت کا خیال رکھا کریں آپ دن بے دن کرکڑ ہو رہی ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ اداسی دی۔ میں زیادہ دیر گھر میں نہیں رہا اور بچوں کو گاڑی میں بٹھا کر سیر کرانے چلا گیا۔ اس کے بعد وہ بے لگا نہیں جاتا اور بچوں کو لے کر سیر کرانے چلا جاتا واپسی پر چند منٹ شبانہ کے پاس بیٹھتا اور اسی طرح اس سختی زندگی کے سچے ماہیت گئے پھر ایک دم ہی میں نے محسوس کیا کہ میرے اس

دہاں آنے جانے سے اس کے محلے والے مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں لہذا میں نے آواز کر دیا جب وہ فون کرتی کہ سچے بہت یاد کر رہے ہیں بس جیسی جاتا۔ اس پر بھی محلے والوں کی ہنسی میرا پیچھا کرتی۔ میں جھنجھلا سا گیا اور کافی دنوں یعنی تقریباً ایک ماہ تک وہاں نہ گیا۔

آخر ایک روز اس کا فون آیا کہ گنار مجھے یاد کر کے تیار ہو گئی ہے۔ میں وہاں گیا آج مجھے ہو رہا تھا کہ کیوں بچوں کو خود سے اس قدر مانوس کیا لہذا میں نے غیر اداری طور پر شبانہ سے سراہا کیا۔

”آپ بچوں کو میرے بغیر رہنے کی عادت ڈالیں۔“

”اور آپ کے خیال میں اتنے روز سے کیا کر رہی تھی؟ کوشش کی تھی مگر۔۔۔۔۔“

وہ بھی غالباً حالات کو پرکھ رہی تھی ورنہ گنار کے تیار پڑنے سے قبل ہی فون کر دیتی۔ اس چند روز مسلسل مجھے گنار کے علاج کے لیے جانا پڑا اور اتنے دنوں میں میں نے اندازہ لگایا کہ اس سے اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ اب میرا ان کا وجود ایک ہو گیا ہے ان سے علاحدگی نامکن ہے۔

میں پر دیکھا کہ اس کا تو صرف ایک ہی حل تھا۔۔۔۔۔ شبانہ سے شادی! مگر کیا وہ رضامند ہو جائے گی؟ اور میں کیوں اتنی بڑی قربانی دوں؟ لیکن کبھی وہ مجھے بری بھی نہ لگتی تھی۔ میں نے کافی عرصے اس پر سوچا اور آخر ایک روز بہت ہی محتاط انداز میں اس سے شادی کی پیشکش کی وہ ہنسے سے قہر قہر لگی اور جو کچھ منہ میں آیا مجھے سنا ڈالا۔ میں خاموشی سے اس کی ہر بات سنتا رہا پھر بڑے تحمل سے

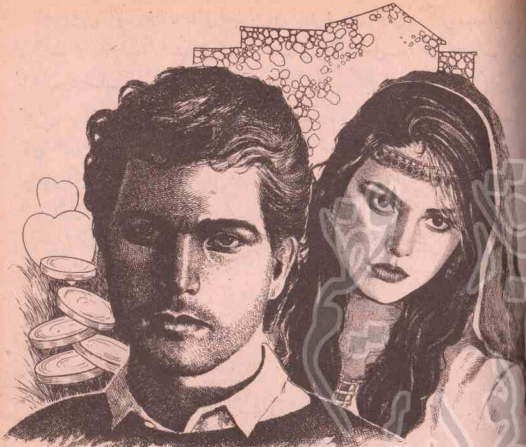
کہا کچھ بھی میں نے کہا ہے کسی بری نیت سے نہیں بلکہ بلکہ آپ کے بچوں کے خیال سے کہا۔۔۔۔۔ تمہاری فکر خود کھینچے گا مجھے آپ سے زیادہ خوبصورت جوان اور کنواری لڑکی مل سکتی ہے لیکن میں صرف بات کے نالے آپ کو اپنا نا چاہتا ہوں صرف ان بچوں کے مستقبل کے خیال سے۔۔۔۔۔ اگر جواب نفی تو یہاں تک مجھے نہ بلائے گا خواہ بچے کتنی ہی ضد کیوں نہ کریں۔۔۔۔۔ کیونکہ دنیا والوں کی بچتی نگاہیں مجھے غار کی طرح کھنکھنے لگی ہیں۔۔۔۔۔ آپ تو گھر کے اندر رہتی ہیں آپ کو نہیں معلوم باہر لوگ کیا باتیں ہیں اور یہ بات میرے لیے اتنی نقصان دہ نہیں جتنی آپ کے لیے ہے۔۔۔۔۔ اور بچوں کو حسب عادت لے چلا گیا۔

اگر وہ روز بھی آیا جب شبانہ نے مجھ سے شادی کی ہامی بھری شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ میں اس کی ضرورت بن گیا ہوں۔ یوں ہم شادی کی بندھن میں بندھ گئے۔ یوں بھی اب شبانہ کا دو بچوں دان میں کوئی اور نہ تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے کی بات ہے کہ شبانہ اپنی کسی دوست کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ مجھے کچھ روپوں کی ضرورت پڑی میں الماری میں روپے تلاش کر رہا تھا کہ ایک سفید ڈائری میرے ہاتھ لگ گئی۔ شوہروں کی لاش نے میرا ہمارا اور میں اپنا کام بھول کر ڈائری پڑھنے بیٹھا تھا۔۔۔۔۔

اب جب انھوں نے مجھے اپنی باتوں کے حصار میں سمجھنے کہا کہ ”میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ دونوں کی دنیا میں دو شادیاں ہوتی ہیں ان بعد قیامت جنت میں اپنے دونوں شوہروں میں سے کسی انتخاب کرنا ہو گا تو جی تم کس کا انتخاب کرو گی۔“

ابھی انکھوں میں یاس ’امید‘ التجا حسرت اور ہلکی سی دھمکی کی جھلک بھی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آتا تو مجھے کبھی حسن نے بھی نہ چاہا ہو گا یقیناً وہ میرے مستحق تھے حسن نے ایک منہ بند کلی اپ کیا تھا جبکہ منظور نے دو بے سارا بچوں سمیت ایک محلے ہوئے پھول کو اپنے کارل میں لگایا تھا۔ لڑائی ہی مگر مر وہ بچوں کی طرح ضد کرتے رہے اور آخر مجھ سے اقرار کر کے ہی چھوڑا کہ جنت



ہم رنگ

کرم کھرکی نہی کار کیکو کراں آنکھوں میں جگمگ جھلسلا اُٹھے
حقیقت سے قریب نہ رہ، کب اف بہت سی محبتیں کی قلمی کھول گئی اور وہ جو
پہنڈی وہی طرح کھیریں پسند لایا کرتا تھا، دم بخود رہ گیا



زاہد پروین



میں وہی میرے ساتھی رہیں گے۔ ان کا اس طرح ٹوٹ کر چاہنے کے انداز پر مجھے وہ دن یاد آتا ہے۔
انہوں نے مجھ سے شادی کے لیے ڈرتے ڈرتے کہا تھا اور میرا غصے سے برا حال ہو گیا تھا۔ جی ہاں
ہے کہ انہوں نے میرے لیے بڑی قربانی دی ہے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا بلکہ اپنی کھوئی ہوئی
دوبارہ پالی ہیں وہ جو انہیں خویصورت ہیں انھیں کوئی بھی تنواری لڑکی با آسانی مل سکتی تھی مگر انہوں
اپنے بارے میں کچھ بھی نہ سوچا اور مجھ جیسی عورت سے شادی کر لی جو کوئی چھوٹی لڑکی نہیں بلکہ وہ
کی ماں اور ایک عورت ہے صرف اس کی سلگتی تھانویں اور مجبور جوانی کا خیال کر کے، اس کے
رحم کھا کے، میں ان کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی یوں بھی میرے دل میں ان کی بڑی
تھی کہ انہوں نے حسن کی زندگی میں ہمیشہ میرا لحاظ کیا اور بے حد خیال رکھا اور دوسرے یہ کہ حسن
انتقال کے بعد انہوں نے پورے غلوس اور بے غرضی سے ہمارا ساتھ دیا۔ گناہ اور عسرت تو ان کے
رہ ہی نہ سکتے تھے۔ شادی کی وجہ ابتدا میں تو یہی سچے اور ان کا مستقبل تھا مگر اب مجھے بھی ان سے
محبت ہو گئی ہے۔ وہ کتنے عظیم انسان ہیں میں ان کے احسانوں کے بوجھ سے تب دب چکی ہوں وہ میرے
ہیں۔۔۔۔۔ حقیقی محسن! انھیں بہتر سے بہتر رشتہ مل سکتا تھا کیونکہ ان کے پاس حسن ووجاہت کے
روپے پیسے کی بھی کمی نہ تھی مگر انہوں نے صرف اپنے عزیز دوست کے بچوں کے خاطر ایثار سے
تھا اور جھوٹا کھانے پر قناعت کر لی تھی کتنے عظیم انسان ہیں منظور! بچوں کو حسن سے بھی زیادہ ہمارے
اور مجھ پر تو پروانوں کی طرح نثار ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کی محبت و عظمت کی جڑیں میرے دل میں دوڑ
گہری ہوئی چلی جا رہی ہیں۔ ابتدا کی بے رخی اب دم توڑ چکی ہے۔ میرا اب کچھ وہی ہیں۔۔۔۔۔
محبت کے خاصا خاصا ہارے سمندر میں گلے گلے ڈوب چکے ہوں۔۔۔۔۔ منظور کاظمی! میری محبت۔۔۔۔۔ اور
معصوم بچوں کا سہارا۔۔۔۔۔!

میرا شبہ سمندر کی پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ یہ ڈائری شانہ کے ماضی کی کسی بھول سے
میری ہی محبت کے ذکر سے بھری پڑی ہے اچانک آہٹ ہوئی شانہ میرے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی
”ہوں! تو آپ جو رہی ہیں۔“ اور وہ مجھ سے پلٹ گئی اس کے چہرے پر پیار ہی پیار تھا اور اس
اس بے پناہ پیار کے اظہار سے خوش ہونے کی بجائے میرا منہ احساس جرم سے لنگ گیا۔
شانہ! جس پر پہلی نظر پڑتے ہی میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس عورت کو ہر قیمت پر حاصل کر
اور اب میں اس کے کیسے بتاؤں کہ اس کے شوہر کی موت کا باعث میں ہوں۔

”ہری بھری“ ایک چھوٹا سا پھاڑی قصبہ جس کی آبادی چند ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ ایک اور صحت افزا مقام ہے اگر اسے مری کا بدل کہا جائے تو زیادتی نہ ہوگی۔ دو اسکول ”دوبارک“ سا کلب، چند صاف ستھرے ہوٹل، بازار، پولیس اسٹیشن، دستکاری کا اسکول اور مسجدیں۔ یہ تھا ہری بھری کا کل اُمیاد، دور تک بکھرے ہوئے، دھولان چھتوں والے چھوٹے مکان، کشادہ سڑکوں کے نیچے ہوئے چال، درختوں کی بلند شبنیں میں پھینے الیکٹرک پولز میں گی روشنیاں اگلی ٹیپ لائٹس، وائر لائیو کا مناسب انتظام اور پانی کے نکاسی کی جتنہ تالیاں... ملنار لوگ، روشن چہرے، صحت مند بچے۔ حکومتیں اس قصبے پر کچھ زیادہ مہمان رہی تھیں اور وجہ تھیں، جنہوں نے مجھے ہری بھری کا عاشق زار بنا رکھا تھا۔ سال کے دو مہینے مارچ اور اپریل میں طور پر یہیں گزارنا پسند کرتا تھا۔

بہر حال خوبصورت گزرا تھا۔ خوب گھوم گھما کر تروآزہ اپنے ماحول میں واپس لوٹا تو یہاں ایک سورج حال کا سامنا کر پڑا۔ میری دونوں پیویوں میں گھمنان کی جنگ جاری تھی۔ میری والدہ نے دونوں کی دونوں مامرا سارا دلن اور بسا اوقات راتوں کو کبھی اٹھ کر دو مختلف محاذوں پر ڈٹ جاتی ایسے ایسے الزامات کی گولا باری ہوتی ہے کہ کان بڑی آواز سناتی نہیں دیتی۔ وہ تو غنیمت ہے کہ اور وسیع و عریض حویلی کی ہے ورنہ پوری کو گھٹھ سنے۔

خرید تھا جس کے اندر بنا ہوا کچھ اینٹوں کا کٹاوا مکان تروا کر انھوں نے ایک جدید طرز کا کھانا
 خوبصورت بنگلہ بنوایا تھا اور جب آتش جوان تھا تبھی باباجان تو اس بنگلے میں یاران خوش مذاق کی
 بنایا کرتے تھے۔ والدہ کو کبھی خبر بھی نہ ہو سکی کہ اس بنگلے میں ان کی کتنی سوکھیں کتنے عرصے
 رہی ہیں اور رہ چلتی ہیں۔

جوان ہونے پر میں نے اباجان کے اس ”رنگین شوق“ کی داستانیں اسی بنگلے کی نگرانی کر لیں
 بنائے ملازموں سے کتنی تحسین مگر خیر یہ ہوئی کہ میرے بڑے ہوتے ہوئے باباجان خود بخود ہی
 حرکتوں سے تائب ہوتے گئے۔ اور بالا تر اس زمانے میں جب انھوں نے کیے بعد دیگرے میری
 بہنوں کی شادیاں کر دیں اور پھر سولہ برسوں کی عمر میں ہی چکڑو کھڑو کر میرے فرض سے بھی
 دگنے توجہ کرنے چل دیے۔ بعد ازاں مقدار کچھ اس دھب سے جا لگا کہ وہ پورے یہ عمارت
 کرتے چلے گئے چنانچہ اب تک وہ سات جگہ اور ادا کر چکے تھے اور آٹھویں کی تیاری تھی۔

ہری بھری کے چھوٹے سے بازار سے گزرتے ہوئے اچانک مجھے ایک شدید قسم کے چھٹا
 آن گھیرا۔ سارچ واپریل کی محنتی ہوئی رت میں آنے والے کو جون کی چٹاپائی ہوئی دوپہر کی کھڑکی
 ماحول پر گرد و غبار کی چادر تھی۔ ہر طرف بے کیفی اور خاموشی کا راج تھا۔ میں نے وہیں سے
 رخ سول باپٹل کی طرف موڑ دیا۔ وہاں کے میڈیکل آفسر سے میری گامی جھتی تھی اور میں
 اس کے ساتھ کپ شپ لگا کر اپنا موڈورن کرنا چاہ رہا تھا۔

ڈاکٹر سین سے مل کر میری ساری کوئی حقیقتاً جاتی رہی۔ بلند و بالا رنگ پر تنوں اور رنگ پر لگی بالوں
 تباہی نے مری طبیعت پر اچھا اثر ڈالا۔ میں نے وہیں سے بنگلے کے انچارج کو اپنے چہنچہ کی اطلاع
 دی تھی اور جب ڈاکٹر سین سے رخصت ہو کر باہر نکلا تو موڈ انتہائی خوشگوار ہو رہا تھا۔ زیر لب
 ہونے میں نے گاڑی انٹار کی سین اس وقت میرے دل و دماغ میں ایک عجیب سا احساس
 بے نام احساس کے زیر اثر میں نے ذرا سا گردن موڑ کر دائیں جانب دیکھا پھر دیکھا ہی رہ گیا۔ دل
 سینے میں دھڑکتا بھول گیا تھا۔

وہ بے حد خوبصورت اور مسرور تھی۔ سر سے پاؤں تک سیاہ برقع پہنے ہوئے جس بے پناہ بے پناہ
 والہ انداز میں نقاب چہرے سے سر کا کر میری طرف لپکی تھی، میں اپنی جگہ میں سارہ گیا۔ بس یوں
 ہوا تھا جیسے بدلی کی اوٹ سے بجلی سی گونگئی ہو۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفقود ہو کر رہ گئیں۔
 کے چہرے سے نکلنے شوق اور وارفتگی نے مجھے حیرت و دمست کے عجب احساس سے دوچار کر دیا۔
 دکھائی دے رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہتا چاہ رہی ہے۔ چال مستانی اور چہرے پر بے ساختہ پن تھا۔

انداز میں لپکتی آ رہی تھی جیسے ارد گرد کے ماحول سے غافل ہو گئی ہو۔
 ایک ہنگامہ سا لگا اور میں تپ کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔
 اس وقت دھماکوں کا ایک غول شور مچاتا ہوا اندر سے نکلا۔ وہ لوگ کسی بات پر زور زور سے
 ہمارے درمیان آ گئے۔

سائے سے بھی کم وقفے میں اس حور شائکل نے نقابیں در دست کیں۔ چاند سیاہ بدلیوں کی اوٹ میں
 بھر میں نے اسے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ راست تبدیل کر کے مین گیٹ کی طرف جاتے دیکھا۔
 جانب مڑ رہی تھی۔ میری گردن بھی غیر ارادی طور پر ادھر ہی گھومتی جا رہی تھی۔ گیٹ سے
 دل باپٹل کی متوازی سڑک پر چل دی۔ سڑک نسبتاً بلندی پر ہونے کی وجہ سے وہ اب تک
 تھی۔ اچانک اس نے پیچھے گھوم کر نقاب دوبارہ اٹنے اور غور سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں
 انھوں کی طرح ادھر ہی دیکھ رہا تھا مگر دیکھتی ہوئی وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو مجھے ہوش
 نے بجلی کی سی تیزی سے اسٹیج تک سنبل لیا۔ وقتی طور پر مجھے اس کے سوا کچھ نہیں یاد رہا۔ ادھر
 دھماکوں کے سائے میں سستانے کے لیے بیٹھے ہوئے مریض چونک کر اچھلتی ہوئی گاڑی کو دیکھنے
 لگا۔ میں بے پروا تھا۔

آخری سرے پر مجھے وہ لڑکی جاتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی رفتار بے حدست تھی یا پھر
 آنے والی تیز ہوئی اس کی راہ میں مزاحم ہو رہی تھیں۔ گرد آلود جھونکوں سے اس کا برقعہ
 ہلچل رہا تھا۔ گری سبز رنگ کی شلوار کے پائپوں سے نیچے سیاہ چٹل میں اس کے شفاف پیروں
 وہ رہ چک جاتی تھیں۔ میرے دل کی عجیب حالت تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بچے کو اس
 کو ملو دکھا کر کسی بے درو نے لیکھت ہاتھ پیچھے پیچھے لیا ہو۔ میں نے دانستہ طور پر دوبارہ بارن دیا مگر
 مڑ کر نہیں دیکھا۔ غالباً چار دھماکے اسے میری قوت برداشت کا امتحان مقصود تھا۔ میں نے اس کا
 لیا اور زن سے گاڑی آگے نکال لے گیا۔ منٹوں کا فاصلہ لحوں میں طے کرتا اوپر سے چکر لگا
 لڑکیاں خراماں سامنے سے چلی آ رہی تھی۔ مجھے یوں سامنے سے آتے دیکھ کر وہ قدرے بدحواس
 تھی۔ جلدی جلدی نقاب برابر کرنے لگی۔ میں مونچھوں کے اندر ہی اندر مسکرا کر رہ گیا۔ اب
 دور کیا۔ اس نے ہاتھ میں رول کیا ہوا کاغذ پکڑ رکھا تھا۔

بال آغا اس کی طرف سے ہوا تھا اس لیے میں شیر ہو رہا تھا۔ سورج ٹھیک سروں کے اوپر چمک رہا
 سڑک میاں سے وہاں تک سنسان پڑی تھی۔ میں نے اسپڈ بڑے نام کر کے اسے گھونٹا شروع
 اس کے قدم واضح طور پر اٹلے سیدھے پڑنے لگے تھے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف کا

دروازہ وا کر دیا پھر اس وقت جبکہ گاڑی اس سے قریب ہوتے ہوئے تقریباً تھم سی گئی تھی میں حد اسٹائل سے سگراتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اسے سلام کیا۔

لیکن..... میرا سلام اور تاملت کو شش..... جیسے اس کے سر پر سے گزر گئیں۔ وہ بڑی بے لالی ساتھ کھٹ کھٹ کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی گئی اور اس کی نگاہیں میرے سلام اور میری مسکراہٹوں کی بجائے گاڑی کے پیروں پر جمی تھیں۔

اس کی بے التفاتی پر میں ہنسا کر وہ میٹا کر اب میرے کھولنے سے کیا ہو سکتا تھا! بھلا وہ مردہ یا بارے؟ میں نے وہیں سے ٹرن لیا اور یہ پروا کیے بغیر کہ کوئی دیکھنے والا کیا کے گا کچھ آگے جا کر آہستہ کر دی۔

اب پوزیشن یہ تھی کہ تنہا اور دیران روڈ پر گاڑی آگے اور لوٹی پیچھے چل رہی تھی۔ گویا میں اس کا اتنا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ خاصی پریشان اور متوحش سی نظر آ رہی تھی۔ بیک مر میں اس کو دیکھ کر مجھے ہنسی آ رہی تھی۔ اس نے اب دونوں نقاب گرالے تھے اور ہر قدم کے دونوں گوشوں سے پکڑ کر رکھے تھے کمروں کی جھلکتی ہوئی دوسرے اندر نما جھونکے مجھ سے بھی زیادہ آواز کی لگ رہے تھے۔

اچانک سڑک تھم کر دائیں جانب مڑ گئی۔ میں شش و پنج میں تھا کہ کدھر مڑوں دغت اس نے قدم بڑھا کر سامنے والے مکانوں کی قطار کے پہلے مکان کی کال تکل بادی۔ میں نے سکون کا سانس اٹھا لیا۔ میرا مقصد حل ہو چکا تھا۔ میں نے وہیں سے پھٹکے کی راہ لی۔

آج کا خوبصورت سانحہ میرے لیے اپنے اندر بے حد کشش لیے ہوئے تھا۔ یہ ضرور تھا کہ امیر و کبیر زمیندار پاپ کا بیٹا تھا۔ دولت میرے گھر کی باندی تھی لیکن دل کے معاملات میں یہ اور مفلس تھا۔ میرے بابا جان بے چارے میری اس مفلسی اور ناداری کو کیا سمجھتے لیکن یہ حقیقت واردات حسن و عشق میرے مقدر سے کچھ یو نہی رو بھی رہتی تھی جیسے بے چاند کی راتوں سے اہل محرمی کی سب سے بڑی وجہ میرا چو کھنا تھا۔ خبر نہیں اللہ میاں نے کن جلد بازی کے لحاظ میں مجھے۔ بس یو نہی معلوم ہوتا تھا جیسے مٹی کے ایک بیغوی ڈھیلے میں دو بھٹی اسٹیکس ایک پکڑا دیں پھیلے پھیلے ہونوں والا چوڑا سا بدنہ اور لمبے لمبے کان لٹکا دیے ہوں اوپر سے رنگت بھی سادہ۔ یہ ہے کہ بعض تنہا راتوں میں مجھے خود آئینے میں اپنی صورت سے بیزار ہوتی رہتی تھی۔ ایسے میں اندام حسین ڈھیل لڑکیاں میری طرف کس طرح متوجہ ہو سکتی تھیں! یہ تو بجائے خود ایک مسکراہٹ ہوتی اور میری سبب تھا کہ میں بیشش ایک شاندار گاڑی کا خواہشمند رہا۔ جس میں بیٹھ کر میں دیکھتا

لی صورت کی بجائے امارت سے مرعوب کر سکوں لیکن بابا جان میرے خیالات سے لاعلم تھے۔ ان کی طرح تو میں چاند کا ٹکڑا تھا اور مردانہ وجاہت کا حسین شاہکار۔!

اور اب..... جبکہ میری دیرینہ خواہش کروا کی صورت میں پوری ہوئی تھی میں ایک خوبصورت اردات کا کشاکش ہو چکا تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی یقیناً مجھ سے کچھ اچھا چاہ رہی تھی مگر یہاں وہاں دہائیوں کا جو میں وقت پر کباب میں ہڈی بن کر وار دے ہو گئے تھے۔ میں تمام دہائیوں کو دھکیل دیا۔ جس کو فٹ اور بے پناہ بھلاہٹ کے عالم میں نے ہری بھری کار چڑھایا تھا۔ وہ تمام کیفیات یکسر مٹ چکی تھیں بلکہ اب تو میں ان سعد و نیک فیوض کو دعا میں دے رہا تھا۔ یہی تھا جو کدھر سے نکلا تھا۔ دل میں نے نئے نئے ارمان اور ولولے جاگ رہے تھے۔ ان جذبات اور احساسات کا تعلق صحیح معنوں میں میری نا آسودہ روح سے تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ بی زمانہ ایسے افراد کم ہوں گے جیسا میں ہوں۔ ماں کے بعد مجھے پانچ صرف کے بعد اسے اپنی دونوں بیویوں سے ملا۔ ممکن ہے میری بیویوں کو بھی مجھ سے زیادہ میری دیکھی شہری جاندار اور بے نیلنس سے دلچسپی رہی ہو کیونکہ وہ دونوں جس طرح آگے پیچھے میری زندگی میں شامل کی گئیں وہ اپنے خود دلچسپ سانحہ ہے اور آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہو گا بلکہ شاید یہی بھی آئے کہ میری پہلی بی بی جان کی سبب تھی اور دوسری والدہ صاحبہ کی سبب تھی۔ میں مشکل سترہ برس کا تھا کہ بابا جان لپٹا کر بی بی سے نکلتے آئے لیکن جب انھوں نے والدہ کے سامنے میرے ساتھ اپنی بیٹی کا نام لیا تو وہ ایک اہل ہتھ سے اکھڑ گئیں۔ خبر نہیں کب سے اپنی بھانجی کو اس گھری ہوئی دیکھنے کا ارمان لیے بیٹھی تھیں۔

حال دونوں میاں بیوی میں شہن گئی۔ میں مزے سے چھپ چھپ کر ان کی خندیں اور تکرار سنا کرتا۔ درمیان میں دخل دینے کے اجازت نہاں تھی بھلا! میں ایسی خاص ضرورت بھی نہیں سمجھتا تھا۔ میدان بابا جان کے ہاتھ رہا اور والدہ رودھو کر خاموش ہو رہیں لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور میری شادی کو سات برس کا طویل عرصہ بیت گیا مگر والدہ کی گود پو پو کی کے لیے وہاں رہی۔ وہ جب باوجود بی بی تین پانچ بیویوں کو سکینوں صلواتیں سنا کر رکھ دیتیں مگر اس نیک بخت نے بھی آہ تک منہ نہ نکالی۔ اتنی لمبی مدت کے بعد بابا جان بھی چونک اٹھے۔ والدہ کے قاتلے اس لیے بھی جاری و ساری کہ سوئے اتفاق وٹے نے کی قدیم رسم کے طفیل ان کی بھانجی ابھی تک والدین کے گھنے سے لگی بیٹھی اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں دو دعوہ بیویوں کا بے تاج سراج نکلا۔

لیکن یہ اب میری ڈھیٹ مٹی کو کیا کیا جا نا کہ بابا جان اور والدہ کے لیے پوتے پوتیاں پھر بھی مہمانہ لیکن لطف کی بات یہ تھی کہ میں ان دو شاہیوں کے طفیل ہر قسم کی باز پرس سے بچا رہتا تھا۔ چنانچہ

جب بھی سونے آنگن اور خالی گود کا تذکرہ نکلتا والدہ کو بابا جان کی بھیجی اور بابا جان کو والدہ کی ہر شکایت پیدا ہو جاتی تھی۔

لہذا ایسی صورت حال میں اس امتحان اور پرکشش لڑکی کا مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا یقیناً میرے باعث مسرت اور بڑی حد تک نعمت غیر متوقع تھا۔ خیالی گھوڑے دوڑانے کا موقع ملا تو میں اس کے متعلق سوچتا رہا اور اس عمل میں مجھے خود بخود ایک اونچی لذت اور شدت آفریں سرور محسوس پہلے تو جی میں آئی کہ ڈاک بنگلے کے چوکیدار سے مدد لی جائے کیونکہ وہ یہاں کا قدیم باشندہ تھا اور بھری کے ہر فرد سے واقف رہا ہو گا مگر پھر میں نے از خود یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ جب وہ بابا جان کے سرگزشت مجھے سنا سکتا تھا تو پھر میری دلچسپیوں کا داستان ان کے گوش گزار کر دینے سے اسے کون سا تھکا تبکہ میں کسی طرح کا رسک لینے کے موافق قطعی نہیں تھا۔

زرا ماقبہ تھا۔ کون یہاں کس سے چھپا ہوا تھا۔ دو روز کے اندر ہی میں نے اس حسین لڑکی کو آنکف معلوم کر لیے اور یہ معلوم کر کے بچہ اپنی ہی ہوئی کہ وہ ایک علم دوست گھرانے سے تھی اور خود بھی مقامی اسکول میں پڑھاتی تھی۔ دو گھنٹوں کی خاموشی تھی۔ جس میں ایک تو میرا دور سرا شادی شدہ۔ گویا وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے ماضی حال اور مستقبل کا کل سرمایہ علم کرتا تھا۔

دل بیتاب کے ہاتھوں تنگ آکر میں پھر کوچہ و جانان میں جا پہنچا۔ یہ اونچائی پر آباد ایک خوبصورت اور صاف ستھرا علاقہ تھا۔ کھلی کھلی کشادہ زمینیں اور دور دورے ہوئے مکانات کے ساتھ میں وہ رہتی تھی سرخ سی اینٹوں کی بنی خوشنما وہ منزلہ عمارت تھی۔ بالائی منزل کے برآمدے سنہارے تھے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ باہر سے احساس نہیں ہوتا تھا کہ اندر آبادی رہی ہوگی۔ دو تین سال مسلسل یورہ والے ایسے تنگ اور گرم موسم میں شکار کے متعلق تقریر بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دل تڑپ تڑپ کر اسی کے دیدار کے تقاضے کر رہا تھا اور ستم یہ کہ اسکول موسم گرمی کی تعطیلات کی وجہ سے ورنہ اسکول سے گھر تک یا گھر سے اسکول تک کے راستے میں کہیں تو وہ مجھے نظر آتی جاتی۔

ہری بھری میں قیام کیے ہوئے مجھے ایک ہفتہ بیت گیا مگر وہ لڑکی نظر نہ آئی۔ دل میں عجیب و سوسے آتے۔ بعض اوقات خیال گزر کر کہ شاید وہ چھپا لی گزرتی ہیں جلی گئی ہو! اور اس ساتھ ہی میرا دم گھٹنے لگتا۔ دوسری طرف بابا جان نے بھی جیت اگلی طور پر خاموشی اختیار کر لی حالانکہ مجھے یقین تھا کہ انھیں معلوم ہو گا کہ میں ہری بھری میں ہوں مگر مخالف توقع انھوں نے کی تھی۔ تھا نہ پیغام بھجوایا تھا۔ میں خوش تھا کہ چلو دونوں بیویوں سے فی الحال جان چھپی ہوئی ہے۔

لہ کا کیا ہے؟ بالا خرمتائی لوں گا مگر افسوس اس بات کا تھا کہ جس کی خاطر میں کوفت اٹھا رہا تھا وہ اس سے غائب تھی۔ سراب کی طرح۔

اس دن ساری دوپہر بلا کی کھٹن اور جس رہنے کے بعد شام ہوتے ہوتے موسم میں ایک خوشگوار دلی رونما ہو گئی۔ فرحت بخش ہوا نس چھانے ان دیکھے پامیروں کی طرح خوشیوں کے سندے بے باغی پھر ان تھیں لیکن میرے دل و دماغ پر اک نہ ختم ہونے والی بے حسی اور فسردگی کی چادر تھی۔ دل و نگاہ اب بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس دن سول بار پش سے نکلنے ہی جو خوبصورت واردات ہوئی تھی۔ محض خواب گئی تھی شاید وہ میری نظر کا دھوکہ تھا۔ مجھے خود بخود ہی قدرت اور اپنی قسمت سے شکایت پیدا کی تھی اور میں رنجیدہ تھا۔

شام کے پھر پنج بجے تھے۔ گرمی کی رات میں سرسرنے والے ایلبلے جھونکے کوچہ و جانان کی طرف کھینچے ہوئے تھے۔ میں قہقہے میں بہت دیر تک بلاوجہ ہی ایک ہوٹل میں بیٹھا رہا تھا۔ وہیں سے گاڑی موڑ لی۔ اب کے انتہائی آخر میں سرخ اینٹوں کی خوبصورت عمارت فخر سے سینہ تانے کھڑی تھی۔ آج مجھے خبر لیا کہ وہ رہا تھا اور میں نے دور سے ہی زور زور سے ہارن بجانا شروع کر دیا۔ ایسا میں نے قطعی پہلی بار کیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے برآمدے کے سرے سے ایک لہرا ہوا دھانی اچھل نمودار ہوا اور اس کی رینگ پر چمک کر سڑک کی طرف دیکھنے لگاں۔ یہ وہی تھی۔

پہلی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گرد پیش کا ہوش جاتا رہا اور نظریں سامنے چمک کر رہ گئیں۔ اس کے اور میرے درمیان ابھی خاصا فاصلہ تھا لیکن اس کا لکنا ہوا چہرہ مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں ہماروں کے سارے رنگ بھرا کیے ہوئے تھے۔ شاداب چہرہ جھینپتی ہوئی تھی۔ مسکراتے لب۔ ہنسی پیشانی اور۔۔۔ سنسنی بکھرتی زلفیں۔ اس کا چھوٹا سا حنائی۔۔۔ اک ادا کے ساتھ دیرے دیرے شفاف پیشانی کی طرف اٹھ رہا تھا۔

یہ شمار خوبصورت جذبول اور دھڑ دھڑاتے احساسات نے مجھے گنگ کر دیا۔ گاڑی رینگتی ہوئی سین کے قریب برآمدے کے نیچے جا کر۔ مجھے اختیار ہی کہاں رہ گیا تھا۔ میں نے کھڑی سے منہ نکال کر اس کے حسین استقبال کا شکریہ ادا کرنا چاہا۔ لیکن۔۔۔ وہ دوبارہ پلٹ پڑی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نموداری نہ ہوئی تھی۔ میں ہونٹوں کی طرح منہ اٹھائے کھڑا تھا۔ وہ کہاں گئی۔۔۔؟ بڑا سا سوالیہ نشان لگا ہوں کے سامنے لہرا رہا تھا۔ فوراً ہی مجھے ہوش و خواس کی دنیا میں لوٹ آنا پڑا۔ گلیوں میں کھیلنے والے انواع و اقسام کے بچے گاڑی کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے سر جھکا کر گاڑی اشارت دی۔

بنگلے پر پہنچ کر میں نے آج کے واقعے کا از سر نو جائزہ لیا تو دل کے آنگن میں پھر سے کلیاں لگیں۔ اپنی ناسمجھی پر ہنسی بھی آئی۔ ظاہر ہے وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئی تھی اور اس حد تک کہ بے اختیار ہاتھ اٹھا کر سلام بھی کر بیٹھی تھی بعد میں یقیناً مجھے قریب دیکھ کر شرما گئی ہوگی اس لیے چھپ گئی۔ میں وجہ پریشان ہو رہا تھا، ظاہر ہے اسے دوسرے دیکھنے والوں کا بھی تو خیال رہا ہو گا! اس کی وہ دلفریب شکل ادا یاد کر کے میرے دل میں لطیف سی گدگدی ہونے لگی۔

پھر میرا معمول بن گیا۔ ادھر شام ڈھلی، ادھر دیوانے کو کوچہ جاناں کی سو جھی۔ اس آنے اور جانے میں اک عجیب سا لطف، عجیب سی کشش پنہاں تھی۔ سر شام میں اپنا بہترین سوٹ زیب تن کرتا، پیر تلک خوشبوؤں میں نہا کر گاڑی میں آ بیٹھتا اور تو اور ان دنوں مجھے اپنی صورت پر بھی پیار آنے لگا تھا۔ آئینے میں اپنے تپے ہوئے لب و رخسار اور دیکھتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر فخر محسوس ہوتا۔ ہر روز ملازم گاڑی کو ہر پہلو سے چمکانے میں مصروف رہتے۔

جیسے ہی میں ہارن پر ہاتھ رکھتا، وہ لپک کر برآمدے میں آ جاتی۔ عشق نے اسے بھی بیتاب کر رکھا تھا۔ ہر شام نظریں چار ہوتی تھیں، دیدار ہوتا تھا، مگر اس کی شبیہ آنکھوں سے ٹپکتی تشنگی کم نہیں ہوتی تھی۔ جیسے ہی میری گاڑی ریگتی ہوئی عمارت سے نزدیک ہوتی وہ جھپٹ کر کسی کمرے میں روپوش ہو جاتی اور میں مسکرا کر رہ جاتا۔

یہ آنکھ پھولی مسلسل جاری تھی مگر میں اپنی ازلی فطرت سے مجبور، معاملہ آگے بڑھانے کا خواہاں نہ تھا۔ محض مسکراتے اور سلام کے تبادلے سے تو یہ مسئلہ حل ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ دل قریب سے دیکھنے سے پر کھنے کو تڑپ رہا تھا۔ جنوں تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا اور وہ تھی کہ اپنے مقام پر اٹل تھی۔ بالا میں دن نئی بات سوجھ گئی، مصیبت یہ تھی کہ اس کے ہاں فون نہیں تھا ورنہ یہ مسئلہ اتنی طوالت ہرگز نہ کا سکتا۔ میں ہر صورت اسے رام کر لیتا۔

میں نے تمام رات سوچ سوچ کر، الفاظ کاٹ کاٹ کر، نئے سنائے پڑھے پڑھائے مکالمے یاد کر لیے۔ ایک طویل خط لکھا اور پہنچانے کے مسئلے پر غور کرتا کرتا سو گیا۔

اگلی صبح ہلکی سی بارش ہو گئی تھی۔ بھگی بھگی فضا میں نئے نئے ناپائیدار احساسات کو ہوا دے رہی تھی۔ میں اس کی گلی میں پہنچا تو خلاف توقع وہ پہلے سے ہی برآمدے میں موجود تھی۔ آج وہ نارنجی قمیض، رنگ کا دو پٹا گلے میں ڈالے ہوئے تھی۔ دل پر قابو کرنا ناممکن ہو گیا۔ میں نے ایک ہاتھ سے ماتیں سے نکال کر تیلیاں الٹ دیں اور رات کا لکھا ہوا نامہ محبت نکال کر اس میں ٹھونس دیا۔ وہ میری طرف متوجہ تھی۔ گاڑی قریب پہنچی تو میں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر پوری قوت سے ماچس برآمدے کی طرف

پھینک دی۔ لیکن میری بدحواسی اور بے وقوفی ملاحظہ ہو کہ ماچس میں علاوہ ہر پے کے کوئی وزن ہی نہیں رکھا۔ نتیجہ ”وہ کچھ اوپر گئی پھر دوپے سے سڑک کے نشیب میں آگری۔ شرمندگی اور جھلاہٹ سے ہوا برا حال ہو گیا۔ نظراٹھائی تو وہ شوخ برآمدے سے غائب تھی۔

دل ہی دل میں نے اسے ایک موٹی سی گالی دے ڈالی۔ ”چتا نہیں اپنے آپ کو سمجھتا کیا سالی۔“ گاڑی روک کر ماچس اٹھائی اور غصے سے بل کھاتا ہوا اپنی باتیں گاہ کی راہ لی۔

یہاں ایک اور ہی مصیبت خطر تھی۔ موٹے پردوں سے دھکی ہوئی مخصوص جیب مجھے باہر ہی آگئی۔ جی میں کیا کہہ بیٹھیں سے قہقہے کی طرف بھاگ لوں مگر بابا جان کا قدیم ڈرامیور نرسو خان مجھے دیکھتا تھا۔ چنانچہ طوعاً و کرہاً مجھے اتنا پڑا۔ دانستہ اسے نظرا تڑا کر کے میں اندر پہنچا تو واقعی دونوں ”بابا“ موجود تھیں۔ دونوں میں حد درجہ صلح اور مصالحت نظر آ رہی تھی۔ دونوں ہی سرخ رنگ کے کپڑے پہنے زیورات سے لدی پچھدی بیٹھی تھیں۔ جیسے انجمنی بیاہ کر آئی ہوں۔ میں بھٹکا گیا۔ بابا جان کی خاموشی سارا راز مجھ پر عیاں ہو گیا۔ میں جان گیا کہ والدہ نے اپنی بھانجی کو اور بابا جان نے اپنی بیٹی کو برباد کر دیا۔

پڑھا کر میرے تعاقب میں روانہ کیا ہے۔ ان دونوں کی مکاری پر جی چاہ رہا تھا کہ دونوں کی ہی توبہ بیک وقت توڑ دوں اور مگر دونوں کی ہی بات ترتیب دس اور تین سالہ رفاقت نے مجھے بھی چلا لاک اور معائنہ بنا ڈالا تھا۔ میں نے دن پر جبر کر کے دونوں کو مٹا کر خوش آمدید کہا۔ وہ رات دونوں کو اپنا مہمان رکھا اور تیسرے دن ہری بھری کو خیرباد کہہ کر دونوں کے ہمراہ گھلا گیا۔ ایک ایک کپڑا نواہر بھر تھا مگر مجموعی طور پر تقریباً چار ماہ علیحدہ رہا تھا اس لیے اب مزید علاج کی ضرورت میری پوزیشن نازک کر رہی والدین اور بیویوں کو مطمئن کرے کرتے بہت وقت صرف کرنا پڑا اور جب میں دوبارہ ہری بھری میں طویل اور بے فکر عرصہ گزارنے کی نیت سے اور بابا جان کی یا کاعدہ اجازت لے کر آیا تو گلابی بازار موسم شروع ہو چکا تھا۔

سب سے پہلے کوچہ آ جانان کی زیارت کی۔ سب کچھ جوں کا توں تھا۔ وہی عمارت وہی سکونت وہی خاموشیاں وہی گھٹیاں وہی بچے اور وہی ماحول۔ دل میں ایک عجیب سا کون اتر آیا۔ اس مرتبہ میں مہم ارادہ کر لیا تھا کہ ہر صورت میں اس کے اور اپنے درمیان موجود فاصلے اور دوریاں مٹا کر رہوں۔ میرے بچنے کے اگلے روز کا ذکر ہے۔ صبح کے دس بجے کا عمل رہا ہو گا کیونکہ میں اسی وقت ایک نیند لے کر بیدار ہوا تھا اور غسل سے فارغ ہو کر ناشتی کی میز پر پہنچا ہی تھا کہ بابا جان کا فون آیا۔ انہوں نے مجھے فوراً سے پشور اٹلی پہنچ جانے کی ہدایت کی تھی۔ اطلاع کے مطابق رات کو وہاں ہمارے دو اور اور دوسرے زمیندار کے درمیان زبردست جھگڑا ہو گیا تھا۔ بات باتی کے لین دین پر بکڑی تھی۔

اہم تھا چنانچہ میں ناشتا اور صبح پھوڑ کر گاڑی لے کر چل دیا۔ اہلی شاخ کے آس پاس زیادہ تر اراضی اداری تھی اور یہ مقام ہری بھری کے درمیان ایک مختصر سا جنگل پر آتا تھا۔

اچانک ہی سڑک کے نشیب میں پھیلے ہوئے ہرے بھرے جنگل میں چند بیڑوں کے نیچے مجھے وہ نظر آئی اسٹریٹ پر رقص کرتے ہوئے میرے ہاتھ خود بخود ختم گئے اور میں از خود رفتگی دم بھوشی کے عجب عالم میں پہنچے اتر کر اسی گوشہء تنہائی کی طرف چل دیا۔ اس نے کچھ فاصلے پر پہنچ کر میری آنکھیں پھٹ جانے اور جد جھگڑا کھل کر رہ گئیں۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے ہمراہ ایک اساتذہ سا شخص تھا۔ مجھے درختوں کی لٹ میں ہونا پڑا۔ دل و دماغ پر ایک قیامت سی گزر گئی تھی۔ اس کا ہر جانی پن مجھے آج کچھ کر گزرنے پر لمانے لگا مگر اس سے قبل کہ میرے ہوش و حواس رخصت ہوتے میں ٹھک کر رہ گیا۔ ان دونوں سے دوڑے سے فاصلے پر ایک پیڑ کے نیچے ایک کرم کلر کی کڑوا کھڑی تھی۔ میری گاڑی کی ہم رنگ وہ ہم شکل اور ماڈل بھی نیا تھا۔

میرے سارے دلوں، ٹکٹ خوردہ ہو گئے۔ شروع سے آج تک کا ایک ایک لمحہ میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اپنی خوش فہمی اور یکطرفہ سوچوں کا زہر میری نس نس کو زہر آلود کر گیا۔ ہم دم ہم دم انہوں پر میں نے گاڑی سے نظر ہٹا کر پیڑ بے جا رنگ کے عالم میں دوبارہ ان دونوں کو دینا واپسنا سے بے لگنا تو اچانک ہی میری ٹکٹ خوردگی، شہید قسم کے جذبہ فاختانہ میں بدل گئی۔

میں اس عادی دھوکے باز کو صاف طور پر پہچان آیا تھا جو بیک وقت کئی کئی لڑکیوں سے عشق جھاڑا کرتا تھا وہ اس راہ کا پرانا کھلاڑی اور شکاری تھا۔ اور معاشرے کے اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا جس طبقے کا میں خود تھا۔ ہم لوگ گھروں سے باہر عشق تو لاتا تھے ہیں لیکن شایاں ہر صورت خاندان میں ہی رہتے ہیں۔ اپنی خاندانی لڑکیوں اور اپنی جائیدادوں کی حفاظت ہمارا فرض جو ہے۔ وہ میرا ہم قوم تھا۔ ہم ایک تھا اور ہم رنگ تھا! اور پھر شکاری اپنے شکار کو قریب لا چکا تھا۔ صرف چند دلوں کی توبہات ہے جب وہ لڑائی جائے گی تو میری کرم کلر کڑوا کا دروازہ اس کے لیے کھلا ملے گا۔ آخر میری گاڑی بھی تو اسی رنگ کی ماڈل کی ہے۔



میں ایک روز حاکم کے پاس اس کی جو بیٹی بیٹھا تھا کہ کچھ بے حال اور گھبراہٹ ہوئے سہائی، حاکم کے حضور حاضر ہوئے۔
 معلوم ہوا کہ وہ بدست سے لڑنے لگے۔ بدست اور دوسری چڑی بیٹیوں کی طرح سہائی کی محل وادی میں آباد حاکم کے
 سپاہیوں کو محصور و موصول کرنے بیٹھا تھا بدست والوں نے صرف محصور اور نہ کیا بلکہ حاکم کے بنادے پر کمر بستہ ہو گئے۔
 وہ سپاہی بیٹھل والوں سے اپنی جان بچا کر گئے تھے۔ یہ کہ کچھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ حاکم نے بدست کے درختوں کے پاس سے
 والوں کا معاملہ دے میرے احاطہ میں دے دے۔ حاکم نے زبان سے دی۔ اور میں ایک چنچہ چڑی سپاہیوں کو بدست کے درختوں کے
 کیا۔ میں نے وہاں کی جان بچا جس سپاہیوں سے بدست کے بیچ اور محصور کو لایا اور میرا سپاہی باندھ لیا۔ بہت سی
 وہاں بھجھ ہو گیا۔ وہ بجز کچھ نہیں تھے انہیں دھکی دی کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو میں تلوار و قوسوں
 کروں گا اور میں ان لوگوں کو فوراً کھینچ کر بیچ کر ہر کوئی نے اصرار کرتے پاس کے لئے مجھے یہی مدت کی کہ اس
 کو چھوڑ دوں اس حینہ کہ اس کو کاڑھی میں دے دیں ہر کوئی بھلا اس کو باپ کو بھیجے چھوڑ کر تھا میں نے اسے
 سے لگایا۔ اور چرچہ میں دروازے سے تمام قیدیوں کو لے آیا۔ میں انھوں نے سپاہیوں کے بیچے تھا میں نے تلوار نکال لی
 بہت سی والوں سے کہا کہ اگر آئندہ چرچہ روز چاشت کے وقت تک انھوں نے مطلوبہ محصور اور کیا تو ان کے بیچ اور قیدوں کے

ہاں! اسے دلے جو ہر کو کوہ پڑنے سے مراد انہیں کہیں نہ ملی، ملتی بھی کیسے ہیں اسے ایک تاریخ چپا چکا خنجر پوشا کے آدمی کی طرح اسے صورت پر ہے اور میں جانتا تھا کہ اگر جیروہ ان کے ہاتھ تک نہیں پہنچ سکتی تو جیروہ نہ ان کو ہلاک کرے گا۔ لیکن اب یہ ثابت ہو رہا ہے۔

میں لیٹان کے ایک ہاتھ کو اچانک خنجر پوشا کے آدمی چادر میں لپی لپی پڑا لے کر بعد میں پتلا کر دے جو ہر وہ تھے۔ مجھے بھی ایک پاشا کے انہیں سے باہر کر ڈال دیا جو ہر وہ تھے۔ میری کہ میں بلوں کر میں اس کی خواہش پوری کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے بھی مجھ پر کر دیا تھا کہ ایک لفظ بھی نہ کہوں۔

سلیمان سے کہنہ کرتے کہ بعد میں عزم اور پختہ ہو گیا میں۔ عابد کو راضی کرنے کے لیے اپنی اہل خانہ کو خواب کے حوالہ دیا اور بلا خراساے میری جا مانا چڑی کر بھر حال مجھ سے جنت کرتی تھی۔ اس کے بعد میں نے قریبی بہنوں سے چاہو کہ کوئی بھاری کیا اور ارمیں حریت دی پھر کیا دن میں قول سے روانہ ہو گیا مگر سو دروئی سے پہلے میں نے دہان کی آواز صورت حال سے پوری آنکھیں حاصل کر لی تھی۔ ان معمولات کے مطابق خروشاہ کے مصر بھیجے سے پہلے ہمارے مصر ممالک کے قبضے میں تھا ممالک کی بد قسمتی سے روسیہ میں سے مصر کو فتح کرنا چاہا۔ نہیں اس میں کامیاب تو نہ ہو سکا مگر اس سے ممالک کی قوت ٹوٹ گئی۔ نہیں کو مصر سے واپس جا کر عالم کے فرائض برطانوی حکومت نے ادا کیے پہلے کیوں کہ مصر ترکی کے زیرِ تعلیم تھا اس لیے ترکی سلطان نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور خروشاہ کی حکومت بھیج دی۔ برطانوی حکومت اس معاملے کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنے سفیر اٹلر زبانا کے ذریعہ ترکی کی خلافت اور ممالک کے دربار میں اس کی شورش کو شریک کر دیا۔ برنی درود کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ممالک کا چھوڑ دو مصر کے ہالانی سے پہلے جائیں ممالک نے برطانوی سفیر پر پورے اعتماد کا اظہار کیا اس دوران میں ممالک کا سردار مراد بیگ مارا گیا اور عثمان بک بدوئی سربراہ ہلاک کر دیا، اگلی جاری تھے برطانوی سفیر نے ممالک کے اور خروشاہ کے وفد کو اسکندریہ دعوت میں بلایا تاکہ مسلحی شرافت کے ساتھ جائیں۔ ممالک ابو قیر کے ساحل پر ڈیرے ڈالنے پر تھے۔ اسی دوران میں مراد بیگ کی حسین وڈین پیوہ نینہ، عثمان بک سے ملی اور اسے اسکندریہ جانے سے منع کیا اس کی اطاعت کے مطابق ترکی سپہ سالار قیطان پاشا ممالک کے خلاف کوئی سازش کر نہ تھا۔ غیب کا خیال تھا کہ اس طرح قیطان پاشا ممالک کے سردار کو قتل کر دیتا چاہتا ہے۔ عثمان سے غیب کا سوچا ہوا اسے سمجھا کر بھیجا گیا کہ وہ اسے اسے مصر سے میرا جنگی جناز

ابو قریب پہنچ گیا۔ بھٹان پاشا جاز کا معائنہ کرنے آیا۔ اس کے ذہن میں واقعی ایک سازش کا منصوبہ تھا۔ اس نے مجھے اہل اعتماد میں لے لیا۔ میرا دوست سلیمان ابو قریب ہی سے قوالہ واپس جانا چاہتا تھا۔ بھٹان پاشے نے وعدہ کر لیا کہ۔

اگر میں نے اس کے منصوبے کو کامیاب بنا دیا تو ہمسایوں کی جگہ مجھے بالکل بے اثر قرار دے گا۔ پھر یہی ہوا جو ہمارے
پاشا چاہتا تھا جسے یہ ہمایوں کی منتقلی اسکندریہ کی طرف دیکھیں، میں نے ان پر ہتھکڑیاں لگا دیں۔ ان کتلیوں پر ہمایوں
کے ختب سردار سے جن میں سے اکثر کٹر ہونے اور خوشی ہو کر زندہ چکے تھے، ان میں گرفتار کر کے میں اپنے زمانہ پر اسے
اکھی محسوس ہوا میں چاہتا تھا۔ یہ وہی تھا جس نے میری ملاقات نوجوانی کے زمانے میں، قوالہ میں ہوئی تھی۔ اب وہ
مملوک کا سرحد میں پناہ گزین تھا۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے پچکا لیا۔ پھر ہم نے اس کے دوسرے کو قتل کر دیا۔ پاشا
اس خوشی اور اتنے کی خبر برطانوی سفیر کو بھجوا دی کہ وہ بڑے ہوشیار ہو گئے کہ اس کا نام اسکندریہ کیا گیا تھا
تو پاشا مصلحتاً روپوش ہو گیا۔ اس نے مجھے حالات سے مطلع کیا اور پھر برطانوی سفیر جنرل لالان کی مدد سے میں
ان نازک حالات میں سوجھ بوجھ اور پردازی کا ثبوت دیا۔ برطانوی سفیر کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ میں اسکندریہ سے اور
تو پاشا مجھے سے آگرا۔ وہ بے حد خوش تھا کہ اس کی سازش کو میں نے کامیاب بنا دیا۔ اور خود پاشا کے نام ایک
مسافری خط بھی لکھا۔ میرا دل احمقوں کا کھنڈر ہو گیا۔ کیا میں اپنے دشمن کو سزا دیکھو گا کہ میں نے کامیاب ہو کر ان
مصر میں ایک مطلق العنان حکمران ایسی بنیاد رکھا تھا۔ اگر اسے میری وفاداری پر شک ہو جائے تو یہ کب وقت اور میرا
ہلاکت کا سامان کر سکتا تھا۔ میں غریب تخت آواز میں دیا اور قاتلا۔ میری ذرا سی انفرش مجھے موت کے منہ میں
پھانسی تھی۔

(اب آپ آگے بڑھیے)

5-4

عثمان بک نے بڑی گرم دوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور
- "آج سے میں بھی تمہارا دوست ہوں اور جب تک
میرے ہوں گا تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا اگر میں
میرے ہوں اور زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں سچ اور حقیقت
میں کی ضرورت پڑے تو یاد رکھنا میرا ایندھن تمہاری
میرے ہاتھ تمہاری تلوار ہوں گے"

اس کے بعد میں نے عثمان بک اور بقیہ زندہ بچ جانے والے ممالیک سرداروں کو کشتیوں میں سوار کرایا اور اس اسکندریہ میں جنرل پالان کے حوالے کرنے والا

اسکندریہ کے قریب ہی پانی میں برطانوی جنگی کشتیاں
تکڑی تھیں۔ انھوں نے ہمیں نہیں روکا اور فوراً
بالان کو مائیک قیدیوں کی آمد سے مطلع کر دیا۔
دو۔ مہرجن بالان نے اسکندریہ کے ساحل پر قیدیوں
تحتال کیا اور ان کی مصیبت پر رنج اور دکھ کا اظہار
نہ کیا۔

خواب میں عثمان بک نے قسم کھا کر کہا۔ ”اے مہم

لیڈر اس واقعے نے ہمیں صلح و اتفاق کا پابند یوں سے آزاد
 رکھا ہے اب میں عثمانی سپاہ کے مقابلے میں باز نہیں
 رہوں گا اور اس نے نائب سلطان خرو پاشا سے اپنے
 آدمیوں کے قتل کا بدلہ لوں گا جس کے اشارے ہی پر سب
 جاگ ہوا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اب قاہرہ پر بغض کرنے
 لگا ہے۔

”عثمانی وفد نے ہماری بھی توہین کی ہے۔“ جنرل بالان
ہری طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”میں آپ سے کمک کی درخواست کرتا ہوں اسے محترم
 ”نہ! تاکہ بڑوں اور سازش کرنے والوں سے نمٹ
 ”دیں۔“ خان بکے متوقع پارے پل کی بات کر دے
 ”میرے علم میں ہے کہ میرے نام سے یہ خیانت کی
 ”جڑ لگ چکی ہے۔ میں نے میرے بھائی کے ساتھ
 ”کے کروے۔“ برطانوی حکومت کو اس پر اب کی اعتراض
 ”میں ہو گا بلکہ میں ذاتی طور پر تمہاری تحریکیں کا آرزو
 ”میں ہوں۔ لیکن اس معاملے میں تمہاری کسی بھی طرح مدد
 ”میں کر سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس اندھوہ کا دھننے کے
 ”پیشہ میں جلدی سے دھننے والے چائے اور یہاں
 ”کو ایک نئے سفر۔“

پھر عثمان یک نے کچھ نہیں کہا۔ شاید اس نے سمجھ لیا تھا کہ حکومت برطانیہ براہ راست ترکوں سے جنگ آزمائی کرنا چاہتی ہے۔

قیدیوں کو جزل بالان کے پردہ کے میں "اسکندریہ سے
آیا۔ اپنے جہاز پر آکر میں نے حکم دیا کہ جہاز پر جہاں
ان کے دجے لگے ہوئے ہیں، انھیں دھوڑا جائے۔ میں

میں چلا ہوتا تھا کہ ان خون کے درجوں پر میرے عز و حرمت
 لیماں کی نظر پر سے جواب تک نہ پائیں انکا قہار۔
 پھر میں لیماں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے سنے سے
 ایسا یاد دہری سلامتی کی خوشی میں پیشانی پر بوسہ دیا وہ
 اتنا کھرا کہ اس نے میری نیابت میں ایسا کام کیا جسے
 تم کو بیانی کی طرح سننے میں آئے گا۔ میرے تمام
 آلات سے آگاہ کر دیا۔ اس کے ساتھ مصلحتاً اس خیانت
 بیزار کی اکالہ رکھا جس میں اسے اور مجھے مجبوراً
 لڑنا پڑا۔ خدا میں سے لیماں کو سمجھایا۔ "اے
 است! میں نے ایک فوج کی حیثیت سے اپنے افسر کے
 قہیل کی ہے میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس واقعے

کے بعد میری سنگ دلی میں اضافہ ہو گیا ہے اور دل کا گداز رخصت ہو چکا ہے۔ میں اب وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔"

سلمان نے غور میری بات سن کر اور مجھے ثابت قدم کی
تائید بھی کر کہا۔ اس نے کہا: ”میرے بھائی ایسا کرتے
ہو کہ میں نے اپنی کمزوری اور عاجزی کے باوجود سرخوشا
کے حکم کی تعمیل کیوں کی اور کیوں قوالہ سے پاہوں کو لے
کر چلا؟ پھر تمہیں بھی ساتھ لانے پر رضی اور اپنی خوش
میں کامیاب رہا۔“ اسنو دوست کہ میں نے یہ سب کچھ
اپنے لیے کیا ہے۔ تمہیں بھی رازوں والوں اس راہ پر جو
منزل کا سفر ہے، اس پر غور کرو۔ میرے ساتھ جانا ہے۔

میں پہلے اس کے خلوص و محبت کا قائل تھا۔ وہ غلط نہیں کہ ہاتھ "ا" سے لیمان اسے عزیز دست میں تمام مٹراس دانے کو پار رکھوں گا اور اگر کسی مرتبے پہنچ گیا تو یہ تمھارے لیے غل میں ہوگا میں تمھارے لیے بیشہ دعائے خیر کر رہوں گا۔ جب کسی معاملے میں مجھے نرمی کی ضرورت ہوگی تو میں تمھاری مثال کو پیش نظر رکھوں گا کہ تمھارے اخلاق مجھ میں سرایت کر جائیں اور میرے مزاج کی جتنی کمی ہو جائے۔

”خدا کے لیے سلیمان“ اس وقت اس عیار و بزدلی کا ذکر

”علی! تم اس کے ذکر ہی پر بھڑک رہے ہو!“ سلیمان مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”جب وہ تمہارے ساتھ ہو گا تو کہہ دو، چار قابلاؤ گے؟“

۳۱ دوست! اسیں تمہیں یہ گمان تو نہیں کہ میں قاجار کے خادم میں شامل ہو جاؤں گا! نہیں، حقیقتاً ایسا نہیں ہو گا۔ مجھے کچھ یہ احساس بھی ہے کہ قبطان پاشا نے شاید ارادہ کر لیا ہے، میں، صوبہ کی طرف سے بدولتوں۔ میرا خیال ہے کہ خود قبطان پاشا بھی اس سے اراضی سے اس لیے ہو مجھے قاجار بھیج رہا ہے۔ قبطان پاشا نے مجھے خصوصاً شام کی ایک سفارتی دہی بھیجا ہے۔ سب سے پہلے قاجار پاشا کے پاس پہنچوں گا تو اس کا احترام اور اس کے قاجار کو خدمت کروں گا جیسا کہ قبطان پاشا سے کہہ چکا ہوں۔“

”مگر اے دوست، تمہارا دل کیا چاہتا ہے؟“ سلیمان کا

لجہ معنی خیر تھا۔ ”خروپاشا کی خدمت میں تمہارے داخل ہونے کے بعد کیا معشر میں اس کی عزت و وقعت باقی رہ جائے گی؟“

کلیات میں اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ یقیناً وہ میری دل کی بات اور اصل عزائم سے واقف تھا۔ میں نے کہا ”میرے دوست! اتم نے واقعی ذات کی بات کی لیکن میں فی الوقت تمہارے سوال کا جواب نہیں دینا لگتا اس کا جواب مستقبل دے گا جب تم قوالہ قیل جاؤ گے تو میں تمہیں اپنے حالات لکھتا ہوں کہ ہاں تم سے میری ایک درخواست ہے کہ عایدہ اور میرے بچوں کا خیال رکھنا میں نے قوالہ کے ساحل پر تمہیں ایک مقدس مقام دکھایا تھا وہی مقام جہاں جو بھو لونیو کیا تھا۔ میں پہنچو تو کمانا کہ اے جو بھو! تمہارا عمل بھی تمہیں نہیں بھولا اور کبھی نہ بھولے گا۔ اب مجھ محلے نے اپنے مقتدر کی طرف قدم بڑھا دیا ہے تم پر آرام سے سوجاؤ مجھ کی تمہارا انتقام ضرور لے گا۔“

پھر اس روز میں نے اپنے دوست سلیمان کو قوالہ کے لیے روانہ کر دیا اور خود قاہرہ روانہ ہو گیا۔ میرے ہمراہ قطبان پاشا کا ایک قاصد جس نے انعامی تھانے قطبان پاشا میرے پاس پہنچو گیا تھا۔

اس وقت فرانسسہوں کو مصر سے نکلے ہوئے دو برس گزر چکے تھے۔ مصریوں کو جو لذت و خوار کی ان کے ہاتھوں اٹھاتا چڑی تھی اب فراموش ہو چکی تھی اب تو وہ نائب سلطان خروپاشا کی قاہرہ میں آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ خروپاشا کو اپنا تخت و تہذیب جان کر خوشیاں منا رہے تھے اور نعرے بلند کر رہے تھے۔ میں جب قاہرہ پہنچا تو یہاں پر دیکھا اور محسوس کیا۔ قریب خروپاشا کا قاہرہ بیٹنے والا ہے۔ یہ خبر لوگوں کو ملی ہی تھی۔ انھیں یقین تھا کہ سلطان نے ان کے پاس جو آدمی بھیجا ہے وہ مصر کے تمام معاملات سنبھال لے گا اور ممالیک کی جبروت قدوسی سے بھی انھیں آزاد کرانے لگے۔

پھر وہ بھی ایک عجیب خروپاشا کو اتھا۔ ایک غیر فخر نہیں لگا ہوا بلوائی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ نعرے خروپاشا کے استقبال میں بلند کیے جا رہے تھے۔ خروپاشا بلوائی کی تسی سے شرمیں آنے والا تھا۔ لہجہ یہ کہ اس نجوم میں اضافہ ہو آیا تھا اور اسی نجوم کے

ساتھ میں بھی تھا۔ دیوانے نکل کے کنارے دھماکا مٹا کر اور فنی افسران اکٹھے تھے جن میں اکثر افسران بھی شامل تھے۔

خروپاشا کی کشتیاں دریا سے نکل کر سٹاپ ہو گئیں۔ خروپاشا خود ایک بڑے جہاز میں سوار ہو کر غصے پر کھڑا رہا تھا۔ اس کے گرد مزین ہتھیار اہم افسران اور خزانے والے سرکاری درویدان پہنچے تھے۔ آقاب کی کریم ان کے ہتھوڑوں اور ہاتھ میں ہتھیار پڑ کر عجیب چمک پیدا کر دی تھیں۔ یہ تھنے اور دھماکے کے سینوں پر گرنے ہوئے تھے اور گرفتار کی آہیں آہیں دھکیلا کر رہے تھے۔

جہاں خروپاشا کے جہاز کو گھرنا تھا وہاں سے اس نے ایک کشتیاں بھی نکالیں تھیں۔ وہ کشتیاں میں لاکھ لاکھ اور کل سترہ سترے آرام تھیں۔ خروپاشا کو اس کے دیکھ کر ہر ایک آدمی نے سارا ترشاشی غلامی

خروپاشا کا جہاز آکر کا اور وہ کشتیوں پر چلا ہوا تھا۔ ایک آہیں اس کے زین پر قدم رکھنے ہی فضا میں غول سے کچھ اٹھی مگر ان میں میرا غرض تھا۔ میں نے ان میں دل میں کہہ رہا تھا کہ آے میرے مہاراجہ میں تیرے ہی اظہار میں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ انتقام اس کی کسی سے نہ لیا ہو گا۔

انھوں نے جواب میں خروپاشا نے یہ طور شکر پر دیا پھر نگاہ اٹھائی اس کی نظر پر ابرام مصر کی طرف شاید اس وقت خود کو فراخ مصر کا جاؤں گا۔

میں جب قاہرہ پہنچا تو یہاں پر دیکھا اور محسوس کیا۔ قریب خروپاشا کا قاہرہ بیٹنے والا ہے۔ یہ خبر لوگوں کو ملی ہی تھی۔ انھیں یقین تھا کہ سلطان نے ان کے پاس جو آدمی بھیجا ہے وہ مصر کے تمام معاملات سنبھال لے گا اور ممالیک کی جبروت قدوسی سے بھی انھیں آزاد کرانے لگے۔

پھر وہ بھی ایک عجیب خروپاشا کو اتھا۔ ایک غیر فخر نہیں لگا ہوا بلوائی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہ نعرے خروپاشا کے استقبال میں بلند کیے جا رہے تھے۔ خروپاشا بلوائی کی تسی سے شرمیں آنے والا تھا۔ لہجہ یہ کہ اس نجوم میں اضافہ ہو آیا تھا اور اسی نجوم کے ساتھ میں بھی تھا۔ دیوانے نکل کے کنارے دھماکا مٹا کر اور فنی افسران اکٹھے تھے جن میں اکثر افسران بھی شامل تھے۔

خروپاشا خود ایک بڑے جہاز میں سوار ہو کر غصے پر کھڑا رہا تھا۔ اس کے گرد مزین ہتھیار اہم افسران اور خزانے والے سرکاری درویدان پہنچے تھے۔ آقاب کی کریم ان کے ہتھوڑوں اور ہاتھ میں ہتھیار پڑ کر عجیب چمک پیدا کر دی تھیں۔ یہ تھنے اور دھماکے کے سینوں پر گرنے ہوئے تھے اور گرفتار کی آہیں آہیں دھکیلا کر رہے تھے۔

جہاں خروپاشا کے جہاز کو گھرنا تھا وہاں سے اس نے ایک کشتیاں بھی نکالیں تھیں۔ وہ کشتیاں میں لاکھ لاکھ اور کل سترہ سترے آرام تھیں۔ خروپاشا کو اس کے دیکھ کر ہر ایک آدمی نے سارا ترشاشی غلامی

خروپاشا کا جہاز آکر کا اور وہ کشتیوں پر چلا ہوا تھا۔ ایک آہیں اس کے زین پر قدم رکھنے ہی فضا میں غول سے کچھ اٹھی مگر ان میں میرا غرض تھا۔ میں نے ان میں دل میں کہہ رہا تھا کہ آے میرے مہاراجہ میں تیرے ہی اظہار میں تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ انتقام اس کی کسی سے نہ لیا ہو گا۔

انھوں نے جواب میں خروپاشا نے یہ طور شکر پر دیا پھر نگاہ اٹھائی اس کی نظر پر ابرام مصر کی طرف شاید اس وقت خود کو فراخ مصر کا جاؤں گا۔

میں جب قاہرہ پہنچا تو یہاں پر دیکھا اور محسوس کیا۔ قریب خروپاشا کا قاہرہ بیٹنے والا ہے۔ یہ خبر لوگوں کو ملی ہی تھی۔ انھیں یقین تھا کہ سلطان نے ان کے پاس جو آدمی بھیجا ہے وہ مصر کے تمام معاملات سنبھال لے گا اور ممالیک کی جبروت قدوسی سے بھی انھیں آزاد کرانے لگے۔

واقعیات بیان کروں!

”ہمازت ہے“ خروپاشا کی آواز میں اضطراب تھا۔ اجازت ہے میں حسن آقا سے ممالیک پر دفعہ حملہ کرنے کی کیفیت بیان کر دوں۔

”قطبان پاشا نے اپنے لیے ایک خونی یادگار چھوڑی ہے“ خروپاشا نے ساری تفصیل سننے کے بعد ہنسیوں میں ”یہاں ممالیک کا قتل کرنا ان کی دہشت و انور سے قانع نہ ہونے کے زیادہ تر تھا“

”میرے آقا نے جو کچھ کیا ہے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے“ حسن آقا نے جواب دیا۔ ”انھیں پورا یقین تھا کہ ممالیک سے دو تہی کا ممکن ہے اور ایک نیا مہم میں دو تہا میں نہیں ہو سکتی۔ آپ کو میرے آقا کی طرف سے اپنے دل میں لگائی ہوئی کٹھن میں کچھ چاہیے۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہے، مصر میں آپ کے قدم مضبوط کرنے کے لیے یہ کیا ہے۔ ان کی جبروت کے اظہار اور آپ کی سلطنت قائم رکھنے کی نیت دلیل مل سکتی ہے۔“

”وہ یقین دہانی کیا ہے؟“ خروپاشا نے سوال کیا۔

”میرے آقا نے آپ کی خدمت میں ایک جوان کو بھیجا ہے جو ابوالعزم اور مت والا ہے۔ کوئی مشکل اس کا سامنا نہیں کر سکتی۔ میرے آقا نے ان کے دل سے کچھ دے دیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنی محبت اور غرض کے ثبوت میں اس کی خیر خواہی بھادریوں سے زیادہ اور کوئی چیز پیش نہیں کر سکتے۔ میں اس گراں بہا بدلے کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔ کیا آپ مجھے اسے پیش کرنے کی اجازت دیں گے؟“

شاید خروپاشا نے اشارے سے اجازت دے دی تھی ورنہ جواب میں اس کی آواز ضرور اتر دیتے۔ حسن آقا بہر آیا اور میرے ساتھ لے اندر پہنچا۔

خروپاشا پوری محنت سے مندر پہنچا تھا۔ اس نے بے پروائی کے سے انداز میں میری طرف نگاہ اٹھائی لیکن مجھے پچھانے سے بچنے کے ہوش اٹھ گئے اس کے چہرے سے عجیب عجیب آگاہا ہو رہا تھا۔ یقیناً برسوں بعد مجھ اپنے رو بہ رو دیکھ کر اسے پچھانے میں دہشت ہو رہی تھی اس نے اسی لیے کہا۔ ”اے بلک پاشا! تمہارا نام کیا ہے اور تم کہاں کے بچے والے ہو۔“

میں چند قدم آگے بڑھا، خروپاشا کو یہ غور دیکھ کر سر

جھکا دیا پھر میں نے سوال کا جواب دیا۔ ”میرا محل چلے ہے اور میں قوال ہے۔“

خوش پاشا چونکہ اغا اور اسی کے ساتھ اس کے چہرے سے فکرو تردد کا اظہار ہوئے لگے۔ اس نے کچھ ہی دیر میں اپنے خواس پر قابو پا لیا۔ ”اے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ میرے مقابلے میں ہمت بلند رہے، پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”تم نے یہی کیا کہ جب میں قوال میں قلمد محفل ہے یہاں مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب میں قوال میں قلم ایک جوان محفل میرے میران حسان کے بیٹے سلیمان کا دوست تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے سلیمان کا موازت دہی کی کہ وہ اپنے دوست کو بھی ساتھ لے گیا، لیکن سلیمان نہیں آیا۔ مجھے تو یہ گمان گزر رہا ہے کہ شاید تم جو محفل نہیں ہوئے میں نے قوال میں دیکھا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ میرے چہرے کا جائزہ لیتا لگے۔

اسی بات میں کرشن اور دستر اسکرایا اور بولا۔ ”حضور کا خیال پہلے درست ہے میں وہ محفل نہیں ہوں۔“

”پھر پھر تمہاری عقل اور اس سے اتنی شباب کیوں ہے؟“ خوش پاشا کے لیے میں نے یہی تھی۔

”حضرتی معاف کہ میں ہی محفل ہوں۔“ سلیمان کا دوست! ”میں نے جرات کے ساتھ کہا پھر اپنے لیے میں نے یہی تھی اور میرے بولے۔“ لیکن اب وہ محفل نہیں رہا۔ وہ بد پند اور سرکش تھا۔ وہ آپ کی مخالفت کرتا اور آپ کے سامنے سراخا تھا مگر یہ محفل جو آپ کے سامنے کھڑا ہے، آپ کا سچا خادم ہے۔ میں اپنے دوست سلیمان کا سلام اور شہرے لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ نے اسے اتنی ہی عزت سے قوال کیا۔ آپ کے

میرے دوست سلیمان نے فوراً آپ کے عمر کی تھیل کی لیکن تدریجی انسان کے اقتدار میں نہیں ہے۔ سلیمان کی کمزوری آپ تک نہیں جی ہے۔ ابویر میں جو واقعہ پیش آیا اس سے سلیمان کو بہت صدمہ پہنچا۔ وہ اسی کے احترام

بقلم پاشا کی اجازت سے قوال چلا گیا۔ محترم سالار جنگ نے مہربانی فرما کر مجھے سلیمان کی جگہ مقرر کر دیا۔ میں خود محفل کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مجھے جو کچھ ملے، آپ ہی کے دست سے ملا ہے۔“ میں اپنے دل سے بھر کر کے یہ بچہ کہہ رہا ہوں۔

خوش پاشا کی نگاہ میں میرے چہرے پر تھی اور اس کے

چہرے سے مسرت کا اظہار ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے اس محفل کے اس طرح اتر چکے تھے۔ وہ میں تھا۔ اس سرکش فوجوان کی سرکشی اور عظمیٰ نہیں ہونے کے باوجود نہایت سنجیدہ ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کے ہاتھ ہلکے جاتے ہیں مگر ان کی کوکوت گزرنے کے ساتھ اس طرح آجاتی ہے۔ وہ منہب اور شاکستہ ہو جاتا۔ عقل اس وقت ختم نہیں نظر آ رہے ہو۔ میں اسی جیسے اپنے خاص آدمیوں میں شامل رہا ہوں۔ تمہاری جس خدمت اور خبر خاں سے وہاں ہوں۔ تم نے ابویر میں کارنامہ انجام دیا ہے اور اس وقت ہے میں اسی کے جیسے صرف ہلکے ہلکے جاتے ہو۔ اس وقت سے تم تمام بادلیاں کے سالار جانتے ہو کیوں کہ تم ہی اس طرف کے پورا اور ان کر کے کاؤنگ جانتے ہو۔“

مجھے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ اپنے عیار میں جلدی زد و مالانے میں کامیاب ہو جائوں گا۔ وہ کہا رہا تھا، ”اس کا وضع مطلب یہی تھا کہ اسے میرا اعتبار کیا ہے۔ وہ فریبی عالم اور عام محفل قوال

اسی کے سکے میں اسے جواب دینے کا فیصلہ کر گیا تھا۔ مقصد کے حصول کی خاطر اپنے والدین میرا ملازم قائم کر کے اسے اپنی طرف سے مطمئن اور محتاط کرنے کے ایک اور حربہ اپنایا۔ میں اس کے گمانے تک ایک

کہا۔ ”حضور! مجھے دروازے احسان میں قوال کر کے میں اپنی اس عزت افزائی پر ہمتا میں ناز کروں۔“

جتنی جھگڑا کر اظہار کروں، زیادہ نہ ہوئی۔ خواہش تو یہ ہے کہ اس کا شکر یہ باتوں سے نہیں ملے۔ علی اور اخلاص کی خدمت سے ظاہر کروں۔“

خوش پاشا اب بھی میرے چہرے کے سرسبز ہوا تھا۔ میری فریب برداری کے اظہار میں اس نے منہ اگڑے بقلم پاشا کے یہاں تھا چھوڑ دیا۔ چلا گیا۔ میں جیسے زیادہ اور اعظم اور قوی بنا ہوں۔ میں جیسے اور اعلیٰ منصب دے کر اپنا خیال بے دام بنا دوں گا۔

خوف سے مطمئن ہو جاؤں گا۔ اگرچہ ابویر کے کارنامہ بہت سے دشمن پیدا کر دیے ہیں، لیکن میں قتال دوست اور خیر خواہ بنانا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس حسن آقا کو جانے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”میری طرف

ملاں پاشا کو سلام پہنچاؤ گا۔ تمنا کہ میں یہ خیر و خوبی سے ان آگاہی پہنچے گا پھر ہوں۔“

اس اشارے سے مجھے روک دیا تھا۔ اس لیے حسن اذلیات بھلا کر چلا گیا مگر میں وہیں نہ معلوم کتنے دنوں تک منتظر کرنا چاہتا تھا۔ ”میں اس سال میں ہوا تھا اور وہ اپنی منہد سے اٹھ کر کرے میں ملنے لگا۔ اس کی دھاری دار رنگی باغیچے کے ساتھ گھٹ

اس کی اور سرد عمارت پر چمک رہا تھا۔ میں اس پر کھانا دانی مگر جلدی اپنی تھی۔ وہ میری اور سرچھا گیا کہ میرا چہرہ میرے دل کی جذباتی اظہار نہ کرے۔ اسی میں نے اپنے دل میں اپنے عزم کو دہرایا۔ میں اس کی سے جو چہرہ کا اختتام ضرور دل گا۔ میں اس وقت اس سامنے احاطت و فریب برداری سے متحسنا کا ہوں

میں دلن آئی کو سخت جذبات میں چلا گیا۔ ”ایسا غریب کوئی قلمی میرا ہے؟“ ہوا اور میں اسے اس کے قتل کرنا چاہوں تو مجھے کوئی نہیں روک سکا اور نہ کوئی میری کٹائی کر رہا ہے۔ دروازہ کھلا ہوا ہے جس سے میں

دل سکا ہوں، لیکن موت اس غریب سے کم میرا ہوا جو اپنے سوچا ہے۔ خوش پاشا! زمانہ دراز تک زندہ رہوں۔“ غریب نے غریب ہی غریب ہو کر تمہاری

القام کی خاطر زندہ رہو۔ خوش پاشا کچھ دیر کرے میں قتل کر میرے رو بہ رو آؤں گا۔“ خوش پاشا نے میری طرف دیکھا۔

میں نے نظر اٹھایا۔ ہم دونوں دیر تک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے۔ ”حضور! میں قتل کر لوں تو کس کو ہوتی۔“ تم نے مجھے سے کہا تھا کہ وہ میرا محفل کر گیا۔ یہ سچ ہے؟“

”جس حضور وہ مگر یہ۔“ اس نے یہ سکلون کو آواز میں بولا۔ ”میں کہہ چکے کہ اسے جو بوائی کی ترنگ کہ حضور یقین مائیں کہ اس نے اس تیرلی سے پہلے یہ مصائب ٹھیک۔“

مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔“ اس نے طویل اس کے کہنے کا جواب دیا۔ ”پھر مجھے کیا آفریں ہوئے کہ میں تمہاری بد قسمتی کا سبب ہوں، لیکن تم بھی یہی فریجی جانتے ہو کہ میں قانون اور انصاف کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔“

اب تم غالباً میری بات کی تردید کو بیچ کر ہو گے کہ میرا

اشارہ کس واقعے کی طرف ہے۔“ یہ گفتگو چھڑ کر وہ کھانا میرے زخموں کو کھینچ لگا۔ شاید اس طرح وہ میرے خبیث کا احسان لے رہا تھا، مگر میں خاموش رہا۔

مجھے خاموشی کی طرح اس نے پھر کہا۔ ”بولو محفل! میں حق پر تھا؟“

جس شخص نے ایک بے گناہ اور مصوم لڑکی کو دھوکا دے کر قتل کر دیا، وہی مجھے سے اپنی بے گناہی کی تصدیق چاہ رہا تھا۔ ایک بار میرا دوست سنا، مگر جلدی خود پر قابو پا کر اور کہا۔ ”یقیناً حضور حق پر تھے۔ اس طرح جانتا ہوں کہ قانون کا تقاضا یہی ہے کہ مجھے گناہ کے غلام بنایا اور جو اس کے بھانجے میں بد کرے، وہ دونوں کو بڑے موت کا حکم

ہے۔ آپ نے اس افغان لڑکی کو قتل کر دیا۔ میں عدل قادی ہے آپ کی شفقت و مہربانی نہیں کہ اسے میرے سامنے قتل کر دے۔ آپ کا اتفاق کیا اور مجھے سے درد کر رہی۔“

اس نے پھر خوش پاشا کے مجھے غور سے دیکھا، لیکن ظاہر ہے کہ اسے میرے چہرے پر اعانت و اخلاص کے سوا کچھ اور نظر نہ آیا ہو گا۔ لاکھ خوش پاشا کی باتیں نشریں کر میرے دل میں اثر رہی تھیں۔ چند سے وقف کے بعد وہ

حالت میں قتل کرنا، محبوب کو قتل ہوتے دیکھنے سے بہتر ہے۔ یقین کر کہ میں باہر اٹھا۔ میرے ساتھ یہ ظلمت پر ناز کرنے پر عزم ہوا۔ اس قتل پر خود کو کلام کی قیام میرے اس اعتراض کو قتل کر گئے تھے۔ وہ اور اس میری بڑائی کی

عوض مان لو گے جو میں نے تمہارے ساتھ کیا؟ یا میری معذرت سناؤں محفل تک پہنچاؤ؟ اور کیا تمہارا خیال ہے کہ وہ مجھے حلف کرنے پر راضی ہو جائے گا؟“

وہ یقیناً بڑا جہاں دیدہ اور زمانہ شناس شخص تھا۔ مجھے کیا اس طرح وہ میرے دل میں رہے۔ میرے ذہنات اور احساسات کو چھایاں دے کر پیش کے لیے سلاطین چاہتا ہے وہ اس طرح مجھے پوری طرح شیش میں انا رہا ہے کہ

اس میرے دل میں اس کی طرف سے کوئی کدورت نہ رہی تھی۔ تو قسم ہو جائے اس کا چہرہ اس کے نظریات ساتھ نہیں رہے۔ وہ اپنے دل سے جو کچھ مجھے کہا، صرف

میں نے اسی کے عاجزی کے ساتھ اسے تقابیل کیا۔“

حضور تو اس نری اور فوجی سے مجھے خرمندہ بنائے گا مارے
والے ہیں اس وقت پر بعضی عدل تھا حضور کا اعلان
افسوس وسیع انکسری کی دلیل ہے۔
”میں خود پاشا ذرا ساری طرفی جھکا اور بولا۔“
میں اپنے فعل میں معذرت تھا میں کہ مجھ پر غصہ غالب تھا
اور تم نے میرے لئے کو مزید بھڑکایا تھا۔“

”میں وہ نہیں ہوں بلکہ جس نے آپ کو فروخت کیا وہ
ایک اور ان خون خرابی کا نام وہ نشان تک نہیں
ہوا۔ اسے سمندر نے نکل لیا اگر مائیں ہی جانے کہ وہ
ایک بک زندہ ہے اور آپ کی باتیں سن رہا ہے تو ایسے عقیم
الشان کی تو اسے اور ایک شمشلی قتل پر افسوس ظاہر کرنے
سے متجب ہوگا۔ بہرحال اگر وہ سرکش بھی مجھے ملا تو میں
اس سے بے اغلائی عزت امتیازوں کوں گا تھے فراوان نہیں
کیا جاسکتا۔“ میں نے پوری پوری کو شکی کہ خروپاشا کو
اپنے دربار سے حاکم کر سکوں۔

مجھے دیکھ کر امتیاز ہوا کہ اس کے چہرے پر اب
فک و غم نے کتنا عیسائے سرت کے آثار تھے پھر اس نے
اپنی خوشی کا اعلان بھی کر دیا۔ ”میں اس وقت امتیاز
خوش ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میری اور تمہاری یہ ملاقات
یا دگر بن جائے۔ میں اس سالار کو تباہی چکا ہوں یہ بتاؤ
کہ کیا تمہاری پاس گھوڑا ہے؟“

”میں حضور“ میں نے انکساری کے ساتھ
کہا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ میں غریب آدمی ہوں۔ میرے
پاس ہاتھ بٹخوہ کے سو اچھ اور نہیں۔“
”سلطان نے مجھے ہار دیاب اعلیٰ نسل کے گھوڑے
بیچے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں ان میں سے ایک جیسے دتا
ہوں۔ اصل میں جاہر جو چاہو پسند کرلو۔“ میں نے
درمیان میں کچھ نہ کہا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے
مجھے چپ کرادیا اور کہا۔ ”میں اس وقت تمہارا
شکر یہ نکل کر نہیں چاہتا بلکہ تمہارے حسن خدمت سے
زیادہ خوشی محسوس کروں گا۔ کیا تمہارے پاس مکان
ہے۔“

”میں حضور! میں نے جواب دیا۔ ”میں حسن آقا کے
ساتھ چند روز ہی ہونے کا قہر کیا ہوں۔ مجھے اپنی فرصت
نہیں ملی کہ مکان تلاش کر سک۔“
”تم اب اس کی فکر نہ کرو!“ اس نے عبت سے کہا۔

”میں تمہارے لیے مکان تلاش کروں گا۔“
تمہارے حسب حال کوئی مکان نہیں کروں
قصر میں رہو۔ جاؤ اپنے لیے گھوڑا پسند کر لو
بھلا تمہیں گھوڑوں کی کیسی پیکان ہے؟“ یہ کہہ کر
اپنے ایک خواجہ سرا کو آواز دی اور حکم دیا۔
کہا پر لیے جاؤ اور گھوڑے دکھاؤ!“

میں نمانت میں اسے اس کے سامنے
مودب انداز میں پیچھے ہٹا اور پھر کمرے سے باہر
دروازہ بند ہو گیا۔ مجھے کچھ خروپاشا اور
سوچ رہا ہوا کہ اس نے مجھے خرید لیا ہے اور اسے
واقعی بدل کیا ہوں اور یہ کہ وہ کیسا خوش نصیب
اس کے ہاتھ گیا۔
خواجہ سرا مجھے اصل میں لے گیا اور اصل
دروازہ کو خروپاشا کا حکم پہنچایا۔ میرے سامنے
گھوڑے پیش ہوئے۔ میں نے ان میں سے
گھوڑے کو پسند کیا۔ کھرا عقیدہ یہ تھا کہ خروپاشا
ہو جائے۔ مجھے گھوڑے کی پیکان ہے۔
پھر کچھ ہی روز بعد میں خروپاشا کے قہر کے
میں داخل ہوا تھا۔ یہ خبر میری سکونت کے لیے
ایک قلعہ جب میں وہاں تھا وہ کیا تصویر دلی
لیں تک نہ گئی۔ یہ سرت کامیابی کی طرف میرے

کی تحقیر میں سوچنے کے اب تمام ہو گیا۔
اپنی اس تحقیر میں سنا پسند لیا اس نے شاید وہ
اس کی چکی پڑی یا اس نے اس کے برہنہ کی
کے میں“ ہرگز نہیں! مغرب وہ دیکھ لے
دشن اس سے بڑا ہے اور دروازہ کھلنے والا
خروپاشا وقت قریب گیا ہے۔ فطرت کی خند ہمارا
چنے ایک دن کھل کر آئے گا اور تمہاری بڑائی کا خاک
اپنے سامنے ڈیل کروں گا اور تمہاری بڑائی کا خاک
کا شکی کہ تو اس عذاب سے نجات پانے کے لیے
آزاد کروں اور وہ بھی پوری نہ ہو۔ یہی تمہاری سزا
قدیر ہے!

قہر بچنے کے بعد میں نے سب سے پہلے
حالات کا گہری نگاہوں سے جائزہ لیا۔ چند ہی دنوں

کی باتوں کا علم ہو گیا۔ مجھے یہ جان کر یزید حیرت ہوئی کہ
کے سردار اعظم اور امیر الامرا مختل مراد یک
ہوا۔ بلا میں ان کے اقتدار تھا۔ وہ قہر میں سکونت
کی۔ یہ اس کی مثال نہ تھی کہ اس کے عالی شان کے
تارکہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے برطانوی
ت کی براہ راست حمایت و تائید حاصل تھی۔ خیرہ
ایران اور مشین عورت تھی۔ وہ قامت کی موزنی
ایں ستائی اس کے اعضاء کے تاب اور حسن صورت میں
میں تھی اس کے علاوہ یہ تھی کہ وہ علاقہ کا راجہ
درم جزائی ایسے اوصاف رکھتی تھی۔ اس کے حسن کی
کا عالم یہ تھا کہ مسافر اسی کے حسن یا بیڑی کا
ہوئے سڑے تھے اور شہر اس کی اپنی شاعری
انوع کردیتے تھے صرف مائیں اس کے خشنوع
نہ تھے بلکہ انگریز بھی اس کے جمال کے عاشق
تھے جب پہلی بار جرنیل بالان نے اسے دیکھا تھا تو اس کے
روح اس کی بھی ہو گئے تھے اس نے بھی اپنی ساری
کی اپنی حسیں اور پروا عورت نہیں دیکھی تھی
اس کی کردہ تھی بھی خیرہ کے جمال کے حوالہ کی تھی
کہ جانتی تھی کہ سب اس کے شیدا ہو جائیں۔ قہر
کوئی ایسا نہ تھا جس کی ساعت خیرہ کے ذکر سے اور دل
کی متنازعہ دعا سے خالی ہو۔

ایں دونوں میرے علم میں یہ بات بھی آئی کہ ممالیک
ایرانی نے بغاوت اٹھائی تھی۔ وہ وہ میں وہ دھن نے
نے یہ ان میں سب سے بڑا گروپ عثمان کی برہنہ کی
”دوسرا گروہ ایک سردار اعلیٰ یک کا ہے اور تیسرا گروہ
ایرانی ایک نامی بھادر سردار کے زیر نگیں ہے عثمان
اور اعلیٰ یک دونوں خیرہ کے خون میں گرفتار تھے اور
میں میں وقت بھر رہتے تھے۔ اس وقت میں نے اپنی ساری
جس سے اعلان عتق کیا مگر خیرہ نے کسی کو نکل نہ کیا۔
ہوئے چاہا کہ ان کی رقیبت کر لے اور ممالیک متحد
ہو جائیں مگر یہ ممکن نہیں ہوا۔ مجھے یہ بھی خبر ملی کہ خیرہ
ایں دونوں کو میری طرف سے مختار رہنے کی تاکہ کی
سب اس کے عثمان کی اور اعلیٰ یک کے میرے سامنے کہا
کہ میں نے تمہاری کو دیکھا ہے اس کے بڑے سے
الہاں مندی ظاہر ہوئی ہے۔ بھادر بھادر اور اعظم ہے
اس کی آنکھوں سے شہر کی دہری اور لوزی کی

مکاری عیاں ہے۔ میرا دل اسے دیکھنے سے پہلے خوف سے
نا آشنا تھا۔ وہ سو بیار رہا اور اگر ممکن نہ ہو تو اسے
توڑلو۔ اسے اپنے ساتھ لانے کی کوشش کروا کر خیرہ
اس عتدش کامیابی ہوئی تو مجھے علی ممالیک کا پشت نہاں
جائے گا۔ وہ تمہاری سلطنت پر بھی تمہاری کامیابی کا نذر
دار ہوگا۔ پھر خیرہ نے عثمان کی اور اعلیٰ یک دونوں کے
ہاتھ پکڑے اور انھیں ایک ساتھ اغوا کر لیا۔ جاؤ بازار
میں مل کر نظر کا سب دیکھ لیں ممالیک کے دو بڑے
سردار مشتق ہو گئے۔ جب یہ خیرام ہو جانے کی تو پھر کچھ
خوف نہ رہے گا اور ممالیک کی تمام قوت یک جا ہو جائے
گی۔ تم ایسا ہی کرو اور سب پر ظاہر کرو کہ تم نے دوست
ہوئے ہو۔

اس عثمان بنے کہا کہ اگر کوئی ہم سے پوچھے گا
اختلاف کے بعد کی طرح اتفاق کر لیا ہے۔ ہوا ہوں گے
جاری سیدہ یعنی مراد یک کی بیوہ نے حکم یا اور ان کی
اطاعت کی۔

اعلیٰ یک بھی اس موقع پر غامض نہ رہا۔ ”یہ کہ ہاں ہم
کس کے کہ ہم اپنی سیدہ کے حکم کے بندے ہیں اور اسی کا
حکم مانتے ہیں۔“
پھر وہ دونوں خیرہ کے محل سے رخصت ہو گئے۔
ایک روز سالار ہوتی کی حیثیت سے یہ اطلاعات
میرے لیے شوشک تھیں۔ میں نے سب سے پہلا کام یہ
کیا کہ مجھے جس چاہا کا سالار کیا گیا تھا“ اسے از سر نو مرتب
کیا۔ لائق اور بھادر فوجیوں کو ترقی دی۔ ان کی عت
برصائی، حوصلہ افزائی کی۔ میں نے اپنے چاہیوں سے تقدیم
و تاخیر کا جو جود ستانہ دیا وہ رکھا۔ کوئی بھی معمولی چاہی
بلا و نوک کی بھی معاملے میں مجھ سے مل سکا تھا جب
کہ اس کے پہلے ایسا نہ تھا۔ افسر اور راجت کے درمیان جو
ایک صفحہ ہوتی ہے وہ قہر قرار دیتی تھی مگر میں اس صفحہ
کو پٹا تھا۔ اسی دوران میں تقریر کرنے کا ملکہ جو مجھ میں
فطری تھا“ اسے بھی میں نے جاری دیا۔ میں نے پھر جس
تقریر کے کہ اپنی چاہ کے سینوں میں جوش و جہیت کی
ہلگ بھڑکا دی۔ عت و مشت و خرات میں پڑنے اور
شجاعت دکھانے میں چاہوں کے لیے ایک مثال بن گیا۔
میرے اور ممالیک کے درمیان متعدد عمر کے ہوئے
سب میں میدان میرے ہی ہاتھ رہا۔ ان کے دو بڑے بڑے

مضبوط قلعے فتح ہو گئے۔

خوشبو! سناجھو سے بہت خوش تھا کہ میری وجہ سے اس کے بہت کاتھارہ ملوں گے۔ ہے اسی دوران میں مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ چکر اوری خواب دیکھنے لگا تھا میرے مصر کا تھامنا ملک اور مختار رہتا چاہتا ہوں تمام باتوں کے اوپر یہ حقیقت تھی کہ اسی محکمہ کی طرف سے اس کے دل میں چرچا تھا جس کا اظہار اس کی سنگتیں میں بھی ہو جاتا تھا۔ اسے غالباً ایشیہ تھا کہ ماضی کی شہادتیں جب میرے سینے میں بھڑک رہی ہے اسے مواقع پر اسی شہادت نری اور طاقت کا اظہار کرنا اور وہ مطمئن نظر آئے لگا۔

یہ ذکر بھی اسی دنوں کا ہے کہ ایک روز اس نے مجھے اپنی خلوت میں بلایا اور مجھ سے سوال کیا۔ ”محمد علی! تمہاری عمر کیا ہوگی؟“

سوال میرے لیے غیر متوقع اور عجیب تھا، پھر بھی میں نے ذرا توقف کے ساتھ مسکرا کر جواب دیا۔ ”جواب! مجھے ٹھیک سے یاد نہیں، لیکن حساب کر کے بتا سکتا ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب آپ سے قوالہ میں ملا تھا اس وقت شاید میری عمر پندرہ سولہ سال تھی۔“

ابھی اب رہتے دو میں خود حساب لگاؤں گا۔" خروپاشا بولا۔ "میں تین برس قوالہ میں رہا اس لیے جب میں وہاں سے چلا تھا تو تمہاری عمر اٹھارہ سال ہوگی۔ اس کے بعد میں نے بارہ سال آستانے میں اور یہاں گزارے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تمہاری عمر تیس برس ہے۔"

”جی ہاں۔“ میں نے آئندہ کی۔ ”مکرمیں ابھی سے بوڑھا
نظر آتا ہوں۔ مجھے جب اپنا ماضی نظر آتا ہے تو سوچتا ہوں
عمر نوح گزار چکا ہوں۔ ہاں اب میں بوڑھا ہو گیا۔ میری
جوانی کا زمانہ گزر گیا“ اب کوئی انگ اور ولولہ باقی نہیں
رہا۔“

ابے پہلے ہی خروپاشا نے میرے نچے معاملات پر
گنگو نہیں لی تھی لیکن اس دن وہ کسی اور ہی کیفیت میں
تھانہ مجھ سے اس نے پوچھا۔ "کیا تم اب تک مجھ کو دیکھا
تھامے؟ یوں ہی مجھے نہیں ہے؟"

میں جس وقت اسے اپنی یہی بچوں کو چھوڑ کر مہر آیا تھا،
خروپاشا کی اوچل سے اس زخم کو کڑوا کر دیا۔ میں نے سختی
سے ہونٹ ہچکچاتے کہے کہ یہ اختیار کوئی کب میرے
مذہب سے نکل جائے خدا معلوم وہ کیوں میرے زخموں کو

کرید رہا تھا! میری دانست میں وہ اس طرح میرے
اگ کو اور بھڑکا رہا تھا۔ جلد ہی میں نے خود کو
کے سوال کا جواب دیا۔ ”جناب! میری بیوی
شادی کر لی تھی۔ اس سے تین لڑکے، قوالہ
ہوں۔“

”صرف ایک بیوی!“ وہ عجیب سے انداز میں
 ”جی ہاں۔ زیادہ کی ضرورت میں نے محسوس
 بعض اوقات تو وہ ایک ہی بار معلوم ہوتی ہے۔
 حاکم قوالہ کی بھتیجی سے ہوئی ہے اور وہ مجھ سے
 کرتی ہے۔ میں اسے چھوڑنے کی کسی اور کی تلاش
 نہ کر رہا ہوں۔“
 ”کیا تمہیں بھی اس سے محبت ہے؟“ خسرو پاشا

"جنت! میں اس لفظ سے نا آشنا ہوں۔"
 اس نے کہا۔ "پتھن ہی سے بحث میرے دل کے
 سطح میں ہے چاہتا تھا کہ وہ جو ہر کا ذکر نہ کرے
 میری بات سن کر وہ فوراً سے شرم چھڑا۔"
 یہ کتاب ہے یہاں تک کہ بحث ختم اگر اس کے
 رف ہٹا کر نہیں گئی۔ یہ افراط خیال ہے کہ
 وہ کتنی ہی عمر کا رہا ہے جو اسے ممکن بحث کے
 لیے کتابت ہی میں ہوتی تھی۔ وہ اپنے دل
 کو کہہ کر جس میں اس کی خواہش خیریت اپنی

کی جاننے لگے تو کیا تم اسے اپنی دوسری بیوی
 بن کر کوئے؟ جو اب دو! میں تم سے وعدہ کرتا
 ہمارے لیے ایسی لڑکی تلاش کروں گا۔ میں تم
 سے یقین دلاتا ہوں کہ جب تم اگلے معرکے سے
 کامیاب و فتح مند! تو تم اس پر راضی ہو جاؤ گے اور
 ہمیں شہر کی طرف لے جاؤ گے۔

ان کی نافرمانی، نیکو فریب اور شور شول کو برداشت
سکتے سوہ چاہتے ہیں کہ ان سب کا فیصلہ کر دیں تاکہ
ہمارے ملک میں امن و امان بہ حال ہو جائے۔ تم
ابھی طرح جاننے ہو کہ یہ غرض ممالک کو ہلاک کیے
نہیں ہو سکتی۔^{۱۳۸} اس کا لہجہ رجوش ہو گیا۔

رسول! میں جانتا ہوں کہ ممالیک کی عمل پزارت ہے
 کی ہے۔" میں نے اس کی تائید میں کہا۔ "اگر ان
 ایک بھی بیخ گویا تو اپنے جاہ و جلال کو دوبارہ حاصل
 کو شش سے باز نہ آئے گا۔ وہ خیال کرے گا کہ
 رسول! کے حکم سے مصر کا مالک ہوں۔"

جلدی ان سے منٹ لوں گا۔" خسرو پاشا کی اس اضطراب علیا تھا۔ "ان کا کام تمام ہو چکا ہے۔ ہم ان کے زیر بار احسان ہیں کہ انھوں نے ممالک کے ان کی قوت کو بہت کم کر دیا۔ سلطان نے مزید روک تھام کے واسطے دوبارہ حکم صادر فرمایا کہ "اور" "مصر میں نہ آنے مانیں۔"

یہی ان کی زیادتی کی وساکل مسدود نہیں ہوئے
میں نے اپنی اطلاعات کی روشنی میں کہا۔ ”ان کا
اپر روز بڑھتا جا رہا ہے۔ میں نے یہ بھی سنایا ہے کہ وہ
میں اور البانی قیدیوں کو لے آئے ہیں اور احمد علی
پلے کے ساتھ بھی انھوں نے مستحکم عہد کیا

مقامی اطلاعات قلمی درست ہیں محمد علی! وہ خوش
 "مجھے خوشی ہے کہ حالات پر تمہاری نظر ہے اور
 تمہیں اور کان کھلے رکھتے ہو۔ ایک باصلاحیت
 کے لیے یہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے دشمن
 نظر رکھے۔ میں تم سے کچھ اور کہنا چاہتا
 اسلام آباد، عرب اور کئی دیگر ممالک میں بہت بڑا

تو میری شہر کا کام نہیں دے سکتی اور نہ ہی جیتے
حق سے اسے قطع نظر میری علم میں ہی بھی ہے
اے مراد بک کہ بعد ممالیک میں باہمی نزاع بہت
ہے ہر ایک کو مراد کی کیس ہو جسے صرف مراد
ان کی بات پر فرائض تھا۔ اس کے بعد کوئی ایسا نہیں ہوا
کی بات پر متفق کر سکا اور ان میں اتفاق کی روح
موجود تھی کچھ دنوں تک مراد بک، الفی بک اور
میرزا محمد علی بک کو فرائض کی شرکت تھی

حاصل ہے اور اگر البتہ برطانوی حکومت کی ذمہ داریاں تھیں اور یہ دونوں انہی میں ایک دوسرے کے متضاد تھے۔ ان کی دشمنی کے فائدہ ہمیں یہ بھی یاد دہارا کہ کام آسان ہو جائے گا میرے افسوس میں یہ کیا ہے کہ عثمان کی طرف ابراہیم کے لئے ہرگز جہل بیخوار سے وہ طلب کی ہے کہ وہ ترکوں سے ان کا پیچھا چھڑائے البتہ ان کے برطانوی حکومت سے وہ چاہی ہے کہ وہ ترکوں کو مصر سے نکالے۔ ہم دیکھ کر ان باتوں سے اندازہ ہو جاتا ہے، ممالیک میں یہ خوف زدہ ہیں وہ جیونی افریقہ کے دھارام مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں چاہیے کہ اس فرمت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور جیونی دہائے پہلے جس کے وہ تھے ہیں "خیں نہیں وائیں کہ انھیں بحر قلمیہ کی اہمیت ہے۔"

خبر و پاشا اپنی پوری بات تفصیل کے ساتھ کہہ کر جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”حضور کی بجز بہت مناسب ہے۔“ میں نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ ”تم سانپ کا سر پھیل دیں گے حضور کا حکم جابجہ مہر میں پھیل جائے گا۔ مجھے یقین کال ہے کہ قسمت نے حضور کو یہ مہر سر کرنے کے لیے مقرر کیا ہے۔ خادم کی آرزو ہے کہ اس مہر کی تکمیل میں اسے بھی مدد گاری کا شرف حاصل ہو جائے۔“

خوشو پاشا کچھ دور پہنچ رہا۔ وہ دھڑکے سے کھڑی
 غلاں تھا۔ پھر اچانک اس نے سر اٹھا کر کہا۔ ”معمولی! میں
 اس صدم میں تم پر حیرت کرتا ہوں۔ تم کو اغلاں ہی
 کے سبب میں غم سے افسردہ کرنا چاہتا ہوں۔ تم کے ممالک
 کے سوا اور اس کے اپنے قصور اور بدچلنیہ دیکھ
 ہیں اور اس کے ساتھ مجھے پانچ ماہ کی صلح کا بیڑام دے
 انھوں نے مجھے تسلیم کر کے فرار اور بدچلنیہ کی معرفت
 سلطان سے بھی صلح کی تحریک کر کے اگر مجھ کو بھی تو
 ورنہ ہر جنگ ہوگی۔ اس سلسلے میں تمھاری کیا رائے
 ہے؟“

”میرے خیال میں اس سے بڑھ کر اور کیا نادانی ہوگی کہ ہم انھیں اسے مقابلے کے لیے تیار ہونے کا موقع دیں۔“ میں نے بے شجک جواب دیا کیوں کہ ڈھکے چھپے لفظوں میں خروشا پہلے ہی اپنا منہ بے ظاہر کر چکا تھا۔ میں نے مزید کہا۔ ”ممالک بہت حلاک ہیں۔ وہ دفعہ ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵

سے مجھے چمکی پست کے ساتھ کس کرنا دہ رہی ہے۔ پھر اس نے میرے چہرے سے جلی انارودی اور کپڑا بھی منہ سے نکال لیا۔ اب مجھے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ رات چاندنی تھی۔ جلیدی نظریں میرے چہرے پر تھیں۔ میں بھی گمراہی گمراہی سانس لینے ہوئے کسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے متعلق اپنے ذہن میں خوش کنچھا تھا، وہ اس سے بھی کہیں زیادہ حسین اور پرکشش ثابت ہوئی تھی۔ صحراناکا چاند! میرے ذہن میں ایک شبیہ کوئی پھر خوشی میں نے اس کی ترویج کر دی۔ نہیں، جلید کے حسن کی مدح میں یہ مثال بہت چھٹی ہے۔

معاں اس کے یا قوتی کا بے اور شیریں آواز سنائی دی۔ اس کی آواز خوبیدہ سی تھی اور انداز خوشگامی کا۔ "میرے تو بہت خوب صورت ہے۔ یہ جونی میں کیسے سالار بن گیا میں تو سمجھی تھی کہ کوئی سفید ریش والا دوسرا ہوگا جس کے ساتھ چلے پڑے ترس کے لئے لیکن یہ تو قوتی ہے جو ان نکلا! اس کے لیے یہ بات تو اور بھی رنج کا سبب ہوگی کہ یہ ایک کمزور لڑکی کی قید میں ہے۔"

میں نے اس کی دل فریب صورت، روشن آنکھیں، سرخ لب اور دندان آبدار دیکھ کر طویل سانس لیا، پھر کہا۔ "اے جلید! تم مجھ پر افسوس نہ کرو! اگر میں اس آدمی کی قید میں ہوتا تو یقیناً مجھے شرمندگی ہوتی، میں تو اس وقت ہنستا ارٹھی کی ایک خور کاغذی ہوں اور اس کا قرب مجھے نصیب ہے۔ میری حالت قابل رحم نہیں، قابل رشک ہے۔"

اس کے چہرے پر جیسے خوشی کے رنگ ہی رنگ نکھر گئے۔ "تم جتنے خوب صورت ہو اتنی ہی خوب صورت باتیں کرتے ہو۔ تمہارا کہا ہوا ایک ایک لفظ موسیقی کی دلکش آواز کی طرح میرے دل میں ارتکاب ہے۔ اپنے ہائے کے ایک ایک بار میں نے شفا میں بھی ایک شاعر کی زبان سے ایسی ہی دلچسپ باتیں سنی تھیں۔" اس کی آواز پھر غنودہ سی ہو گئی۔ "تم ایسی ہی باتیں کیے جاؤ چپ نہ رہو۔ میں نے خود کو تمہاری محبت میں بہت بگاڑ چکا محسوس کر رہی ہوں اور وہ جو بھی فضاؤں میں ڈری ہوئی۔ تمہاری حزم تم کو آواز میرے لیے کتنی قیمت سے کم نہیں ہے۔"

"اگر میری آواز گیت ہے۔ جلید تو تمہاری آواز اس کی ہے۔" میں نے جواب میں بے خود ہو کر کہا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، "یوں کسی کوئی حسین خواب دیکھ رہی ہو۔"

ہر چند کہ میں سمجھ چکا تھا کہ میرے افواہ میں ہے پھر بھی تصدیق کے لیے اس سے سوال کیا۔ "کو کھاؤ؟" اسے شاید یہ خیال نہ رہا تھا کہ میرے دماغ میں ہے۔

اس نے آنکھیں کھول دیں اور نرم آواز میں تم نے ماری باتیں نہیں سنی! میں اسے دانا نہیں چاہتا کر رہی ہوں۔ میرے ہائے متان یکساں ہیں۔ میں اسے اس طرح میں چاہتی کہ وہ تم سے ملے لیکن اتنا ضرور چاہتی ہوں کہ وہ تم سے چاہے جس کے کل کے حرکت کے میں نہیں رہتی۔ میں دیکھ کے کہہ دیتے تھے۔ جونی! اگر مہماں کے تم سے کہیں خوف زدہ ہیں! تمہاری حفاظت کے کام میں ہیں اور یہ بھی نہیں ہے۔ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مہماں تک تم سے ناخوش اس نے میرے ہائے کو میدان قتال سے نہیں لے رہا۔ یہاں آجائے گا وعدہ کیا ہے۔"

جلید کھتی کھتی اور میں دل میں سوچ رہا تھا۔ دہشت کی وجہ سے مہماں مجھے میدان جنگ چاہتے ہیں۔ میں نے یقیناً پہلے غلط گمان کیا تھا۔ کی چال ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ قدرت راستے پر رکھ رہا ہے جس پر شاید مجھے ہاتھ ہوں۔ قضا قدر کا حکم ہے۔ کون جانا بہت دیر با تھو کہ جو کچھ میں اس سخت تک کہ میری ماں نے خواب میں دیکھا تھا! اور یہ وہی میرے اور میری سیمو جو ہر کے انتقام میں اور جلید کی نظریں بھی سے ملی ہوئی تھیں اور میری آنکھوں میں مستی کی پرتھیں اور اسی لیے بولی۔ "مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم اس خوش ہو!"

"ہاں اے جلید! میں نے اقرار کیا ہے۔" اچھا ہو نا کہ میری قید کی مدت دراز ہوئی! تمہارے حسن کا قیدی رہتا۔"

"میں دیکھتی ہوں کہ تم نے پھر شامی سرور ہو کر بولی۔" تم نہیں جانتے کہ میری

کے کھلے معلوم ہوتے ہیں! پھر ذرا وقت کے بعد کہا۔ "مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شاید تم مجھ کو ہاتھ اور پھر اس نے ان خرموں کو کھا کر دل کو تسکین دے گا۔" یہ کہ اس نے ہاتھ بڑھایا اور پھر خرمے نکال دیا۔ "کو کھاؤ؟" اسے شاید یہ خیال نہ رہا تھا کہ میرے دماغ میں ہے۔

جلید ان خرموں کو صرف تمہارے ہی حسین کر سکتے ہیں۔" میں نے اسے اپنی مجبوری کا احساس دلا دیا۔ "میرے ہاتھ میرے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔ غمی ہوں کہ میرے منہ کے قریب کرو۔ تمہاری لیس لایا۔ مجھ میں جان بڑھائے گی۔"

جلید خوشی سے مجھے خرمے توڑ توڑ کر ملائے گی۔ اور ان میں بار بار میرے لیوں نے اس کے حسین سے کھنکی کی۔ اس وقت میں جیسے سب کچھ بھول گئے۔ جلید کے سوا کائنات میں کچھ نہیں تھا۔ وہ مجھے بھی محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ لی خرمے کھا کھا تو جلید نے بے اہماری کا کہی اور کاندھ پر ہمت دور ہے اور صبح ہونے سے پہلے ادا ضروری ہے۔ میں ایسا نہ ہو کہ کچھ بدو راستے ہائے اور اس کے قیدی کو اپنے قیضے میں کر لے گا۔ پھر چرخ فشان اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ وہی اور باگ ہاتھ میں لے کر گئے کہ کہا۔ "اے دراجلدی کر جلدی!"

☆

جلید نے کو خوش قسمت کی اور پھر کو بھی تیرہ دنیا مگر مجھے سے پہلے سمجھ ہو گئی۔ اب سورج نکل آ رہا تھا۔ رات میں بھی اسے تیرہ دنیا میرے دماغ سے نہیں گزرتی تھی۔ میری وجہ سے کئی بار راستے میں دیر لینے کے اور آقا۔ پھر اس حالت میں سڑکا نکلا ہر کے کے تکلف وہی تھا۔ اگر میری وجہ جلید کے خوشی کی طرف نہ ہوتی تو شاید میں اور بھی زیادہ کھنک رہا۔

راقت جلید میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اب وہ بے تیرہ دور دور میں بھی اسی لیے اس کے چہرے

تم جانتے ہو تو چلے جاؤ
میری تو کوئی بات نہیں۔ مجھ کو نصیر آجائے گا

لیکن یہ آنکھیں
یہ آنکھیں دیدی ہیں
خواب بخو کی ہیں
یہ یکسب سستہ دیکھیں
یہ آنکھیں پتھر ایا ہیں

مجھ کو نصیر کی پھاڑ میں اک بیان بھی مل جائے گا
لیکن یہ روح
یہ روح آداسی کے مریں بھیجے گی
تنہا کی جاتے ہیں
سب آیتیں مل جائیں گی

میں غلط کے دامن میں اپنے ٹھول کے گھسیٹا ہوں گی
لیکن یہ بدل
یہ بدل ہے باؤں کا کس
جب دردنی شخ غلطے گا
مجھے ایک ہدایاں کر دے گا
صد چاک گریاں کر دے گا

تم جانتے ہو تو چلے جاؤ
لیکن مری آنکھیں میرا دل
مری روح ارا حاسن الم
میں سے ان کو کھائیں میں کیسے ان کو بہلاؤں
آئی کی بات بتا جانا
تم جانتے ہو تو چلے جاؤ

شبہ ہزار لہجہ

سے خوشی کا اظہار ہوا تھا۔ اس نے ہنس کر مجھ سے کہا۔
 ”یکو! آفتاب نکل آنے کے بعد ہمارا خیبر اتنا واضح نظر
 آ رہا ہے ایک محسوس ہوا ہے کہ ہم اور ہمارا خیبر دونوں
 ایک ساتھ دو رہے ہیں جیسے دونوں کو ایک دوسرے سے
 پیار ہو۔“

”ہاں!“ پیار تو ہے دونوں کو ایک دوسرے سے! اور
 شاید دونوں میں جلد ایک ہو جائیں گے کیوں جلد کیا
 ایسا نہیں ہو جائیں گے نا دونوں ایک؟“

اس کے چہرے پر پہلی بار حیا کی سرخی دوڑ گئی اور اس
 نے شرکاز منہ پھیرا۔ اس عالم میں وہ مجھ سے اور بھی حسین
 معلوم ہوئی۔ وہ میری وقتی بات کی گہرائی تک یقیناً پہنچ گئی
 تھی۔ چہرے بعد وہ حیا آلودہ لگی ہوئی۔ ”یہی خواہش
 نہ کرو جو پوری نہ ہو سکے۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے سوال کیا۔
 ”میں نے پہلے سے عہد کیا ہے کہ وہی شخص میرے
 قریب آگے گا مجھے اپنی ہوئی بنا کر اپنے نیچے میں لے
 جائے گا۔“ اس نے صاف گوئی اور مجھ کو یقین سے کہہ دیا۔
 اس کے لیے جس بڑی مصیبت تھی۔ وہ اپنی بات جاری
 رکھتے ہوئے مزید بولی۔ ”اسی وعدے کی وجہ سے پہلے سے
 مجھے باہر گھومنے پر مجبوری کی اجازت دے دی ہے اور نیچے کے
 اندر پردہ لٹکنی کا قسم میں دیا۔ میں اسی لیے اپنے چہرے پر
 نقاب نہیں ڈالتی۔ اب جب میں منظر کے نیچے میں جاتی
 ہوں تو یقیناً وجہ سے نقاب ڈالیں ہوں بلکہ اپنے ہونٹوں
 کو رکھتی ہوں تاکہ انہیں جس مندی میں لگتی ہوں۔“
 ”میرے خیال میں تمہیں اس کی ضرورت نہیں۔“ میں
 نے کہا۔ ”قدرت نے تمہارے ہونٹوں کو ایسا رکھ دیا
 ہے کہ کسی مصروفی رنگ کی تمہیں حاجت نہیں۔ اس طرح
 تو تم اپنی فرشتہ صورت کو عام غوغاؤں کی صورت میں بدل
 دیتی ہو۔ مجھے تو یہ خیال ملتا ہے کہ تم کو یہ شبہ کہ
 شاید ہمارا معلوم ہو رہی ہو۔ تم پر تو محو کی ملک ہو! میری
 آواز شدت جذبات سے کہنے لگی۔

”ارے!“ وہ ایک دم تیران ہی ہو کر بولی۔ ”تمہیں میرا
 یہ نام کیسے معلوم ہو گیا؟“
 ”کون سا نام؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میں محو کی ملک!“ اس نے کہا۔ ”میرے قبیلے والے
 مجھے محو کی ملک ہی کہتے ہیں۔ یہی میرے والد بھی اپنے

مخفی اطاعت اور ان سے محبت کرتے ہیں۔
 میری تعریف میں بھی بھلے سے کام لیتے ہیں۔
 تعریف کو کوئی اور سنی نہ پڑا ہے جاسم۔“
 ”یقیناً تم اپنی تعریف پر خوش ہوئی ہو!“
 ”اب میں تمیں چاہتی کہ میرے جیاد ہیں۔“

آجائے۔“ اس نے کہا اس کی باتوں سے ہلکا
 رہا تھا۔ یقیناً وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔
 ”تو تمہیں کیا کیا ہے؟“
 ”یکو! کیا تمہیں وہ سیاہ بلند مقام نظر
 آتا ہے؟“ اس نے کہا اس کی باتوں سے ہلکا
 رہا تھا۔ یقیناً وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔
 ”تو تمہیں کیا کیا ہے؟“

میں نے اس سے سرت اٹھائی تو مجھے ایک
 دکھائی دیا جس کا سر میرے چہرے کا تھا اور اس
 آنکھیں ایک سارے جہاں کو دیکھ رہی تھیں
 تھا جیسے وہ سارے جہاں کا حال بیان کر رہی
 بت کے چہرے پر ایسے آثار ہوئے تھے
 چہرہ پر اور جانتا ہے کہ خوش نہیں ہو
 دینا۔ شادی تو کیا ہے! اس نے شاید یہ
 سب باطل اور بے بنیاد ہیں! انہیں قرار نہیں
 اس بات کو دیکھ کر مجھے یہ بھی محسوس ہوا
 کی ابلہ فریبی دیکھ کر وہ مسکرا رہا ہو اور اس
 انکار کے اس نے اپنی تین صفات بیان
 کی طرف اشارہ کر دیا کہ بلند کرنا ہو اور اسے
 اسی حال میں پہلے سال سال گزر گئے ہوں۔
 صدیوں سے مسکرا رہا ہو اور اس کے مسکرا

آیا ہو۔ جیسے وہ دیکھ رہا ہو کہ قریب ہوا
 تھا۔ ہاتھیں بدل رہی ہیں۔ یادداشتیں بدل رہی ہیں۔
 رہے ہیں اور قریب یادداشتیں بدل رہی ہیں۔
 رہی ہیں۔ خیالات بدل رہے ہیں۔ تفسیر کی
 نہیں رہنے دے رہا لیکن وہ اپنی حالت کا
 کچھ دیکھ اور سن رہا ہے اب اس کی بات
 کیا ہے اس سے بے ڈرتے ہیں وہ کسی
 شاید اس وجہ سے گواہ ہے اب اول سے
 معا۔“ میرے خیالات کا سلسلہ جلد
 گیا۔ جب اس نے مجھ سے کلام کیا تو مجھ

میرے چہرے سے دل کا حال لیا ہے وہ کہہ
 ”میں محو کی ملک ہے بادشاہ اور امرا مواد
 کی اس کے سامنے سر جھکا رہے ہیں۔ اب
 کے پاس سے گزرتا ہے تو اس کے قدم جیسے غلاب
 ہاتھ ہیں۔ وہ اس کے سامنے گڑا ہو جاتا ہے اور
 دودھ عطر کرتا ہے۔ یہ کہہ کر مجھ سے فخر و کثافت
 دلاؤں میں کھنکھ کا کھنکھ۔“
 میں نے دیکھا کہ مجھ کے چہرے کو کراس بت کی
 تھی۔ جب وہ اس بت کے رویہ پر پہنچ کر کوئی
 سامنے بالکل سخی سے نظر آنے لگی۔ اب وہ
 اور اٹھا اور ناک کاغذ پر تھی۔

کوئی آواز نہ تھی بلند بھی کہ میں صاف طور پر سن رہا
 رہے ”یہ میرے چہرے، میرے چہرہ اور میری کل
 حفاظت سے رکھ!“ وہ اپنی دھال مجھے بھی نہ
 لی! مجھے یقینی دے کہ میں اس قیدی کے ساتھ
 بات کر اور اس نے اپنے ہاتھ سے ہوا لی! مجھے
 کہہ رہی تھی قوتیں اور ہمت دے۔ ”وہاں سے فارغ
 ہوں!“ اپنی اور چہرہ دو بار سوار ہوئی۔
 ساتھ ساتھ چہرے پر ہاتھ میں اسے اس وقت سے
 کہ وہ ابھی تک خوشی و غصہ کی حالت میں معلوم
 کیا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں اپنے چہرے
 کیا ہے یقیناً اس کے پاسے ثابت میں خوش
 رہا ہو گیا تھا۔ وہ یہ دعا نہ کرتی کہ خدا اسے اس
 کا قہر کرے۔

میں نے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ مجھ سے یہ مہر
 کی۔ وہ ایک طرف اشارہ کر بولی۔ ”یکو! یہ
 ہاں مصر کے معبرے ہیں۔ یہ جو سامنے اہرام نظر
 اس کے مقابل ایک اور اہرام ہے یہ اہرام
 نام سے مشہور ہے۔ اہرام کیسے ہاں گورستان ہے
 قریب درمیں کا شہر ہے۔ ہمیں اس میدان کے
 ایک قبیلہ نظر آتا ہے وہاں ہو گا۔ وہی یہاں کا خیر
 کی وہیں جاؤں گی۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔
 اس نے چہرے پر لگام ڈال کر۔ چہرہ تیزی سے
 کا اور وہ نقطہ آہستہ آہستہ بنا ہوا ہے لگا جس کی
 لی مجھ سے تھی۔

کچھ ہی دیر بعد پھر اس جگہ پہنچ گیا۔ بدو رک گیا تو
 جلد سے اسے جھٹکے کا کھنکھ پڑا۔ ”چہرے سے کہا۔“ اسے
 غریب الوطن! ہاں ہمارا سرخ سر ہو گیا۔ یہ میرے باپ کا
 خیر ہے میں یہاں کشادہ دل اور خندہ پیشانی سے تمہارا
 استقبال کرتی ہوں۔ یہ اللہ کر کے اس میں داخل ہو
 جاؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی مثال محل کی جس سے مجھے چہرہ
 کی بات نہ رہا تھا۔

اس کے بعد مجھ سے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر نیچے میں
 لے گئی تو میں تیران ہوا۔ اس نازک بدن حسین میں
 اتنی قوت ہوئی یہ میرے کمان میں بھی نہیں تھا۔
 نیچے میں لانے کے بعد اس نے مجھے ایک مسند پر بٹھایا
 اور بولی۔ ”میں تمہارے لیے ابھی کھانا لے کر آتی
 ہوں۔“ کہہ کر وہ ہٹ گئی۔

میں گزشتہ واقعات اور اکیلی چھٹی آرزوئیں جیسے اس
 وقت سب بھول گیا تھا۔ مجھے ابھی وہی قوت صرف جلد ہاں
 اسی کے ساتھ مجھے یہ رنج ضرور تھا کہ رات کو قوت میں
 جیت رہا۔ سالار جی نے میں سوا تھا اور اس وقت میری
 حیثیت ایک قیدی کی تھی۔ میں گھوٹے کا اس وقت میں
 ایک بدو کے نیچے میں سفید ہوں۔ میری پہاڑ جب سو کر اٹھی
 ہوئی اور اس نے اپنے سالار کو نیچے میں پہلایا تو میرے
 بولا نہ قرار پر کئی ہنس ہوئی۔ میرے پاسی اس کے سوا اور
 کیا سوچے اس نے میدان جنگ سے خوف زدہ ہو کر راہ
 فرار اختیار کر لی ہے میں اس وقت اس قدر رنج کے عالم
 میں تھا کہ مجھے یہ ہوش بھی نہیں رہا کہ جو سوچ رہا ہوں
 اس نے اپنی زبان سے بلند آواز میں کتنا بھی جارہا ہوں۔ اس
 بات کا احساس نہیں اس وقت ہوا جب میں نے جلد کو
 آتے دیکھا اور ایک دم جب میں ہو گیا۔

اس نے یقیناً میری باتیں سن لی تھیں اسی لیے آتے ہی
 کہنے لگی۔ ”تمہاری بات سن کر مجھے یہ رنج ہوا۔ جو کہ تم
 کہہ رہے ہو اس کا مجھے بھی خیال ہے۔ لیکن میں کتنی ہوش
 کہ تمہارے لیے قید ہونا کتنی شرم کی بات نہیں ہے
 میرے بلایا پورے میں نزدست ہوا۔ میرے تصور کے
 جاتے ہیں۔ سب قبیلے انہیں دوست رکھتے ہیں اور ان کا
 ادب کرتے ہیں۔ تم کسی معمولی آدمی کے ہاتھوں قید نہیں
 کیے گئے۔ مہر حال اس کے باوجود میں اپنے اس فعل کی
 معافی چاہتی ہوں کہ ہمیں قیدی بنا کر یہاں تک لائی۔ میں

نے جو کچھ کیا صرف اپنے بابا کے حکم پر کیا ہے۔“ طیٹھ کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔

”ٹیٹھ! میں تمہیں برا نہیں کہہ رہا۔ میں نے نرمی سے کہا۔ ”لیکن کیا تم سمجھتی ہو کہ مرد کا خصوصاً ایک سپاہی کا قید ہو کر آنا باعث ننگ و عار نہیں؟“

”مجھے اس سے انکار نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ایک بہادر سپاہی کے لیے واقعی یہ بات بری ہے۔ تمہیں اس حال میں دیکھ کر خود مجھے بھی رنج ہے۔ لیکن کو کہ میری دلی خواہش ہے، تمہاری مصیبت کو میں کسی طرح ہلکا کر دوں، مگر کیسے؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”اگر واقعی ایسا ہی ہے اور تم غلوں دل سے یہ بات کہہ رہی ہو تو اپنے والد کے آنے تک میرے پاس بیٹھی رہو۔“ میں نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ ”ہم باتیں کریں گے۔ تم مجھے اپنا حال سنانا۔ تمہاری جادو بھری آواز مجھے ایک اور ہی دنیا میں کھینچ کر لے جائے گی اور پھر اس دنیا کے سارے الم بھول جاؤں گا۔“

”میں اگر تمہارے پاس بیٹھ بھی جاؤں تو اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔ ”یہ تو محض خود فریبی ہوگی اور میں اپنے بارے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”کیا جانتی ہو؟“ میں پوچھ بیٹھا۔

”یہی کہ مجھ میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تمہیں تمہارے خیالات سے باز رکھ سکے۔“ اس نے میرے سوال کا جواب دیا پھر بولی۔ ”اس کے علاوہ یہ کہ مجھے کھانا بھی پکانا ہے جو ضروری ہے۔ ہاں ایک صورت ایسی ہے کہ تمہاری تسلی بھی ہو جائے اور میں بھی اپنا کام کرتی رہوں۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے چہرے سے میں نے سمجھ لیا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے۔

جب وہ دیر تک کچھ نہ بولی تو مجھے اس کو ٹوکنا ہی پڑا۔ ”کیا صورت ہے وہ؟ بتاؤ نا۔ ٹیٹھ! جب کیوں ہو گئیں؟“

”مگر تم قسم کھاؤ کہ فرار ہونے کی کوشش نہیں کرو گے تو میں تمہیں رسیوں کی گرفت سے آزاد کر دوں۔ میں جس خیمے میں کھانا پکاؤں گی وہاں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“ اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی جسے کہتے ہوئے جھجک رہی تھی۔

میں نے اسے بڑی حیرت سے دیکھا، پھر بولا ”ایسی

صورت میں کیا تم مجھ پر بھروسہ کر لو گی؟ کیا تمہیں کہ میں قسم کھا کر اپنی آزادی کی خاطر اس سے کہہ دوں گا؟“

”اگر کوئی اپنی قسم توڑ دے تو پھر دنیا اور دنیا کی ایسی رہائی سے کیا فائدہ! میں نے بار بار اپنے دل پر کہہ آدی وہی ہے جو مرتے دم تک اپنے عہد اور اپنی قائم رہے۔ ہاں جو ان مرد اپنی قسم کو پورا کرتا خلائی اور بد عہدی بزدلوں کا کام ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں جو ان مرد ہوں اور نہیں ہوں؟“ میں نے سوال کیا۔ ”تمہاری صورت اس پر شاہد ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس بحث میں نہ پڑو، میں پھر کہتی ہوں قسم کھا لو کہ میں تمہارے والد کے آنے تک تمہیں گالتو میں ابھی تمہاری رسیاں کھول دیتی ہوں۔“

مجھے اس معصوم اور بھولی بھالی لڑکی پر بڑی حسرت میں نے اس محبت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ جو ان مردوں کی طرح تم سے عہد کرتا ہوں اور عہد گواہ ٹھہراتا ہوں، قسم کھاتا ہوں کہ تمہارے والد کے آنے اور ان کے رہا کرنے سے پہلے یہاں سے نہیں لے گا۔ میں تمہارے پاس رہوں گا اور تمہیں بلا کسی طرح رنجھتا رہوں گا۔ کیا تم مجھے اپنی غلامی میں لے لو گے؟“ آخری جملہ میں نے دانستہ ذوق معنی کہا تھا۔

ٹیٹھ نے ظاہر کیا جیسے میرا آخری جملہ اس نے نہ ہو۔ وہ جھینپ مٹانے کے لیے سرنجاپ کے چھوٹے گرفت سے آزاد کرنے لگی۔ جب رسیاں کھل گئیں تو نے کہا۔ ”کھڑے ہو جاؤ تم آزاد ہو گئے۔“

رسیوں کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی میرے دل میں وہی خواہش ابھری جو دیوانہ کیے دے رہی تھی۔ جیسے خود بہ خود میرے ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔

وہ فوراً ہی میرا ارادہ سمجھ گئی اور پھر قائم چو کڑی بھر کر کسی ہنسی کی طرح چھلانگ بھرتی در تک جا پہنچی۔ پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ ”میرے احسان کا بدلہ ہے؟ کیا میں نے تمہیں برا کیا؟“ اس کے لہجے سے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

”میں اس کی بات سن کر شرمندہ سا ہو گیا۔ ندامت سے جھک گیا۔ مجھے یقیناً بے لگام ہو گیا۔

احکام کو ٹھیک نہیں پڑھتا چاہیے تھی میں نے اہتمام
نہایت کی خاطر کیا۔" عید اہم حق پر ہو۔ میں سخت
شرمندہ ہوں مجھے معاف کر دو۔ اب میں تمہارا قیدی
ہوں۔ تمہارے حکم کے بغیر میں بولوں گا بھی نہیں۔ تم جو
تعمدوں میں رہی ہو گی۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم آزادی سے مجھے کے اندر ہو۔"
اس کے لیے میں اب تیری بھی۔ "تم آزاد ہو لیکن مجھے
سے باہر ہرگز نہ نکلتا جب کوئی مجھے کے سامنے سے
گزرتے تو ہاتھ پکڑ لیتا۔ میں مجھے کے سامنے سے باہر
پوری آزادی سے باہر نہ نکلتی۔ میں شام کا ہے اور اس
میں بغیر اجازت کوئی داخل نہیں ہو سکتا حالانکہ اس مجھے
میں کوئی عورت نہیں رہتی اس کے باوجود کوئی شخص اندر
داخل نہیں ہو سکتا۔ میرے باپ، عورتوں کو پابند کرتے
ہیں۔ وہ میری والدہ اور میں دونوں سے اس کی باتیں سنتا
ہاں اب وہ اندر آئی تھی اور مجھے اپنے ساتھ ساتھ میری
لیا تھا۔ "میرے باپ نے بارہ شاواں میں، لیکن کسی کو پیشہ
کے لیے اپنے اس نہیں رکھا۔" وہ مجھے دیکھ کر کسی شایہ
اپنے ذہن میں افلاک کو تزیین دے رہی تھی۔

"پھر وہ کہاں گئی؟" میں نے تجس کے سبب زیادہ دیر اس
کے بولنے کا انتظار نہ کیا۔

"کیوں کیا نہیں ہے؟ قصہ چھپ معلوم ہو رہا ہے؟" وہ
مسکرا کر پوچھ گئی۔

"ہاں۔" میں نے اقرار میں کر لایا۔

"آج پھر سو! اس نے طویل مہینے کے لیے کہا۔" ہاں
نے انھیں ان کے گھر والوں کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان
عورتوں سے کچھ قاعدہ میں ہے۔ سوائے ایک ایک اور
غبت کے انھیں اور کوئی کام نہیں ہے۔ سب وصیت کم
کرنے کی بجائے اسے بڑھاتی ہیں۔ میں، ہاں، پہلی پہلی یوی
سے ہوں میرے سوانہ کے کوئی والدین نہیں ہوتے۔ وہ مجھے
سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اب تو اور بھی زیادہ بیکوں کہ میں
خدمت کرتی ہوں اور انھیں جو حاجت ہو اسے حتی
الامکان پورا کرتی ہوں۔ میں دونوں ایک دوسرے سے الگ
ہو کر نہیں رہ سکتے۔ میں ان سے کوئی والدین نہیں ہوں اور وہ مجھے
سے پناہ چاہتے ہیں۔ میں نے انی وجہ سے اپنے دل میں
ٹھان ہی ہے کہ شادی میں کوئی اور تمام مرا عہد پائے

ساتھ رہوں گی۔"

"تم شاید اس وجہ سے اپنی باتیں کر رہی ہو
ابھی محبت کا تیرے تمہارے دل میں تازہ نہیں
معا" میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ "اب
کیا بتاؤ گی کیا تم مجھے مجھے اپنا دوست
کر دے گی؟"

عید نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں
کے چہرے پر اچھل اور دل دے دے کے
مجھے پھر وہ تھا۔ "مجھے ٹھہری ہوئی۔"

"کہاں چلیں، عید؟" میں نے مضطرب ہو کر
"میں کھانا پکانے جا رہی ہوں۔ اب اس وقت
انتظار کرو۔" وہ یہ کہتی ہوئی مجھے کے در کی طرف
پھر میرے مجھے مجھے مجھے کا وہ ادا کر گیا۔

"میں تمہارا یہ خیالات چھوڑ کر اپنے
ہی خیالوں میں اپنے دل کو قرار کا پتلا اور
جو ہو کی صورت ابھر آئی۔ وہ میری ہی طرف
اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رکھا۔

یوی عید کا خیال کیا جس کے ساتھ میں
کڑا رہے تھے۔ وہ مجھے اپنے کی ماں میں جن
دم مجھے رہا تھا۔ اس دن میں نے مجھے اپنے
میرے پنے کے حال میں ہوں گے اور عید عید
عید اور یوی کی یاد تازے گی۔ میں اس کا
میں تھا جب عید نے میرے زخموں پر اپنی
رکھا تھا۔ اس نے مجھے موت کے منہ سے
شاید میں زندہ نہ بچتا۔ اس بات کو برسوں
عید جوانی تھا، مگر آئی کا دل بیشہ جوان رہا ہے
میں ہو۔ ہر روز اس میں ہی محبت پروان چڑھ
وہ ہر ہی محبت کو اپنی محبت ہی تصور کرتے ہیں۔
ہی کا قصہ سمجھتا ہے۔ اس کی محبت میں مجھے
احساس بھی ہوا کہ اس صورتی عید کی عید کی
دل میں کھر کھر ہے۔ اگر وہ کسی شے کی بی بی ہو
کوئی چرس کو بڑی وہ تو بھی شادی کرنے
کے لیے میں ابنا جب کچھ ترانہ کرتا۔ پھر
کڑھائی ہے۔ کوئی کی اسے فطرت کو کھنڈ نظر
دن فطرت نے چار سوڑے کے کی اجازت دی
کیا منتظر اور فطری حکم ہے! میں سوچنے لگا۔

لوٹ قسمت ہوں گا جب۔ عید میری دوسری یوی بن
گئی۔

اسی میں انہی خیالوں میں کھیا ہوا تھا کہ عید ایک
ہاں خرسے، "کیلے، روٹی اور مکھن کے کر پائی۔ اس
ملاقات میرے سامنے رکھ کر اور بولے۔ "میں معزز
ان کھانا کھاؤ اور تم ساتھ کھائیں گے کہ دو سنی اور
ہاں کی پکان ہے۔"

اس نے طہاق سے ایک روٹی اٹھا لی اور اس کے دو
تکے کے آدھی روٹی اسے دے دی۔ پھر میں دونوں
نے کھائے۔

اس دوران میں عید بائیں کر گئی۔ وہ مجھے میں جو
کم کرتی تھی اس کا ذکر پھر دیکھ کر میں نے یوی کی کتنی
اور اس کی طرح بتائی ہو۔

میں دینا چاہتا تھا کہ ربا تھا اور مجھے اپنا بچپن یاد آ رہا
میں دنیا میں اس کے خیر۔ عید کی خیر تمام باتوں میں
ہاں مگر کچھ دیر بعد مجھے بھیے ہو ش آیا۔ میں نے
اس وقت یوسف کی اور مایک کے درمیان
بہت جنگ ہو رہی ہوئی۔ اگر اس جنگ میں یوسف ایک
آ گیا تو اس کا نتیجہ میرے حق میں بہتر ہو گا۔ لیکن
اس میں شک خورہ ہوا ایک مجھ پر قابو یا کچھ سے
میں نے جنگ کے ساتھ بدلے کا اور مایک کی طرف ہونے
یوسف کی بھاگ تو بھی بی نتیجہ ہو گا۔ یوسف کی
آواز پیا شے کا کہ خدایت کا اور مجھ پر
ن کا الزام لگائے گا! ہاں خدایت کا الزام اسے لگانا
ہو گا کہ مجھ پر کیا کڑی ہے! وہ تو یوی سوچے گا اور
ہے کہ میں دانستہ رو پیس ہو گیا ہو۔ میں ان
بے انتہا مضطرب ہوا کہ اپنی جگہ بیٹھنا نہ سکا اور
بے انتہا۔

عید نے مجھے مضطرب ہو کر اٹھ کر دیکھا تو حیرت سے
کہ "کیا ہوا؟"

"مجھے نہیں۔" میں نے اپنی حالت پر پردہ ڈالنے ہوئے
کہا۔ "میں تیرے ساتھ شریہ ادا کر رہی ہوں کہ
مجھے کھانا کھانا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میرے سوا
روزانہ کے کام کاج نہ چھوڑ دو۔ تم میری شادی کا کوئی
نہ کرو؟" دراصل اب میں واقعی تنہا چاہتا تھا۔
اپنی کیفیت بدل چکی تھی۔

نہ جانے کس طرح عید کو بھی اس بات کا احساس ہو
گیا۔ اس کے لیے سے دل کشگی کا صاف اہتمام ہو گیا۔
جب اس نے کام کیا۔ "مجھے پہلے ہی اس کا خیال تھا
چاہے قاعدہ میں جاتی ہوں کہ آپ کا سامانی مرتبہ شخص
اسی کو لڑائی کی باتوں سے خوش نہیں ہو سکتا۔ اب میری
زیادت سے درگزر کرنے میں جاری ہوں۔ اسی کے
ساتھ میں نہیں رہ سکتی کہ اب اپنے وعدے کے مطابق
مجھے سے باقی رہیں رہیں گے۔"

"میں سلسلے میں تم مجھ پر عمل اختیار کرتی ہو۔" میں نے
اسے یوں دلایا۔ "میں گزرتا ہوں نہیں ٹھکان گا۔ میں تمہارا
قیدی اور غلام ہوں۔ ہاں میں تمہارے خیال سے کہیں
زیادہ تمہارا قیدی ہوں۔"

میری بات سن کر اس کے لبوں پر تبسم آیا۔ شکر ہے
کے اہتمام میں اس نے میرے سامنے سر جھکا دیا اور پھر چلی
گئی۔

پھر میں سارے دن مجھے میں تنہا رہا۔ نظرات مجھے
گھیرے رہے اور تنہائی نے مزید بھگان کر دیا۔ عثمان یک
برسی اور اس کی فوج کی خبر سننے کے اشتیاق نے مجھے
بے چین کر رکھا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر جنگ کا کیا
فیصلہ ہو گا۔ کون کب جاب ہو گا؟ مایک یا یوسف کی؟ شخ
طشان ابھی تک میں کوئی حلالہ نہ پورا دن کرنا چاہتا۔
اس پر مجھے اور میری بڑت تھی۔ میں مجھ ہا تھا کہ شام
ہوئے ہوتے آگے جانے میں اس دوران میں عید کے
دیوار سے میری خرم ہو رہا تھا۔ وہ دن مجھے بہت حسین دکھانا دیا۔
اسے میری زندہ خاطر کی کا خیال تھا۔ اسی نے نہیں آئی۔

جب آفتاب خوب ہو گیا اور اندر میرا ہر طرف چیل گیا
تو اس نے مجھے میں اگر چراغ روشن کیا۔ چراغ کی لو کے
سامنے اس کی خرم ہو رہا تھا۔ وہ بہت حسین دکھانا دیا۔
پھر وہ مجھ پر ایک نظر ڈالتی ہوئی بیٹھنے کے لیے سے نکل
گئی۔ جب وہ چلی تو اس کے ہاتھ میں کھانے کا ملباق تھا۔
میں دونوں سے مل کر کھانا کھایا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنا غم
غلط کرنے کے لیے اس صحرائی دھڑو سے بائیں کر دوں۔
عید نے میری شاید میرے لڑائی کو مانگ لی۔ اس نے
بچی نگاہ کے ہوئے دریافت کیا۔ "تم اب تک رنجیدہ
وہ ہیں؟"

”ہاں۔“ اقرار کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔
 ”تو تیس تھما رہے ہو۔ بلائے کا سامان کرو! تم
 یقیناً خوش ہو جاؤ گے۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ ”مجھے
 معلوم ہے کہ تم بول رہا ہو۔ تماری بلند پرواز حوصلوں
 کے لیے یہ خیر بدعت تک ہے۔ تمہارے حوصلے چاہتے
 ہیں کہ وسیع خوش فہمی اور اپنے ناپائیدار پسند
 ”تمہیں کیا معلوم کروں! شاد اور خوب صورت ہے؟“
 میں نے مسکرا کر کہا۔

نوجوان کہتا ہے کہ اے نازنین! میرا دل لے کر کہاں
ہو؟ میری طرف دیکھو اور اپنے عاشق پر رحم کرو!
مجھ پر اس گیت نے ایسی بے خودی طاری کر دی
بھی اس کے بول دہرائے لگے۔ میری مخاطب ظاہر
میلہ ہی تھی۔

قارئین کے مسکراتے سوالوں کے کھل کھلاتے جواب

شہباز مرزا کے قلم کے بیبک کیاے

بتکلف برطرف

○ صرف ایک آنکھوں کی زبان!
○ لوگ اس کی بجائے جنگ بند کیوں ہو گئے ہیں؟
○ پہلے یہ بتائے کہ ”لوگ“ سے آپ کی مراد کون ہے؟
○ یہ تو بڑی واضح بات ہے کہ لوگ؟ یہ آپ کی اس لیے
پوچھ رہا ہوں کہ ساخرا دل میں دس بار اس قسم کے خطے
بوتی ہیں ”لوگ“ سے کتنے جھوٹے ہیں۔ ”لوگ“ کے تہذیبان
ہیں ”لوگ“ سے جانیں ہیں مگر اپنے آپ کو کیا سمجھتے
ہیں! ان کا رویہ تو ہے کہ ہم تو لوگوں کی طرف نہیں
بلکہ بااثریت مصلحتی چاند، سلیم فاطمی پریز، بکرا کی
طرف ہو آئے۔ یہی غری ہرگز نہیں!

میں کوئی باور
محبوب کو چاند کیوں کہے ہیں سورج کیوں نہیں کہے؟
اس کی وجہ یہ ہے کہ محبوب کا سورج ہو سکتا ہے جبکہ
سورج کا نہیں ہوتا۔ جو لوگ اپنے نام کے ساتھ "چاند" کے
اضافہ کروا کر خوش ہو جاتے ہیں جیسے معافی چاند
کہ اس کی شکل معنی چاند ہے بھی سچ بتا دے
خدا تعالیٰ بھی اپنے آپ کو چاند سمجھ کر نہال ہو جاتا
ہو دوسری خاتونیں گلی سے گزر کر تھیں کہ دور سے
دیکھ کر آواز نکالتی تھیں۔ ایک خاتون نے سہکراتے
کہے دوسری سے سرگوشی کی "کونسا چاند ہے؟"
"اچھا" دوسری جیت سے بولی "اس کی بیگنا خراب

ایک صاحب نے اپنے دوست سے کہا: "میرے
پندرہ سالہ قبلہ شادکے کتے تھے، شادکے بارہ
سالہ میرے بچے سے سکونت اور اطمینان سے گزر رہے
تھے کیا ہوا؟ دوست نے پہچان۔
"میری بیوی کل بارہ سالہ بعد تھیک سے واپس آ
گئی ہے۔"

انجمن جاریہ نہیں ہر

"ہاں ہاں" دوسری نے ماضی میں جھانکتے ہوئے کہا۔
"کیا ہوا اسے؟"
"اب میرا شوگر ہے اور باقی باتیں الٹی ہو گئی ہیں۔"

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اسد ظفر: فیصل آباد
○ نظری ٹیک گائے کے باوجود اندھیرے میں کچھ نظر
نہ آئے؟
○ بی بی بن جایا کچھ پہلی ملی۔
ایک تجزیہ کار چور سے شاد کو کھلی تجزیہ کرانے کی لیے
رات کے وقت ایک کھن میں داخل ہوا۔ کمرے میں کھپ
اٹھا۔ کراخا۔ تجزیہ کار چور کی نظر کرایا تو مالک مکان کی
آنکھ کھل گئی۔ وہ بولا: "کون؟"
تجزیہ کار چور نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے "میاؤں
میاؤں" شروع کر دی۔
مالک: "بھش کرے سو کیا۔ چند لمحوں بعد شاد گرجی کسی
چیز سے کرایا تو مالک پر جاگ اٹھا اور بولا کون؟"
تجزیہ کار نے بے ساختہ کہا: "دوسری ملی"
تجزیہ کار خود ہی سمجھ گئے۔
○ انسان اور جانور خدا انسان میں کیا فرق ہے؟
○ اگر میں جواب میں یہ کہوں کہ جو مجھ میں اور آپ میں
ہے، تو آپ ناراض ہو جائیں گے لہذا کوئی اور سوال
مجھے

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

عقل خاں: کراچی
○ ایسا لگتا ہے کہ دانش بردی، سیمارغل اور سلیم

فاردی کی نوک جھوک سے مزہ لیتے رہتے ہیں۔ ہماری
سے انھیں کمرہ دیکھتے۔ "بڑے میاں دیوانے"
○ میں نے آپ کے حکم کی عقل کی توجہ بولے
خاں نے جملہ اور حوا لکھا ہے۔ جو یوں تو ہونا چاہیے
میاں دیوانے کو بھی ہوش مند بناتے ہیں تو اس میں
نہیں سمجھاتے؟
بڑے بڑے میاں کا خیال ٹھیک ہے نا؟
طارق ظفر: فیصل آباد
○ جوانی نشہ ہے تو بڑھاپا؟
○ ہوش مند۔
○ عشق میر کون فائدے میں رہتا ہے؟
○ اگر عشق ناساب ہو جائے تو چوڑے دلوں سے
جوئے پینے والے تک سبھی دکان دار فائدہ میں
ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

محمد حسن رضا کونول: منڈی بہاؤ الدین
○ آپ کب تک سولوں جاویں میں اچھے
○ جب تک آپ لوگ اچھے نہیں گئے۔
ایک لڑکی نے اپنی سہیلی کو بتایا: "دیر تک دروازہ
کی وجہ سے میری آنکھیں لڑو ہوئی جا رہی ہیں۔"
"تم دیر تک دروازہ کئی ہی کیوں ہو؟"
پوچھا۔
"درزش میں نہیں کرتی۔ سامنے والے لیلیہ
ہے۔"
○ "جنگ کل لوگ محبت کے جزیے سے اترے
کشتیاں کیوں نہیں ملے؟"
○ تاکہ بار بار نہ خریدنا پڑے۔
○ دو سیلانی کافی عرصے بعد ایک دوسرے سے ملنے
باتوں میں ایک نے دوسری سے کہا: "جنگ کل
چوتھے ہوئے فریڈ کا خیال ہے؟"
دوسری بولی: "وہ کی جگہ ہو رہا ہے۔ تم سناؤ
ری ہے آج کل؟"
"میں ان دنوں کی پتھیں لوٹ رہی ہوں۔"

۱۵

تیزبین کش

ہرماہ مزین اشعار پیچھے والے تین قارئین کو دو تیزو کا عنکبوت شاد بہ طور انعام ارسال کیا جاتا ہے۔ اس بار بھی
سب سابق تین قارئین کے اشعار مزین قرار دیے گئے ہیں۔

ایلا انعام: عیش قاروقی: سرای

دوسرا انعام: سطوت نظامی: کراچی

تیسرا انعام: محمد حسن رضا کونول: منڈی بہاؤ الدین

ان قارئین سے درخواست ہے کہ انکسٹنٹ پتہ بھیجیں تاکہ انھیں انعامی شاد ارسال کیا جاسکے۔ (ادارہ)

ناراض: کراچی
لاکھ ہوس نے چاہا لیکن عشق کی غیرت یک نہ سکی
وہیے کو کیا کچھ نہ بکھے زردیوں کی محفل میں
آصف سارانی: پنجہ سارن
تمام پیر جلا کے خود اپنے ہاتھوں سے
عجب شخص ہے سایہ تلاش کرنا ہے
رقیبہ خانم: کراچی
میں بھی سوچ کے ڈر جاتی ہوں جاتے جاتے
گھر میں جاؤں بھی تو کیا گھر تو اکیلا ہوگا
سمیرا ناز: کراچی
خون آشام درختوں میں مجھے چھوڑ گیا
مجھ کو پھولوں کی بھی نظروں سے بچانے والا
عالیہ انعام: اسلام آباد
تو تو سورج ہے مجھے معلوم نہیں رات کے دکھ
تو کسی روز مرے گھر میں اتر شام کے بعد
عتیق قاروقی: کراچی
میں سب میں گمراہ ہوں، سامنے جنگل
میں انتہا ہے مرا مہمان چھوڑ گیا
یادوں کے میرے جتن میں رستے بنا لیے
سطوت نظامی: کراچی
جب دھوپ کی شدت کا بھی احساس نہیں تھا
اب چاندنی راتوں میں بدن جلتے لگا ہے

اسد اللہ خان.....پشاور

بے نیازی سے مری ٹوٹی ہے رسمِ مے کشی
دھوئندے پھرتے ہیں اب تک اہل میخانہ مجھے
نسرین صدیقی..... حیدر آباد

ملا ہے ہم کو غمِ دل غمِ حیات کے بعد
وفا بھی رنگ پہ آئی ہے حادثات کے بعد
محمد حسن رضا گوندل..... منڈی بہاؤ الدین

چپ چاپ گھر کے صحن میں فائے بچھا دیے
روزی رساں سے ہم نے گلہ کچھ نہیں کیا

عشری بلوچ..... میرپور خاص
 بڑھنے لگا ہے اور بھی تنہائی کا خیال
 کیا فائدہ مکان کی تعمیر سے ہوا

فرید اللہ..... ذریعہ اسماعیل خان
پھول ہوتا تو ترے در پہ سجا بھی دیتا
خمر لے کر تری دلہنہ ~ آؤں کسے

سیما عروج..... ڈی۔ آئی۔ خان
پانی میں دائرے نہ بنا سک چھینک کر

راشدہ بانو... واہ کینٹ
تاریکی پھر سارے عیب چھپا لے گی
لے آتا گھر مہمانوں کو شام کے بعد

طلعت اقبال..... کراچی
میں نے کہا کہ چاند کو ہے دعویٰ جمال
اے کمال کمال لائے مے رویہ کمال

شبانہ جمال.... محمود آباد، کراچی
ہم گرد سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان
کل اور کسی نام سے آجائیں گے ہم لوگ

سعید احمد..... راولپنڈی
ہوا جو یوں تو یہ خوبی ترے ہنر کی
مری وفاؤں میں میرا کوئی کمال نہ
نازش علی..... فیصل آباد

تاریخی جس کی مہک میرے لہو
مجھ سے وہ غلاب کھو گیا
تاراعلیٰ..... فیصل آباد
جسم کو خواہش کی دیک لے
ہند دروازے کو دستک لے

سہیل عباسی..... کراچی
یادوں کی میز پر کوئی تصویر
کب سے ہمارے ذہن کا کبرا ادا

رعنای عباسی..... کراچی
بھاگ کر جان بچانے کی جو ٹھانی لڑائی
راستے جاتے ہیں سب کو بیچہ قاتل کی

حمیرا شاہین..... ضلع کوہاٹ

رخسانہ جیں..... جنگ
خوشبو کے لیے پھول کا عنوان
خام، ۱۹ ستمبر ۱۹۵۱ء

افسر علی بہادر..... اسلام آباد
یہ غم نہیں کہ چاسا مرا مسافر

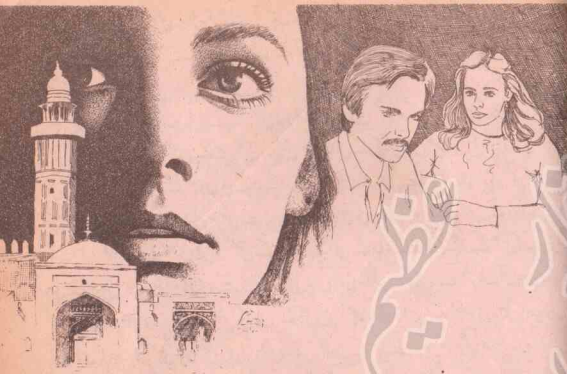
عطاء الرحمن... سیالکوٹ
دل کے ویرانے میں پیہم روشنی

اک کرن پہلو میں میرے رات بھر
ذکاء اللہ..... ساہیوال
گھٹا دکھ کر خوش ہوئیں

چھتوں پر کھلے پھول برسات
 رزاق شاہد فیصل آباد

پھر جیسے موج میں یہ سمندر نہ
نازیہ انصاری..... چکوال

گھر میرا جل رہا تھا سمندر



عورت کا اپنا گھر کہاں ہے؟ یہ، سوال بہر عورت کے ذہن میں کنڈلی مارے پیش آجے گا۔ وہ بھی یہی کہو جی رہی ہوں کہ اس کا گھر کون سا ہے، اور پھر اس نے تنکا تنکا جو ذکر اپنا گھر کیا۔ ایک منفرد تحریر



خالد امينا

”کیا بے وقوفی کر رہی ہو سلمیٰ.....“ آپا نے سلمیٰ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”نہیں آپا اب میں اس گھر میں نہیں رہوں گی..... نہیں رہوں گی“ سہلی کی پچکیاں اور بھی حیر ہو

”مرد تو ایسا کہہ ہی دیتے ہیں سنو جان، ہر عورت کو یہ باتیں سننی پڑتی ہیں۔“ آپا جانی نے پیار سے

”پچھلے دو سالوں سے آپا میں بھی سب سنتی اور جھپتی آ رہی ہوں مگر.... مگر اب۔“ آنسو پھر روانی بہہ نکلے اور گار زندہ گیا۔

”پچھلی صبر کی کڑیوں کو ایک جھٹکے سے کیوں توڑ دینے کو ہے.....“ آپا نے اسے اپنے سینے سے

تھیں اور اس سے بے پناہ محبت کرتی تھیں ہر مرتبہ جب ان دونوں میاں بیوی میں جھگڑا ہوتا تھا تو وہی آکے نہایت کرتی تھیں اور آج بھی اگر آپا نہ ہوتیں تو سلیٹی چغ غصے میں گھر چھوڑ کر چلی جاتی۔

سلیٹیوں تو بہت اچھا تھا سلیٹی سے محبت بھی کرتا تھا غصے میں جیسے حیوان بن جایا کرتا تھا اور جوندہ میں آتا کتا چلا جاتا۔ بقتل آپا جان کے غصے میں سلیئم اندھا اور برا ہو جاتا تھا سلیٹی خود بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ سلیئم طبیعت کا اچھا آدمی ہے محبت بھی کرتا ہے مگر جانے کیوں آج کے جھگڑے کے بعد سلیئم اس کی نظروں میں یکسر بدل کر رہ گیا تھا۔

حسب معمول سلیئم تو صلح صفائی کے بعد تمام جھگڑے کی باتیں بھول گیا تھا مگر سلیٹی چاہنے کے باوجود سلیٹی کی وہ بات نہ بھلا سکی تھی کہ نکل جا میرے گھر سے یہ دھمکی تو اس کے دل سے جو تک کی طرح چمٹ گئی تھی۔ زندگی کے منتشر چلتا اپنی ڈگر پر آگئے تھے مگر مینوں بعد بھی سلیٹی کا ذہن گھر کے تصور سے اسی طرح الجھا ہوا تھا بظاہر اب زندگی ہنسی خوشی کر رہی تھی مگر اس کا ذہنی کیفیت عجیب تھی تو ہنسی چلی جارہی تھی۔ بے گھر ہونے کا احساس، غیر محفوظ ہونے اور بے سرو ساماں ہونے کا رنج اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔ سلیٹی اندرونی طور پر بالکل بدل گئی تھی کتنے کو تو گھر میں رہتی تھی مگر اب اس کے ذہن میں اس کے متعلق اپنائیت باقی نہ تھی۔ باہل کا گھر چھوڑتے وقت اس نے شوہر کے گھر کو سب کچھ سمجھ لیا تھا اس کے چپے چپے کو بجا سوار کر رکھتی تھی مگر اب وہ بے دلی سے جیسے پرانے گھر کی جھاڑ پونچھ کر رہی ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چمکتا دیکھا گھر اب ویران لگنے لگا تھا۔ اور پھر سلیٹی نے لا جھگڑے ایک اسکول میں سروس بھی کر لی تھی۔ سلیئم نے یہ سوچ کر اجازت دے دی تھی کہ چلو ذرا خرچے کی تنگنی ہی ختم ہو جائے گی۔ آپا جان نے بھی بہت سمجھایا تھا کہ تیری ذمہ داری وہ دہری ہو جائے گی مگر وہ مانی۔ مینے کے بعد جب اسے اندھا مل تو پچھلے سے بیکم میں جمع کرادی۔ سلیئم نے خرچہ کم کر دیا چاہا مگر وہ لگتی کہ میں اپنی تنخواہ میں سے ایک پائی خرچ نہیں کروں گی۔ سلیئم نے بھی خوب غصہ کیا تھا اس کا غصہ بجا تھا کہ ایسی سروس سے کیا حاصل جس سے گھروالوں کو کوڑی کا ٹانڈہ نہ بچے۔

”کیوں نہ گھر تمہارا ہے تو گھر کی ذمہ داریاں بھی تمہاری ہیں۔ میں کیوں اس گھر پر خرچ کروں“ اس لیے میں بولی۔

پھر کئی مرتبہ اسی بات پر جھگڑا ہوا مگر سلیٹی اپنے فیصلے پر چٹان بنی رہی اور پھر یہی نہیں سلیئم نے کہا ”کوئی ضرورت نہیں ہے اپنے اخراجات کے لیے بھر مارے مارے پھر کر پیسے اکٹھے کرنے کی۔“ وہ سے لیا کر پیسے اور کل سے تو سروس پر نہیں جائے گی.....“ مگر آگے روز روکنے کے باوجود بھی وہ نہ روکی

اور اسکول پر دھانے چلی گئی۔ سلیئم کا خون کھول کے رہ گیا۔ مگر کیا کر سکتا تھا سوائے مار پیٹ کے، سو سلیٹی اس کی اب عادی ہو چکی تھی، مار تو جیسے اس کی ہڈیوں کی خوراک بن چکی تھی طلاق کی دھمکیوں کا بھی اب اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ گھر سے نکلنے کی دھمکی بھی غیر موثر ہو گئی تھی اور تنگ آکر سلیئم خون کے گھونٹ پینے پر مجبور ہو گیا۔ گھر میں کتنی ہی تنگنی کیوں نہ ہو کھانے کو کیسا ہی خراب کیوں نہ ملے مجال ہے جو سلیٹی ایک پیسہ بھی گھر پر لگاتی ہو ہاں بس کبھی کبھی اپنی پی پی پر خرچ کر دیا کرتی تھی۔ ایک دن سلیئم نے پیار سے پوچھا کہ وہ ان چیزوں کا کیا کرے گی۔ سلیٹی نے ہنس کر جواب دیا کہ آخر پی پی کو اعلیٰ تعلیم بھی دلوانا ہے تب سلیئم کچھ مطمئن ہو گیا کہ چلو پی پی کے لیے سہی حال کی نہ سہی مستقبل کی فکر تو ہے مگر جب پی پی کو اسکول میں داخلہ دلانے کا وقت آیا تو سلیٹی نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ ذمہ داری باپ کی ہے ہاں کی نہیں۔ سلیئم پکارا کر وہ ایسا کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سلیٹی چیزوں کا کیا کرتی ہے کم بہت اپنی جان پر بھی تو تیں لگاتی تھی۔ دن بدن پیلی پرتی جاری تھی وہی ذمہ داریوں سے اسے نچوڑ دیا تھا مگر اسے اپنا بھی ہوش کماں تھا وہ تو مینوں بن گئی تھی اسکول اور گھر وہ کوہو کے تیل کی طرح ان دونوں کے گرد گھوم رہی تھی اگر کبھی سلیئم اسے بہت سے کہتا کہ وہ اپنی صحت کا بھی خیال رکھا کرے تو اس کے ہونٹوں سے ایسا جاندارا قندہ پھوٹا کرتا تھا کہ سلیئم بھی حیرت زدہ ہو جاتا اور آپا بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتیں کہ سلیٹی تو بالکل بدل گئی ہے۔

گھر کی ہواؤ اور سجاوٹ کی طرف بھی اس کا حیا دن پہلے کی طرح نہ تھا اوپر اور سے صفائی کر دیا کرتی تھی۔ چادریں مینوں نے بدلتی مکھان ٹوٹ پھوٹ گئے ورنہ پہلے تو وہ سارا سارا دن گھر کی چیزوں کو سیٹ کرنے میں لگا دیا کرتی تھی۔ آج شب اس طرح بدلی ہے توکل دوسری طرح بدل دیا کرتی تھی، پیسے بچا بچا کے گھر کی چیزیں آکھی کرنے کا تو اس پر جنون سوار تھا مگر اب یہ باتیں خواب ہو گئی تھیں۔ پردے مینوں بدلنے کی نوٹ نہ آتی جب تک گھر میں جالے نہ لگتے تھے وہ صفائی نہ کرتی تھی۔

”یہ تو تھا سلیٹی آخر تو پیسوں کا کرتی کیا ہے.....؟“ آپا نے ایک دن پوچھا ہی لیا۔

”کچھ بھی نہیں“ سلیٹی نے سادگی سے جواب دیا۔

”پھر بھی آخر کیا کرتی ہے..... نہ گھر میں لگاتی ہے نہ اپنے تن پہ۔“ آپا نے ازاداری سے پوچھا۔

”کیا کروں گی پوچھ کے آیا..... چھوڑو..... سلیٹی نے ٹانا چاہا مگر آپا بھی آج ٹھان کے آئی تھیں کہ پوچھ کے رہیں گی مسلسل اسے کیر دیتی رہیں سلیٹی سمجھ گئی کہ آپا آج ملنے والی نہیں ہیں۔ کچھ دیر ناخن کیر دیتی رہی پھر دوسرے سے بولی۔

”تپا میں اپنا گھر بنا رہی ہوں.....“ سملی کی آواز جیسے کسں دور سے آ رہی تھی۔

”پاکل ہو گئی ہے لڑکی یہ تیرا گھر نہیں ہے؟..... اپنا گھر بنا رہی ہوں۔“ تپانے آخری فقرہ اسی کے لیے

میں کہا تو وہ چپکلی سی ہنسی نہں دی۔
”تم نہیں سمجھو گی کیا.....“ وہ ہنسنے لگی۔

”قوی سمجھا دے..... تیری باتیں تو دنیا سے نرالی ہیں ایک بات کو گرہ میں باندھ لیا مرد تو ایسا کہہ لے دیتے ہیں اگر عورتیں ایسے ہی بنی کو لگا کے بیٹھ جائیں تو آج کوئی بھی گھر بسا ہوا نہیں ہوتا.....“

”تپا تو اب کون سا اپنا گھر ہے تم ہم صحیح طور پر بسا ہوا گھر کہہ سکیں۔ چھوڑو کیا تم نہیں جانو گی اس باتوں کہ.....“ سملی اپنے کام میں لگ گئی۔

”اے سملی..... اچھا ایک بات تو بتا۔“ تپانے پھر اسے چھیڑنا چاہا۔

”کیا؟“ سملی ان کے پاس آئی۔

”تنتے مرے پے گھر بنوا رہی ہے۔ کتنے کمرے ہوں گے اس میں؟“

”آپا کی بات پر سملی نہں نہں کے دہری ہو گئی تاجرت سے اسے کتنے لگیں کہ اس میں ہسنے کی کون سی بات تھی اور سملی اچانک چپ ہو کر آہستہ سے بولی۔

”مرے اور کمرے تو چھوڑو آپا، لیکن ایک بات بتاؤں۔“

”کیا.....“ آپا گہری دچھی سے بولیں۔

”تپا میں جو گھر بنا رہی ہوں نا اس میں کچھ ہو یا نہ ہو حفاظتی در ضرور ہو گا جس میں سے کبھی مجھے کوئی نکل نہ سکے گا۔ کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ نکل جا میرے گھر سے۔ وہ صرف میرا گھر ہو گا میرا اپنا گھر۔“

کتے ہوئے سملی کی آنکھیں چمک اٹھیں مگر آواز بھگی بھگی تپا یوں حیرت زدہ سی کھڑی تھیں جیسے ان کے سامنے کوئی حساب کا مشکل سوال حل کر رہا ہو ان کے لیے کچھ نہ پڑ رہا تھا۔

وقت یوں ہی دھیرے دھیرے گزر رہا تھا سملی کی زندگی بھی حسب سابق گزر رہی تھی حالات میں کوئی نمایاں فرق نہیں آیا تھا سوائے اس کے کہ سملی دن بدن زیادہ زرد ہوتی جا رہی تھی..... سلیم نے بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا مگر کوئی افادہ نہ ہوتا تھا سبھی اسے آرام کا مشورہ دیتے تھے اسے اچھی غذا کی ضرورت کا احساس دلاتے تھے۔ وہ نہں کو ٹال دیتی ایک دن بستر سے جا لگی مگر اپنا گھر بنانے کی دھن میں کوئی فرق نہیں آیا تھا دن یہ دن گرتی حالت کے باعث آخر اسے ڈاکٹروں کے مشورے پر اسپتال میں داخل کر دیا گیا سلیم گھبرا گیا اس نے دن رات ایک کرویے۔ چپسہ پانی کی طرح بہا دیا کہ کسی طرح سملی جلد صحت

رو کا نٹ قبلہ حاجا فخر محمد اختر حضرت محمد ﷺ کی سیر طیبہ بر پاک دفع اور معتبر تصنیف



مستفاد: منقورہ نویری خلیق

تیرہ سال کے مطالعے، غور و خجاردرجہ ستیجوشوق کا حاصل
حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ہر پہلو پر گشت کا مطالعہ

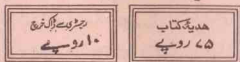
منقورہ نویری خلیق

یقیناً ہر غیر مہند پاک کی وہ پہلی خاتون ہیں جنہوں نے حضور پُر نور کی سیرت پر تمام اٹھا کر اپنی بخشش کا سامان کیا ہے اور ان پڑھنے والوں کے مطالعہ و روشنی کی تسکین کی ہے جن کے دل میں رسولِ خدا اور دربارِ اہل بیت کے مقدس

سہام پیلی کیشنز کی جانب سے پہلی پیشکش



● ۱۱۲ صفحات پر مشتمل مجلہ کتاب ● روزنامہ ملک کے خاکے سے متعلق ● مہینہ گزشتہ کی گزشتہ طبعات ● مضبوط جلد بندی ● کاغذ سفید اور بہترین ● قیمت و طبعات عمدہ اور شین ● بیرونی روپ کی کتاب



سہام پیلی کیشنز ۰۱۰۸-۱۱۰۸ اکریڈٹڈ شریعت و ذکر کراچی ۳۱۹۹۱۸۰۳۱۹۹۱۸۰۳۱۹۹۱۸۰۳

یاب ہو جائے اور جب اس کے پاس پھولی کوڑی نہ رہی تو اس نے آپا سے کہا کہ وہ سلمیٰ کو سمجھائیں کہ
پیر جان سے زیادہ پیارا نہیں ہوتا۔“

”سلمیٰ دیکھ سلیم کے پاس پیسے ختم ہو گئے ہیں.... تو اپنے جمع کیے پیسوں میں سے تھوڑے بہت سلیم کو
دے دے وہ کوئی جوا تھوڑی کھیلے گا تجھ پر ہی خرچ کرے گا۔“ آپا اسے سمجھادی تھیں۔

”آپا اگر ایک ایک پیرہ میں لگا چکی ہوں کوڑی بھی نہیں ہے میرے پاس۔“ سلمیٰ نے ہنسنے کی کوشش
کی.... سلیم بھی بیٹی کو لے کر ملاقات کے لیے آچکا تھا۔

”جھوٹ بول سلوے تو یہ ہے لڑکی کیا پیرہ قبریں ساتھ لے جائے گی....؟“ آپا جان نے پیار سے
اس کے سر پر چپت ماری۔

”ہاں آپا ارادے توئی اگال کچھ ایسے ہی نظر آ رہے ہیں....“ سلیم نے مذاق کے طور پر کہا۔

”ہاں آپا سلیم ٹھیک کتاب ہے میں اپنی کمائی اپنے گھر لے جاؤں گی۔“ سلمیٰ کی آواز بلند ہو گئی۔

”کیا اول فول بک رہی ہے....“ آپا نے اس کے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کے کہا۔

”سلمیم۔۔۔ اور تم تو پچھتے ہو نا کہ میں پیسوں کا کیا کرتی ہوں میں نے تم دونوں کو یہی بتایا کہ میں اپنا
بناری ہوں مگر یقین نہیں آیا تھا آج میں تمہیں اپنے گھر کا نقشہ بھی دکھانے دیتی ہوں۔ یہ لو پکڑو یہ کالہ

اس میں نقشہ اور اخراجات کا حساب کتاب درج ہے۔“ سلمیٰ ہلکے سے ہنس دی اور ہاتھ بڑھا کر پر
میں سے کچھ کاغذات نکال کر سلیم کی طرف بڑھا دیئے۔ آپا بھی اشتیاق کے مارے سلیم پر چمک گئیں۔

”یہ کیا سلمیٰ.... یہ گھر کا نقشہ تو نہیں ہے“ سلیم نے حیرت سے نقشہ دیکھ کر کہا تو سلمیٰ کی آنکھیں
چمک اٹھیں۔

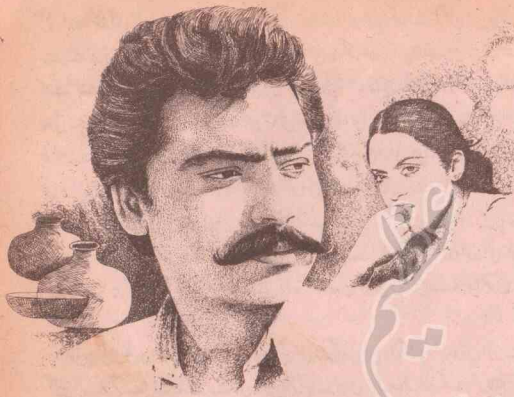
”ہاں یہ گھر کا نہیں سلیم مسجد کا نقشہ ہے مسجد کا....“ سلیم حیرت زدہ رہ گیا۔

”مگر تو تو کہہ رہی تھی کہ اپنا گھر بناری ہے....“ آپا نے تعجب سے پوچھا۔

”آپا میں نے کہا تھا کہ روئے زین پر عورت کا کوئی گھر نہیں ہے میں اپنا گھر زمین پہ نہیں اوپر آسمان
بناری تھی کہ اگر وہاں بھی عورت کے ساتھ یہی سلوک ہوا تو میرے پاس ایک اپنا گھر تو ہو گا۔ شروع

ہنسنے آئے ہیں کہ دوزخ میں عورتیں زیادہ ہوں گی۔ یہاں بھی وہ بے گھر اور وہاں وہ جہنمی ہیں یہاں
دکھ تو کسی نے کسی طرح جھیل لیا گھر وہاں تو سدا رہتا ہے اس لیے میں نے وہاں گھر بنانے کا سوچا۔ ٹھیک

میں نے، آپا میری مانو تو تم بھی ایک گھر وہاں کے لیے بوالہ۔“ سلمیٰ نے روتے روتے آپا کو مشورہ دیا تو
اپنی سسکیاں نہ روک سکیں۔ سلیم سر جھکائے ہجرموں کی طرح کھڑا تھا۔



مٹی کمان

اشنان کا سب سے رشتہ بڑے حد عظیم مقصد اور منزل ہے زمین کا ہزار بارادوں کو اپنے
پیشہ میں چھپا لیتی ہے بلکہ ہر عت کا کھول لی اور امین راز دار بھی ہے

نسرین خواجہ



مٹی کے برتن، مٹکے، صراحیوں اور دوسری چیزیں بنا تے ہیں وہ خود بھی مٹی کا پتلا بن جاتا۔ اس کے
دو میں مٹی یوں کھل گئی تھی کہ وہ بھی مٹی ہی کا پتلا بن جاتا تھا۔ اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا،
وہی کیا ہر انسان مٹی کا بنا ہے۔ جب بھی مٹی سے ہیں تو اور ملیں گے بھی مٹی سے تو پھر یہ کیا ہے؟
گوشت، ہڈیاں، خون، دل.... احساسات، جذبات! نہ جانے کیا ہیں؟ خدا کے راز خدا ہی جانے! پترا بھی

پڑھایا تھا۔ بچپن سے زہراں دلاور کی مانگ تھی مگر باقاعدہ نہیں۔ جوں ہی دونوں پہ جوانی آئی آنکھوں میں
 لواب سے اترنے لگے۔ پر شیب زہراں، نازک اور شرمیلی زہراں جب بھی دلاور کو دیکھتی تو آپ ہی
 آپ جھک کر ہل کھا جاتی اور دلاور اس انداز کو دیکھ کر ترنگ میں اپنی ہی ٹوہلی مونچھیں مروٹنے لگتا جیسے یہ
 سارا کمال ان مونچھوں کا ہو۔ نئے نئے ابھرتے جذبات تھے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ حیران و پریشان تھے کہ
 ان نئے جذبول کو کس طرح سمجھا جائے۔ اس ہی آفت سے کیا پرآؤ کیا جائے۔ اکڑی اکڑی سانس! وہ
 واقعی ہوئی ہے جتنی کھربے کھربے پننے، دونوں کی سمجھ میں ایک بھی بات نہ آئی کہ یہ کیا ہو گیا ہے کیوں
 ایک دوسرے کو دیکھ کر دل دھڑکنے لگتا ہے کیوں بے تاب آنکھیں ایک ہی صورت کے لیے تڑپتی ہیں
 کبھی کبھی چوری چھپے ملاقات بھی ہونے لگی مگر یہ ملاقات بڑی عجیب ہوتی تھی۔ پہلے دور دور سے باتیں
 کرتے، نگاہیں پھر فاصلے ملتے چلے گئے۔ اور پھر وہ بے ملاحظہ و معشوق بن گئے۔

شیر علی اپنی چاک پر بیٹھا مکا ڈھال رہا تھا۔ اس کے مشاق اور ماہر ہاتھ تیزی سے چلتے چاک پر ٹپکے کا
 بیٹ بھرا رہے تھے۔ اس کے پاس ہی زہراں اپنی چاندی کی چوڑیاں گچھم گچھم کرتی مٹی گوندے جا رہی
 تھی کندی و رنگت اور کچی مٹی کی پفک جیسی زہراں کے مٹی گوندے میں آگے پیچھے ہونے سے اس کے
 ہاتھ ساتھ ساتھ کانوں کے چاندی کے جھمکے بھی جھول رہے تھے کوئی دوسری گرمیوں کی، گرموہ دونوں اپنے
 بے کام میں گمن تھے۔ آگن میں لگے نیم کے درخت سے سوکھے پتے ہلکی سی آواز نکال کر جھرتے اور پھر
 ہوا کے جھوکے کے ساتھ اڑ کر اوڑھ اور بکھر جاتے۔

”بابا! خاموشی سے آگاہ کر زہراں نے شیر علی کو مخاطب کیا۔ ”ہوں۔“ بابائے بس ہوں پر اکتایا۔ وہ
 تیرے ٹپکے پر توجہ دے رہا تھا اور اس کی گولائی ڈھال رہا تھا۔

”کیا تیرا دل نہیں گھبرا گیا؟ ہر وقت چاک پر بیٹھے بیٹھے تو تھکتا نہیں ہے؟“ وہ مٹی کا بڑا سا بیڑا بناتی ہوئی
 ”جی میرا تو دل گھبرا گیا ہے ہر وقت مٹی مٹی تو بے.....؟ وہ منہ بنا کر بولی۔ بابا اس کی بات پر بس
 لے لے نہا اور اپنے کام میں لگا رہا۔ اس پر زہراں کا منہ بند گیا۔ یہ بھی کوئی بات ہے ہر وقت بابا مٹی
 سے پیار کرتا رہتا ہے۔ میرا تو اسے کوئی خیال ہی نہیں؟

”دیکھ پتا ہے بابا! تو مجھ سے بھی زیادہ مٹی سے پیار کرتا ہے؟“ وہ منہ پھلا کر بولی۔
 ”اری پاگل!“ شیر علی ایک دم ہنس پڑا مگر اس نے مکنا نہ چھوڑا اور چاک گھماتا رہا۔

”جیسے تو میری تخلیق ہے نا زہراں؟ اسی طرح یہ برتن بھی میری تخلیق ہیں۔ تو میرے خون سے بنی ہے
 لڑان پہ میرے خون اور سینے کا قطرہ قطرہ خورج ہوتا ہے پھر یہ بھی تو سوچاں! ان ہی کی وجہ سے ہمارے

مٹی اور انتہائی مٹی، درمیانی پناہ گاہ بھی مٹی..... وہ سارا دن اپنے گھر کے آگن میں چاک پر بیٹھا مٹی
 سے ٹپکے، برتن، صراحیوں، قہال، کھلونے اور جو کچھ بھی بنا سکتا تھا بنا رہتا تھا۔ دن رات محنت، ان
 محنت، محنت میں جب لگن اور محنت کا راس بھی مل جائے تو محنت ایک حسین اور نفوس رنگ میں نمودار
 ہوتی ہے۔ اسی محنت میں جب محبت بھی شامل ہو گئی تو اسی کے ہاتھوں سے ٹپکے، صراحیوں،
 خوبصورت اور نازک روپ میں ڈھلنے لگے جس طرح کسی لوہی کی جوانی پھپھانے نہیں جھپٹتی اسی طرح
 مٹی کے بنائے ہوئے نازک اور خوبصورت برتنوں کی شہرت بھی گاؤں سے نکل کر شہر تک پہنچ گئی تھی
 مناسب دام پر وہ اپنی بنائی ہوئی چیزیں فروخت کرتا ہے ہر کسی نے پسند کیا اور یہی پسند یہی اس کی
 عزت و شہرت بڑھانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ مٹی کے دم سے اتنی عزت کا اور وہ بھی مٹی کا وہاں
 گیا۔ اس کا ہر لمحہ ہر ہل چاک کو گھمانے میں گزرتا۔ ہر دن کئی چیزیں اس کے ماہر ہاتھوں سے وہاں
 آجاتیں۔

موتی موتی انگلیوں اور مضبوط ہاتھوں والا شیر علی زندگی کی لمبی راہ گزر پر ہزاروں اور بے جان چیزیں
 تخلیق کرتے کرتے ایک جاندار بنے بھی تخلیق کر گیا۔ زہراں سولہ سالہ نٹ کھٹ مگر کافی کھنڈار مٹی
 زہراں اس کی زندگی کی امید تھی مگر جیوہ زہراں کو پیدا کر کے ایسی پیار بڑی کی پھر سنبھل نہ سکی اور
 کا قرض ادا کر کے اس کی روح آسمانوں میں پرواز کر گئی۔ یہ قرض زمین کو اپنا جسم دے کر ادا ہوا۔
 انسان کو پہلا سبق پناہ کا دینی ہے۔ ازلہ پناہ، نئی پناہ۔ مٹی جو عظیم ہے اور ماں جیسی ہے جسے خدا
 اشرف المخلوقات کی تخلیق کے لیے منتخب کیا۔

زہراں ایک کسار کی بیٹی ہونے کے ناتے خود بھی سارا دن باپ کے پاس بیٹھی مٹی گوندتی تھی
 برتن، ٹپکے سکھانے کے لیے پچھلے آگن میں چلی جاتی۔ شیر علی کا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا اور کمروں
 چاروں طرف کچی مٹی کی اونچی سی دیوار تھی۔ اسی طرح آگے پیچھے آگن سائبین گیا تھا اور سائبین
 گھیاں بن گئی تھیں۔ پچھلے آگن میں ڈیسروں برتن کھڑے پڑے رہتے تھے شیر علی کے گھر کے والی
 دیوار کے ساتھ اس کے بڑے بھائی فتح علی کا گھر تھا بلکہ دونوں گھروں کی ایک ہی دیوار تھی۔

فتح علی، شیر علی کے بنے ہوئے برتنوں کو رنگنے کا کام کرتا تھا اور دونوں بھائیوں میں بڑی
 تھی۔ درمیانی دیوار کی وجہ سے جب دل چاہے چارپائی، یہ کھڑے ہو کر بات چیت کر لو فتح علی کی
 زہراں کی ہم عمر لڑکی تھی فاطمہ اور ایک بڑا لڑکا تھا دلاور خندی اور شریر، نیا نیا لڑکا مرد کے ٹپکے
 طرح۔ زہراں کی پرورش میں شیر علی نے رات دن ایک کر دیے تھے اسے اپنے پیار کے نور سے

”زہرا دل و گل والے شکے بھی دیکھ لیتا۔ زیادہ سوکھ نہ جائیں ابھی انھیں تھپکنا بھی ہے!“ شیر علی نے لڑائی کا پورا چاک پر رکھتے ہوئے زور سے کہا۔

”اچھا بابا!“ زہرا نے جواب دیا۔ اس طرف قلع علی کی طرف والی دیوار کے ساتھ سوکھ پرانے دیوار کی دیواری تھی جس کے ساتھ ایک چارپائی پڑی تھی اور زمین پر مٹی کے کچے کچے تھال تھار بکھرے پڑے تھے ایک طرف کچھ تھیلے اور صراحیاں بھی سوکھنے کے لیے رکھی تھیں۔ زہرا ہنسی احتیاط سے نیامٹکا بھی تھار میں رکھا اور دوسرے ٹھکوں کو بجا کر ان کے سوکھنے کا اندازہ کرنے لگا۔ وہ ابھی انگلی سے شکے بجا کر اٹھنے ہی کو تھی کہ ترائے سے ایک ننگرا لے لگا اور وہ بری طرح چونک کر کہنے لگا۔ ”دیوار کے پار گردن نکالنے والا دھڑکا پھٹا، چپکے شریر آنکھیں لے کر زہرا کو ایک دم ہنسی آگئی وہ ہنسی ایک شوخ شیطانی نظردار اور بے ڈال کے واپسی کے لیے مڑ گئی۔

”ارے..... رک تو سہی زہرا۔“ دلاور فوراً بے چینی سے پکار پڑا اور زہرا چپکتی چپکتی اٹھیں لے لے کر رک گئی۔

”کیا بات ہے؟“ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ انظر سے جھکا کر بولی۔

”میری توجہ کوئی پروا ہی نہیں زہرا بڑی سبک دل ہے تو۔“ وہ شکایتی انداز میں بولا۔

”ارے نہیں دلاور۔“ وہ ایک دم تڑپ کر بولی

”تو بھرا کیلے میں کیوں غصے ملتی مجھ سے۔“ دلاور نے دل کی بات فوراً ”کہہ دی اور شکایت بھری لہجے سے اسے دیکھا۔

”بس میرے اچھا نہیں لگتا یوں لگتا؟ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

”ارے واہ۔ دلاور شوخی سے مسکرا کر بولا۔

”ارے نہیں نہیں۔“ وہ ایک دم ڈر سی گئی ”بابا نہ آجائے ادھر۔“

”اچھا!“ اس آواز ادھر؟ اس نے دیوار پر چڑھتے ہوئے پوچھا دلاور وہیں رک سا گیا بے چینی اور بے آہی اس کی نگاہوں سے صاف عیاں تھی۔

”تو پھر کیا کروں؟“ وہ بے بسی سے پچھلا ہونٹ دبا کر بولا۔

”سیدھے راستے سے کیوں نہیں آجاتا؟“ وہ ایک دم تنگ کر شوخی سے بولی۔

”وہاں سے آؤ جاؤں مگر وہاں سے آکر تجھے پیار کیسے کروں گا؟“ وہ بے بسی اور شرارت سے بولا۔

زہرا سرخ سرخ ہو گئی اور تیزی سے اس کے چہرے پر پری رنگ بکھر گئی۔

چوہے میں آگ جلتی ہے اب ہی کے دم سے ہمارے جسم میں خون رواں دواں رہتا ہے مجھے بچنی تو ہوا ہے اتنی ہی مٹی بھی عزیز ہے اور تم دونوں کی وجہ سے میری زندگی کی گاڑی کھنچ رہی ہے ایک پیسہ تو ہے دو سو پیسہ مٹی ہے اب کبھی۔“ پھر تو تو میری جیتی جاگتی زہرا سے میری چاند۔ میرے گھر کا اجالا۔“ وہ مسکرا کر شفقت سے بولا۔ زہرا نے کوئی جواب نہ دیا مگر باپ کے آخری جملے پر وہ ذرا سا مسکرائی اسے سکون سا محسوس ہوا اور چہرے پر نازکی پھیل گئی۔

”مگر بابا! یہ تو تو ان کے کہ مجھ سے زیادہ یہ مٹی تیار کام نہیں کر سکتی ہے نا! چپ چاپ بڑی رہتی ہے۔“

”نکی ہی میں تو اتنا کام کرتی ہوں۔“ وہ بچوں کی طرح چل کر بولی اس کی آنکھوں میں امید کا رنگ بکھرا ہوا تھا وہ سوائے نظروں سے باپ کو دیکھنے لگی پتہ نہیں کیوں وہ باپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتی تھی مٹی بھی تو بے پناہ توجہ چاہتی ہے چاہے اس کو گوندہ کر برتن ڈھالنے ہوں یا اس کی کوکھ میں بیج ڈال کر ہرے بھرے پودے اگانے ہوں۔

”مٹی کا کام!“ بابا ایک دم کھل کر ہنس پڑا اس کا ہاتھ رک گیا وہ بڑی دلچسپی اور چپکتی آنکھوں سے اسے معصوم اور بھولی مٹی کو دیکھنے لگا جو سر جھکا کر مٹی کو گوندنے میں لگی تھی پر کچھ سوچ کر اس نے دوبارہ چاک چلانا شروع کر دیا۔

”ارے بیٹی تو اپنا مقابلہ مٹی سے کیوں کرتی ہے باگل؟ پھر مٹی کوئی غیر چیز تو نہیں ہے۔ ہم اسی بنائے گئے ہیں اسی لیے اس سے زیادہ اور کیا قریب کا رشتہ ہو گا.....؟ مگر تو ان بے آواز رشتوں کو نہیں سمجھ سکتی کیونکہ یہ رشتے بڑے سچے اور کھرے ہوتے ہیں۔ بالکل اٹل۔ مٹی ہی ہماری ماں اور پناہ ہے۔ تو اگر میری عزت ہے نا؟“ آں ہے تو بیٹی یہ مٹی اس کی رکھوالی۔ یہ چار دیواری اسی نے تو دی ہے اور اسی سے میں اپنی عزت بچا کر بیٹھا ہوں۔“ وہ خجندیہ کے بولا تو زہرا مٹی کو گوندتے ہوئے رک گئی اور باپ کو دیکھنے لگی۔ اور اس مٹی کے مجھ پر تو بڑے احسان ہیں۔ اسی نے میرے نام کو عزت و شہرت اور پیسہ بھرنے کے لیے روٹی دی۔“ بابا سنجیدہ تھا زہرا چپ ہو گئی اور سر جھکا کر اپنے مٹی والے ہاتھ دھو لے لگی۔ ”یہ بابا بھی کبھی کسی انوکھی اور اداس سی باتیں کرنے لگتا ہے کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آجائیں اور کچھ ہوا کے جمو گھول کی طرح کان کے پاس سے گزر جاتیں۔

”لے بیٹے۔“ بابا نے بڑے فکرا رانہ انداز سے منہ چاک سے اٹھایا تھا کچھ دیر پہلے والا مٹی کا پڑا ہوا ایک خوبصورت شکے کے روپ میں ڈھل چکا تھا۔ زہرا جھٹ سے اٹھی اور بڑی احتیاط سے منہ چاک سے ہاتھ لے لے لیا اور جھم جھم کرتی پھوٹا ڈالنے کی طرف چل پڑی۔

”چل بے شرم“ بے ساندہ اس کے ہونٹوں سے نکلا اور وہ کسی ہرنی کی طرح لڑائی بھاگ کر مٹی پر چرے پر رنگ ابھی تک بکھرے پڑے تھے۔ دل بے تحاشہ دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنی ترنگ میں لڑائی میں لڑا۔ باپ کے پاس تھلے پہ چڑھ کر تو بیاہی کرنا نہ تھا شائیں نظروں میں جیسے کچھ بھانپ لیا اس کی نظرس ہٹتی تھی۔ ہنسی چال پر جم کر نکس چاک چلاتے چلاتے اس کے ہاتھ اچانک ختم ہو گئے۔ جوانی کی بندوبست کام نہ ہو جاتے تو وہ آپ ہی آپ الٹنے لگتی ہے اسے جھکا سا لگا۔ زہراں منکے سے پانی نکال نکال کر مٹی والے ہاتھ دھو رہی تھی کھینچے چرے پر مٹی کی خواب سے لرز رہے تھے۔

ہے میری بیٹی زہرا۔“ بابا کی آواز بھرا گئی تھی۔ زہرا کا سر شرم سے جھکا چلا گیا۔ ”تو سمجھ ہے ہرا۔“ مٹی سے بنا گھوندا یا برتن ٹوٹ جائے تو پھر بنایا جا سکتا ہے مگر عزت ایک بار غلطی سے پتیلوں لک جائے تو پھر اسے اٹھانا بڑا مشکل کام ہے تو خود سوچ زہرا! تو تو میری عزت ہے۔“ بابا نے خود بے ادبی جذبات کو سنہلایا تھا۔ ”اگر دلاور سچا ہے تو کوئی کام کرے کچھ دھندا کرے اگھر بنائے میں تجھے ایک بے کار آدمی کے حوالے کیسے کروں؟..... تو خود دیکھ! خود سوچ زہرا۔“ بابا نے ایک بھر پور نظر بند کیا۔ وہاں جو سر جھکائے مٹی کی بے جان گریبان بنی بیٹھی تھی۔ ”کوئی باپ اپنی بیٹی کے لیے برا نہیں سوچتا ہے اولاد اپنے ہی جسم کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ بھلا کون اپنے جسم کو اذیت دے سکتا ہے۔“ بابا بے پناہ گہرائیوں میں اتر گیا۔ ”تو سمجھ رہے زہرا! اور مجھے اپنے خون پر بھروسہ ہے۔“ بابا نے نیک دم اپنے ہاتھ کی انہیں زہرا کے کندھے پر رکھ دیں اور وہ احساسِ نئے داری سے کچھ اور جھک گئی۔ بابا نے کھو کر مسرہرایا تو اطمینان کی ایک گرمی سانس لی۔

آگے نہیں بڑھائے گی تو اور کون بڑھائے گا؟ پھر دلاور بڑھا لکھا تو ہے نہیں کہ خاندانی کام چھوڑ دے۔
 فتح علی بھائی کی شرط اور باتیں سن کر تھوڑی دیر جڑ بڑھوتا ہوا پھر ایک دم خوش ہو کر نہیں بڑا
 ”ارے نگر نہ کر شیر علی۔ تیری شرط کبھی..... مجھے تو تو نے ڈرا ہی دیا تھا شکر کر کہ تو نے انکار نہیں کیا۔
 بچہ بے سدرہ جائے گا تو نگر نہ کر۔“ فتح علی مطمئن سا ہو گیا ہے اس نے دوبارہ رنگائی شروع کر دی۔ شیر
 علی کے لبوں پہ بھی ایک پر سکون سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ زہرا کو بھی بابا کی شرط بڑی اچھی لگی۔ ”کہا
 چلا کہ بابا بھی اب پتا پڑے گا دلاور کو بھی میں بھی تاجوانوں کے سچا ہے یا صرف باتوں کا ماہر ہے۔“ وہ
 خوشی سے سوچتے ہوئے تھال میں تھپک تھپک کر روٹی کے پیرے کو بڑھانے لگی۔

دلاور کو جب اس شرط کا پتا تو وہ بڑا کھرایا۔ وہ تو کبھی چاک پہ بیٹھا ہی نہیں تھا پھر یہ..... کہ اس
 بیٹھ کر برتن بنانا اور انھیں سچ کر لینے والا وہ بے حد بھینچا لیا۔ مگر مرانا کیا نہ کرتا..... دل کے تھکانے
 شدید تھے کہ ہریل زہرا کو پکارتے رہتے تھے جوانی کے انوکھے اور نئے مطالبات نے اسے پکڑا کر
 رکھ دیا تھا رات گزارنا بھی مصیبت بنی جا رہی تھی جوانی پوری خیر نیوں اور جذبول کے ساتھ اس پر عمل
 آور تھی۔ ان بچوں نے اس ”دیکھے انداز“ ان سنی باتیں اور دھیمی دھیمی سرگوشیاں آپ ہی آپ اس
 کے وجود میں سرسرنے لگی تھیں۔ وہ دن رات اپنے پختلے جذبات سے الجھتا رہتا اور کبھی کبھی وہ اپنے
 اٹھتے ہوئے طوفان کو دبانے کے لیے گہرا کر راجہ کے اڈے کی طرف نکل جاتا اور خوب دارو پی کر اس
 طوفان کو دبانے کی کوشش کرتا وہ منزل کو پانے کے لیے مضطرب و بے قرار تھا لیکن فاصلے تھے کہ بڑھتی ہیں
 جا رہے تھے پھر وہ چارو تاجار چاچا کے پاس چاک پر بیٹھ ہی گیا۔ بابا اور چاچا تو پاس ہی جان سے خوش ہو گئے
 کہ چلو بچہ راہ راست پر آگیا۔ زہرا کو بھی اس کے چاک پر بیٹھنے سے خوش ہوئی۔ ”ہائے دلاور کی مجلس
 تو بڑی جی ہے وہ مجھ سے اتنا یاد رکھتا ہے۔“ رفتہ رفتہ دلاور اپنا سارا دن شیر علی کے پاس گزارنے لگا ملی
 کو گوند صاب اس کے ذمے ہو گیا۔ مٹی گوند تھے گوند تھے وہ تیزی سے برتن بنانا بھی سیکھنے لگا۔

مٹی میں اتنا ہوا دلاور زہرا کو پہلے سے بھی زیادہ اچھا لگنے لگا تھا۔ لینے میں نمایا ہوا مٹی سے آلود
 ہاتھوں والا دلاور، لیکن وہ اس کے قریب نہیں آتی بلکہ دور دور رہتی۔ شرمائی شرمائی کڑائی ہوئی زہرا
 بابا کو بڑی جھلی گتی وہ سوچتا کہ بے حد صابر اور سمجھ دار بچی ہے ساتھ رہتے ہوئے بھی زہرا دلاور سے
 کوسوں دور تھی مگر کبھی کبھی موقع پا کر دلاور کوئی ننگر اس کی طرف اچھال دیتا۔ تو بس وہ ایک لمحہ زہرا کو
 اس کی قوت کا احساس دلاتا۔

وقت یوں ہی چاک کی طرح گھومتے گھومتے دن رات کے سانچوں کو ڈھالتے ہوئے گزرا جا رہا تھا اس

بابا مٹی لینے یا ہر گیا ہوا تھا۔ صبح کھری کھری تھی۔ سردی کی شروعات تھی دلاور حسب معمول اندر
 اتھالی چاک پر نظر پڑی تو خوشی کی ایک لہر اس کے تن بدن میں دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے باورچی خانے کی
 لپکا۔ زہرا برتن مانجھ رہی تھی۔
 ”چاچا کہاں ہے؟“ دلاور نے بے تابی سے پوچھا تو زہرا بری طرح چونک پڑی پھر دلاور کو دیکھ کر
 ہل گئی اور برتن مانجھتے ہوئے بولی۔
 ”مٹی لینے گیا ہے باہر۔“ ان الفاظ کے ادا ہونے کی دیر تھی کہ دلاور نے زمین پہ بیٹھی زہرا کو ایک
 کلائی سے پکڑ کر اٹھالیا

”ارے چھوڑ میری کلائی.....“ وہ بدحواس سی ہو گئی۔
 اوں ہوں!۔ پہلے وعدہ کر کہ رات کو آئے گی! ملے.....؟ اس کے لیے میں بے چینی اور خد شامل
 ل۔ زہرا چونک گئی۔

ناپابا! بابا تو مجھے جان سے مار ڈالے گا وہ خوف سے کانپ گئی۔
 ”میں مارنا بابا تجھے جان سے۔ اتنے دن ہو گئے ہیں ضبط کرتے کرتے۔“ وہ عجیب سے انداز میں
 ہنٹ کاٹا ہوا بولا۔ دیکھ تیری خاطر میں آگیا ہوں اور یہ سب کچھ کر رہا ہوں کام سکھ رہا ہوں اور
 تو بڑی ظالم ہے تجھے کوئی احساس نہیں۔ تو تو میرے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی ایک سوہنی تھی جو پورا
 دن ایک گھر سے پار کر کے جاتی تھی اپنے سینوں کے پاس اور تو؟ وہ منہ پھلا کر ناراض سا ہو گیا اور
 ہراں کی کلائی بھی جھٹکے سے چھوڑ دی۔ ”بس تجھے تو وفا کرنی ہی نہیں ہے“ تو واقعی بڑی بے وفا ہے۔“
 ”ارے نہیں دلاور..... وہ جلدی میں یہی کہہ سکا وہاں پہ ایرام کو بھی سچا عاشق برداشت نہیں کر
 لگا۔“

”جل جھوٹی۔ پھر ملے سے کیوں کڑائی ہے میں تجھے کھا جاؤں گا کیا؟ بہت گھبراہٹ ہے مجھ سے.....“
 ”تو جھکتا نہیں دلاور الزکیوں کا یوں ملنا اچھا نہیں ہوتا۔“ وہ الجھ کر بولی۔

”تو میں تجھ سے کونسا روز روز ملتا ہوں اتنے دن ہو گئے ہیں ملاقات کو اور تجھے یہ بھی پسند نہیں، مگر تجھے
 لی پرواہی کب ہے؟ تجھے تو میں شاید برا لگتا ہوں، سمجھی مجھ سے تنہائی میں ملنا پسند نہیں کرتی۔“ وہ
 نظروں سے اسے دیکھتا ہوا قدرے مایوس سے بولا تو بھولی بھالی زہرا ترپ سی گئی اور بے ساختہ اقرار
 دینی۔

”اچھا اچھا تو چل میں رات کو آ جاؤں گی۔“

”ج!“ سوچی دھرتی پر جیسے پھوار برسنے لگی
”مگر وعدہ کر کہ آج کے بعد پھر کبھی نہیں بلائے گا۔۔۔ اور مجھے زیادہ دیر تک روکے گا بھی نہیں۔“
”ہاں ہاں“ بچا وعدہ۔ شادی سے پہلے آخری ملاقات۔ اچھا دیکھ رات کو ضرور آتا میں انتظار کروں
گا۔۔۔ آئے گی نا!۔۔۔ وہ اس کے قریب جا کر شرارت سے بولا۔۔۔ زہرا سن سٹی گئی۔ اچانک شرم
کی لکھنکارے دونوں کو بری طرح ہڑا دیا۔۔۔ دونوں نے بیک وقت دروازے کی طرف دیکھا۔

بیا بیچہ پے مٹی کی یوری اٹھائے اندر داخل ہو رہا تھا دونوں گمراہ گئے اور دلاور کو کچھ نہ دیکھا۔ کی طرف دوڑا یوری اٹھانے کے لیے اور زہرا میں دوبارہ جلدی جلدی رتوں پر ہاتھ چالے۔ کو دونوں کی حالت چنسی سی گئی گراس نے ضبط کر لیا اور یہ ظاہر نہ کیا کہ وہ انکس دیکھ چکا ہے۔ بھی تو اپنے سینے پر لاکھوں جرم ہوتے دیکھتے ہے مگر چپ چاپ رہا تھا اور ہر از اس نے اندر خاموشی

نہ نہ..... دلاور.....؟ وہ تڑپ کر کہی۔ اس کے تن میں سے سارا اشہرہ نکل گیا اور اس کی حالت سے دلاور کی مضبوط آنکھوں سے ٹپکی کی کوشش کی گمراہ کی آنکھوں سے آغوش بن گئی۔ شاید دلاور کے جسم میں شیطان کی روح حلول کر گئی تھی وہ مدہوش سا ہو گیا تھا اور آج ہی ساری کوٹے کے انچھی کو دور کر لیا تھا پتا تھا۔

اس کی بکینڈ کی گواہی دے رہے تھے۔ آنگن میں لکڑی کے ستونوں سے لٹکی لائٹن کی دھم لگا رہی تھی۔ زہرا نے دھڑکنے والے دل کو سنبھالا اور خود میں بے پناہ حوصلہ پیدا کر کے دھڑکنے سے اچھے نمٹنے لگی۔ بھیڑیوں کی آوازوں کی آواز بھی تو معمول سے ملنے کے لیے یوں ڈرتی ہوتی تھی، لیکن اُنھی ہوگی۔ اس کے گھر میں تو بہت سے لوگ رہتے تھے۔ وہ تو ہمارے بھائی کی محبت نے اسے ہمارا بنایا ہو گا۔ وہ سوچنے لگی۔ اس نے چار بھائی سے اپنے

سمیت کرا تا، اجرا کرے جسم صانپ لیا اور بلی کی طرح دبے پاؤں چلتی ہوئی وہ باہر نکل آئی اور شام ہی سے اس نے احتیاطاً تادی تھی۔ بابا رضائی کے اندر منہ دیرے بے خبر سو رہا تھا اس نے اس کی سانس لی۔ خوب اندھیری رات تھی۔ وہ دوستی سستی آگے بڑھی۔ مینے کی ابتدائی تادی نہیں تھا۔ نخصا صفا جاندا اسے گردنور کا کالا سجانے بڑی مصوبیت سے اسے نیک رہا تھا۔ گھبراہٹ سے

کچھ بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا ابھی وہ بچھواڑے ملکوں کے قریب ہی پہنچی تھی کہ دو مضبوط ہاتھوں
 دائرے میں بچھن گئی۔
 ”دلوارے۔“ اس کی بیوں سے بے ساختہ نکلا۔
 ”بڑی راہ دکھائی ہے تو نے نہراں“..... دلوارے سمجھ کر سینے سے لگاتا ہوا بے تابی اور
 کرتے جا رہے تھے۔ دھڑ دھڑھڑام۔ نہراں نے اس غیبی مدد کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور دلوارے
 سے پرے دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کسی خوفزدہ رہنی کی طرح بھاگنے لگی سارے برتنوں کو توڑتی
 اٹھائی چلی جا رہی تھی کہ کسی وجود سے ٹکرا کر وہ خوف کے پلے سے گزرنے والی دو شیر کی طرح ڈر
 دوسرے ہی لمحے وہ بابا سے لپٹ گئی۔

”بابا - بابا“

”کیا ہوا زہرا؟ کون تھا؟“ وہ کچھ بھی سمجھ نہ پائے اور حیران و پریشان تھے پھر وہ ٹوٹے ہوئے کمرے کے ڈھیر کی طرف غور سے دیکھنے لگے اور ایک سایہ وہاں تیزی سے ابھرا اور دیوار چاند کر دوسرے اس فتح علی کے گھر میں کود گیا۔

”دلاور.....“ ان کے لبوں سے سرسراہٹ کے انداز میں ایک لفظ نکلا اور چاک کے پتھر کی طرح کھوٹنے لگا پھر اسی تیزی سے سارا معاملہ ان کی سمجھ میں آ گیا۔

”نہ - نہیں۔“ وہ تڑپ گئے ان کے قدموں میں چند ٹوٹے ٹکڑوں کے ٹکڑے ابھی تک آگے رہے تھے جیسے اپنے چاہنے والے سے سارا ماجرا کہہ رہے ہوں اور اس کے حال پر آنسو بار بار ہوا اور وہ دلاور تھا کیا زہرا؟..... بابا نے کسی حیرت زدہ شخص کے انداز میں پوچھا۔

”ہاں - بابا“ وہ وہیل..... خدا کرے مجھے زہرا کا گول بدن کسی ٹاؤک پورے کی طرح رہا تھا..... اس کے اندر اٹھنے والے طوفانوں نے اس کو لرزایا تھا۔ یہ تو اس نے کبھی خواب میں سوچا تھا کہ اس کی محبت بھی یوں سانپ کی طرح کھینچی بدل سکتی ہے۔

”بابا یہ تیری مٹی ہی عزت دار ہے اور..... میں بڑی گندی ہوں بابا۔ تیرا مان نہ رکھ سکی..... میں ہوں بابا..... بہت بری ہوں مجھے مار ڈال بابا مجھے مار ڈال“ وہ دہری طرح سسک رہی تھی۔ بابا نے اسے سینے سے چٹایا۔

”اگر..... آج یہ ٹکڑے یہ تیری مٹی کے ٹکڑے میری مدد نہ کرتے تو بابا؟“ آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی اور اس کے گلے میں بھنس کر رہ گئے تھے۔ اور بابا کے سینے سے ایک بو جھرتا آ گیا۔..... عزت محفوظ تھی.....

نئے بے پناہ محبت اور شکریے اور آسمان کی طرف دیکھا آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی..... نظریں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں پہ ٹنگ گئیں جو اندھیرے میں بس ہوئے لگ رہے تھے۔

”تو عظیم ہے..... میری ماں..... تو نے میری عزت رکھ لی ماں..... شرت جذبات سے اس کا گارا اپنے خون نے دھو کا دیا تھا کمر مٹی نے بے جان ہو کر کیسا مان رکھا تھا..... شیر علی کو لگا جیسے اس کی محبت اور محنت کا صلہ مٹی نے اسے لوٹا دیا ہو۔ مٹی کسی کا قرض جو نہیں رکھتی۔ حتیٰ کہ آسانی بھی قیامت کے دن لوٹا دے گی..... وہ بڑی امانت دار اور بے حد عظیم ہے..... شیر علی کی آنکھوں موتی بننے لگے تھے۔ اس نے لرزے ہوئے ہاتھوں سے زہرا کو سنبھالا اور اندر کی جانب پل پل

اچکے پسندیدہ رسالے - ڈائجسٹوں - تاریخی

رومانوی اور جاسوسی - ناول - کامز کر

مکمل کتابیں لائبریری اینڈ جنرل - ڈائجسٹوں - تاریخی

بتائیے میں کیا کروں

آپ کے مسائل اور ان کا حل



ٹلے تھی اور میری خال زاد سے۔ میری سب سے بڑی بات تو خوش چیں مگر چھوٹی آپا بہت پریشان ہیں کیوں کہ میرا ماموں زاد جو ان کا مختیار ہے ایک آوارہ اور اداش لڑکا ہے ماں باب کا اکھوت ہے اس لیے اس کی ہر بات پر بددعا دیا جاتا ہے۔ دولت کی کوئی کمی نہیں ہے اور وہ اس تمام دولت کا تھما وارث ہے، بچپن ہی سے بری محبت نے اسے لگا دیا تھا۔ چھوٹا لگتا بھی نہیں بچپن ہی سے ختم ہو گیا تھا۔ وہ آٹھویں میں پڑھتا تھا سیم سے گاڑی لے کر کھوٹا کرتا تھا۔ بڑے بڑے ڈائریوں کے ادبش لڑکوں سے اس کی دوستی نے اسے تخریب کار بنا دیا۔ شروع شروع میں بات تھانے پھری تک بھی پہنچ کر پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے اب تو تھانے والے کھڑے آکر کین دین کر جاتے ہیں اور اس پر آج بھی نہیں آتی۔ چھوٹی آپا ہر وقت کڑی رتی رتی ہیں۔ روٹی رتی ہیں۔

اب آداب گزشتہ شمارہ پڑھا اور یہ دیکھ کر بے حد مایوس ہو کر ہمارے رسالے میں بھی نفیاتی اور ان کے حل سے متعلق سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ وہ بیڑہ کی پرانی قاری ہوں مگر خط لکھنے کی وجہ سے صرف میرا مسئلہ ہے بات یہ ہے کہ ہم کون ہیں اور وہ قیاسی دوا نہیں ہیں بلکہ ہوتے ہیں ہمارے بڑے بڑے لکھ کر بھی ان فرسودہ آدھار سے لگے پڑے ہیں۔ مسئلہ میری بات کا کیا ہے؟ بات واضح کروں کہ ہمارے خاندان میں شادی آدھار میں ہوتی ہے، خواہ کچھ بھی ہو جائے نہ باہر آئی جاتی ہے اور نہ ہی لڑکی باہر دیتی جاتی ہے۔ ہم ہیں۔ سب سے بڑی بہن کی شادی میرے چچا زاد سے ہوئی۔ ان سے چھوٹی آپا کی شادی ماموں زاد سے

ان کی یہ حالت دیکھ کر امی بھی تیار ہو گئی تھی مگر وہ بھی ان
رسوں وادوں کے آگے بے بس ہیں۔ تم بڑے تھیں کہ
رشتہ ختم کرنے کی صورت میں ہمیں برادری سے خارج کر
دیا جائے گا اور ہم گاؤں میں بھی نہ رہ سکیں گے۔ چھوٹی بیا
باقی اسی اور میں اس رشتے کے حق میں نہیں مگر ابو خاوش
ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیا کریں۔ آٹھوں دیکھی
مکھی کھلی نگل نہیں۔ چھیلے دوں میرے ماموں زاد نے ایک
مزارعے کی بیٹی کے ساتھ زندگی کی عمر کر کے بخت نہ ہوئی
کر اس کے خلاف رپورٹ کرنا۔ ماموں و بیوہ سے مزارع
کو کافی دیر دے کر مزارع رہنے کی دیکھی دی ہے مگر وہ
مزارع پیسے واپس کر کے راتوں رات گاؤں سے چلا گیا
ہے۔ بچہ پڑھ کر کے پاس بڑی امید لے کر آئی ہوئی خدا کی
واستے کو کہتا ہے۔

صفیہ بھائی۔ پٹاور

جو اب ۱۱ بی بی صفیہ! یہ سب بڑھ کر دکھ ہوا۔ آپ
سب کا پریشان ہونا فطری بات ہے۔ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ
آپ لوگ فطری ایسا کی فیصلہ نہ کریں جو آپ کی بہن کی
زندگی کا یہ کہہ کر کہ ہمیں اسی میں ہوش کرانہ ہو کسی کو
بیعت چڑھا دیا جائے آپ کا غلط فیصلہ آپ کی بہن کی
زندگی چڑھا کر دے گا۔ اپنے والد اور دوسرے بزرگوں کو بھی
سمجھا دیں کہ وہ ان فرسودہ روایات کو ترک کر دیں جن کی
تائید انھیں جتنی باتیں دے کر دکھائی جاتی ہیں۔ آپ سب
کر والد کو بتا کر کریں کہ وہ یہ رشتہ ختم کریں۔ ان کی
خوشامی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود بھی خوش فہمی ہیں بلکہ
چھوڑ دیں، لیکن یہ آپ لوگوں کی حمایت انھیں مضبوط کر
دے اور وہ لوگ اپنی بیعت نامہ انھیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو
گا کہ وہ لوگ آپ لوگوں سے قطع تعلیق کر لیں گے تو یہ
کوئی ایسی بات نہیں جس کے لیے پریشان ہوا جائے ایسے
لوگوں کا قطع تعلیق کر لیا ہی ہے۔ ہر سے مست سوچ کر کچھ رقم
انھیں۔ کو خوش کریں کہ خاندان کے دوسرے لوگ
آپ کے حالی میں ہیں ہر حال ہم کسی بھی طرح کا مشورہ
فطری نہیں دیں گے اور اصرار کریں گے کہ ہر حال میں اپنی
بہن کی زندگی کو ترجیح دیں۔

”ہائی! ممتا کی کالج میں اسے فرسٹ ایئر
ہوں۔ میری دوست صرف اپنی کلاس کی ایک لڑکی
یہ بچپن سے میرے ساتھ ہی رہی ہے۔ ہمارے
رشتے میں اس لیے ہمارے گھر نہ جانا ہے۔ سارا
لوگوں سے یوں مل جل چکا ہے کہ ان کا گھر ہمارا
ہمارا خوشیاں ان کی خوشیاں ہیں۔ میں فوری
زیادہ چاہتی ہوں۔ ہمارا بہن میرے ماموں زاد نے ایک
اور محبت بھری رنگ میں جس میں چھیلے
اس پیدا ہوئی ہے۔ دوسرے ہی دن میں
فوری تو اس سے واقف ہے اور اب بھی میرے
جین میں پڑا۔ ہوا یوں کہ مجھے مہاشیراں کا
وہیں آئیہ۔ میں جانتی تھی کہ اس کی منگنی
ماموں زاد سے نہیں ہو سکتی ہے۔ اس کے خاندان
کرتے جو فوری مجھے ضرور دکھائی تھی۔ ان
سوائے رہی باتوں کے مجھ نہ ہوا تھا کہ یہ چند
کے لیے تھے جو تھے اور وہ انھیں غصہ
تھی۔ چھیلے تھے۔ فطری اس کے ماموں پریشان
ملاطت اس کے بچپن سے ہوئی۔ اسے دیکھ کر
ممتا کی کہیں کہیں اس اور فوری میں زمین آسمان
میں بیٹا تھا۔ ممتا کی فوری بڑی عام ہے۔ فطری
لڑی ہے جس میں ہر کے لحاظ سے کافی بھاری
بہر حال اس کا مختصر کا یہ صورت ”اسرار
سارا کہ ہے۔ وہ بڑے اچھے لفظ ”اور فوری اس
ہے جب کہ فوری عام عورتوں کی سی ہے۔
سے لگاؤ ہے نہ موسیقی سے نہ دنیا کی خبر
پرہیزی نہیں آگے سے ہنس کر کسی کی کتابوں کا مطالعہ
جد تک یاد کر لیں گے جب کہ اس کا مختصر مطالعہ
رکھے گا۔ فطری کا بھاری سب سے سب سے
موسیقی سے بے نیاز لگاؤ ہے اور شاعری بھی کر
میں صرف یہ بیٹا جانتا ہوں کہ فوری کی فطری
سے مطابقت میں نہیں۔ ہم اکثر شام کو فطری
تھے ممتا کی فطری خاندان کے ممتا کی
سے آگاہی ہوئی، پھر میں نے یہ بات شدت
کی کہ وہ فوری پر زیادہ دھیان نہیں دیتا تھا۔
پتا نہیں چلتا تھا کہ اس کے اور فوری کے درمیان

غازی حسن بھائی۔ راولپنڈی

جو اب ۱۱ بی بی! یہ دنیا ہے یہاں سب کو دکھ نہیں مل
جاتا۔ آج کی وہ خواہش کرنا ہے۔ ہمارے خیال میں آپ کو
اپنی دوست کی خواہشوں کے کنارے اپنی خواہشوں کی
ممارت نہیں بنانا چاہیے۔ یہ دیکھ کر خوش ہوئی کہ آپ کا
عمر بڑھ رہا ہے۔ وہ خود آپ کا احساں کر رہا ہے۔ آپ کو
اس کی آواز پر لبیک کہنا چاہیے۔ بی بی! اپنے دوست کی
جتنے میں عمر کر کے لیے بیٹا کی نصیب ہوتا ہے۔ لیکن
کتنے کی خوشیاں دیتے ہیں جو راحت ہے۔ وہ خود خوش
پانے میں نہیں۔ ہمارے فوری اپنے مختصر کو
پناہ چاہتی ہے۔ وہ اس کے بچپن کے بچے کا بھائی ہو سکتی
ہے۔ اس کے گھر لے کر خوشیاں پناہ ہو سکتی ہیں اس

آپ تو کم از کم یہ گناہ اپنے سر میں کیونکر کر لیا ہو گیا تو
آپ خوش یا کبھی قرار دینا نہیں کیں گے۔ آپ کا مختصر خجانت
آپ کو سولی پر لٹکائے۔ اسے اور آپ کو بل کر گزارنا
مشکل ہو گا۔ ہمارا خیال ہے کہ فی الوقت آپ خالد صاحب
کو پیام دیتے۔ یہ روک دیں بلکہ انھیں فوری کی بے پناہ
جانت کے بارے میں بتائیں اور احساں کہ وہ فوری کو تباہ
کرنے کا ارادہ کر دے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ آپ فطری و
صورت کی اچھی ہیں ”اسرار“ میں ہیں اور خاندان اعلیٰ ذوق کی
بھی گویا آپ میں ایسی ہی فطری ہیں جو لوگوں کو آپ
کی طرف خوشیاں کر سکتی ہیں۔ فوری کی کہیں بھی لے گئے
اپنے کے فوری حاصل کر سکتی ہیں جب کہ فوری کے اپنے
عزیم سے اور طریقہ کے اپنے مختصر کو چاہتی ہیں۔ اپنے
گھر والوں کے خیالات کو بھی بے لگے کی خوشیاں کریں۔ کسی
کی خوشیاں چھین کر آپ بھی خوش نہ رہ سکیں گی۔ کسی
آپ کی مرضی۔



باقی امیری عمر ستر برس ہے میں نے ان کا احترام کیا ہے۔
میری ایک بہن ہے جو مجھ سے سات برس چھوٹی ہے۔
میرے والدین نے ہماری تربیت بڑی توبہ سے کی ہے۔
میرے والدین مجھے کبھی دوسروں کے ساتھ کھوٹے بھرنے
کی اجازت نہیں دی۔ مجھے کچھ چن کر ہارے ہیں جن کا
ہمارے گھر تانا ہے اور میں بھی ایسی ہی لوگوں کے
گھر چلا جاتا ہوں۔ ہمارے محلے میں ہی ایک خاندان رہتی
ہیں جن کا نام میں نکلوں گا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے

نئے آوازیں

باقی اہل بیت مشکل میں ہوں خدا کے واسطے
 کیجئے۔ ایک لاکھ سے بہت عرصہ ہو گیا اور میں اس
 شادی کرنا چاہتی ہوں مگر مسئلہ ہے کہ مجھے اس
 بہنیں اور آپ میں میری غمخواروں سے ہے اور میں
 میں پسند کرتی ہوں وہ بھی اسے نہیں سمجھتے
 وہاں بھی یہی مسئلہ ہے کہ کمالی اور درد و غم
 شہر ہیں۔ میں اس کی جلد نذرہ نہیں دے سکتی
 ترک کیا تھے کہ اس جلد اور جلد اسے پالوں۔
 آپ میرا مسئلہ حل کریں گے۔

لو اس
یا کل
طعی

ہوتی چلی گئیں اور میرے سامنے ایسی باتیں بھی کر لگیں
جو انھیں نہیں کرنا چاہتے تھے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی
ان کے پاس جانے کو مجھے پتہ نہیں رہنے لگا۔ ایک روز انھوں
نے مجھ سے اعلیٰ محنت کرنا اور خواہش ظہار کی کہ میں اپنا
زیادہ وقت ان کی قیمت میں گزارا کروں۔ اے ابو کے اور
کے باپوں کے زیادہ وقت وہاں گزارنا شروع کر دوں
ای ابو سے جو بحث پل کرواں جانے لگا پھر رفتہ رفتہ پڑھائی
سے دل باہت ہو گیا۔ میں نے بھیجے جا کر سرکٹ چاکر
سرکٹ نوشی کی حالت بھی ڈال دی اور چاہتا ہوں کہ میں
سے جان بچاؤں جاسکے ای ابو کو اگر بتاں گا تو وہ بھی
جان سے مار دیں گے اور انھیں چھوڑنے کی بھی خود میں
ہمت نہیں پائے گا۔ اگر ایک دن نہ چاہوں تو وہ کھر کے دس پیکر
لگا دیں اور ادا شمارے نہیں دیں گے۔ اگر حسیان نہ دوں گا تو کوی
بتائے گی دمکھی دیجے۔ میں نے انھیں آکر کہا۔

خدا انصاری کے لاہور ہاؤس ملاؤں

الحزب

الحزب

[illegible]

غزل

سلامی اعنا

لذت کام و دہن

نسرین نظامی

کوک ٹیل بوٹی

لین سوفی

انڈے تین عدد، چینی چھ اونس، بیٹن دو چائے کے چمچ،
تازہ کریم آٹھ اونس، لیوں کا جوس ڈیڑھ کھانے کا چمچ، پیلا
رنگ پاؤ چائے کا چمچ، لین اسٹنس پاؤ چائے کا چمچ،
ترکیب

انڈوں کی سفیدی اور زردی علیحدہ علیحدہ اچھی طرح بیٹن
لیں پھر اس میں تین اونس پیسی ہوئی شکر ملا دیں۔ بیٹن
پاؤڈر کو تھوڑے پانی میں اچھی طرح گھولیں، ایک الگ برتن
میں لیوں کا عرق نکالیں اس کو چھنی سے چھائیں اس کے
بعد تمام چیزوں کو ایک ساتھ ملا لیں اور اس میں پیلا رنگ
اور اسٹنس بھی شامل کر دیں، کچھ دیر تک اس کو ملا لیں
اس کے بعد ٹھنڈا ہونے کے لیے کسی بھی سانچے میں ڈال
دیں اور فریڈر میں رکھ دیں۔ آدھ گھنٹے بعد نکال لیں لین
سوفی تیار ہے۔

چاکلیٹ ڈونٹ

انڈو نیشن رائس

گوشت مرغی یا بکری آدھ کلو، چاول باستی آدھ کلو، نمک
حسب نفا، سرخ مرچ پاؤڈر، ڈیڑھ چائے کا چمچ، ہلدی پاؤڈر
آدھ چائے کا چمچ، گرم سالچہ پاؤڈر آدھ چائے کا چمچ، نمائز
چار عدد، پنا زرد عدد، انڈے چار عدد گھی ایک کپ
ترکیب

گوشت میں نمک مرچ لین اور ک ڈال کا امال لیں جب
گوشت گل جائے تو نمائز ڈال کر گوشت بھون لیں۔ چاول
کو ہاف بواٹل کر کے فوراً ٹھنڈے پانی میں ڈال دیں اور
پانی نکال لیں پھر مسالے میں چاول ملا لیں تھوڑے سے
چاول بچا کر علیحدہ کر لیں چاول والی پٹیلی کا ڈسکن اچھی طرح
بندر کے دھیمی آنچ پر رکھ دیں تاکہ دم ہو جائے پھر ایک
ڈش میں چاول نکال کر اوپر سے باقی بچے ہوئے بھی چاول
ڈال دیں انڈوں کے آلیٹ بتالیں اور چاول کے اوپر بھیر
دیں انڈو نیشن رائس تیار ہے۔

چاکلیٹ ڈونٹ چائے کے ساتھ مزادیں گے